عالمی طاقتوں کی ایماء پر حق وانصاف کے لہو کی سیاہی سے لکھے معاہدات کی دلگداز داستان

بین الاقوامی امن معاہدے

مرتضیٰ انجم

بین الاقوامی امن معاہدے

عالمی طاقتوں کی ایماء پر حق وانصاف کے لہو کی سیاہی سے لکھے معاہدات کی دلگداز داستان

مرتضٰی انجم

ادارہ تحقیقات
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4380927

کتاب .... بین الاقوامی امن معاہدے

مصنف .... مرتضٰی انجم

ناشر .... ادارہ تحقیقات

تعداد 1100

اشاعت .... جون 2005ء

مطبع .... نواز پریس لاہور

اہتمام .... شبیر حسین

قیمت .... -260/00 روپے

لیگل ایڈوائزر:

ملک بشیر احمد ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

فہرست

حرف اول

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ عالمی امن کی راہ میں خود عالمی طاقتوں کی برتری قائم رکھنے والی حکمت عملی ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے خصوصاً ایسی صورت حال میں جب اس طاقت کے مد مقابل کوئی دوسری خاطر خواہ طاقت موجود نہ ہو۔ افغانستان اور عراق کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے اور مزید کئی ممالک بھی اس خطرے سے دوچار ہیں۔ اقوام متحدہ اگرچہ بڑی طاقتوں کے زیر اثر کام کر رہی ہے لیکن پھر بھی چھوٹے ممالک کے لئے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق ایک نعمت سے کم نہیں۔ عراق کی جنگ میں یورپی ممالک کی حمایت حاصل کرنے میں ناکامی اور عراق کی دلدل میں پھنسے ہوئے امریکہ کی مدد نہ کرنے پر صدر بش اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کو ہٹانے کے لئے بھی سرگرم رہ چکے ہیں، جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو امریکہ اپنے اتحادیوں پر مبنی ایک اور اقوام متحدہ تشکیل دینے پر غور کر رہا ہے تاکہ اس کے ذریعے موجودہ اقوام متحدہ کو غیر اہم کر کے اپنی نام نہاد اقوام متحدہ سے اپنی مرضی کے فیصلے کروا سکے۔

دنیا کی تاریخ میں تنازعات نے جنم لیا تو معاہدے بھی وجود میں آئے۔ انسان نے اپنے مفادات کے حصول اور باہمی اختلافات اور تنازعات کے حل کے لئے یا تو خون کی ندیاں بہائیں یا پھر کمزور کو بغیر جنگ کئے ہی اپنی شرائط کے تابع کیا۔ دنیا کے بیشتر تنازعات میں ایسا ہوا کہ طاقت ور گروہ مدعی، منصف اور خود ہی وکیل بھی ہوتا تھا اس کی تازہ مثال عراق پر مسلط کی گئی جنگ ہے جس میں امریکہ بہادر نے خود ہی مدعی بن کر عراق کو خطرناک ایٹمی ہتھیاروں کا ملزم ٹھہرایا، وکالت کی اور جج کے فرائض بھی انجام دیئے اس سے پہلے افغانستان میں بھی ایسا ہی کردار ادا کیا گیا۔

الغرض طاقتور کمزور کے حق میں اپنی پسند کا فیصلہ تجویز کر دیتا اور کمزور دشمن کی شراکت صرف اس قدر ہوتی کہ وہ بلا چوں و چرا اس ''انصاف'' فیصلے یا معاہدے کی شرائط کو قبول کر لے۔ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد دنیا یک قطبی نظام کے تحت چل رہی ہے لہٰذا جنگ کے بعد معاہدہ

امن ہو یا حالت جنگ سے بچنے اور تنازعات کے خاتمے کے لئے مصالحانہ مفاہمت پر مبنی معاہدے سب کے سب ایک ہی عالمی طاقت کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔

ماضی میں ایسا بھی ہوا کہ وہ تنازعات جن کی وجہ سے انسانیت حیوانیت میں بدل کر جنگ و جدل کے میدان میں اتری ان کے حل کے لئے جو معاہدات ہوئے ان کی شرائط لکھنے میں استعمال ہونے والی دو بوند روشنائی نے خون کی ندیاں بہائیں۔ اس کی بڑی مثال پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے واقعات ہیں، یہ مظاہرے ایسی قوموں نے کئے جو ہمیشہ سے خود کو مہذب کہنے پر مصر رہی ہیں۔ اگر پہلی جنگ عظیم کے معاہدے حق و انصاف پر مبنی ہوتے تو شائد دنیا کو دوسری جنگ عظیم کے ایندھن میں جھونکنے سے بچایا جا سکتا تھا۔ ماضی کی دنیا میں دو بین الاقوامی فوجی تنظیمیں ناٹو اور وارسا پیکٹ نظر آتی ہیں جو ایک دوسرے سے خوفزدہ لیکن مقابل رہیں، اس سب کے باوجود بھی دنیا کے بیشتر ممالک کو دو بڑی طاقتوں کے مابین مقابلے کی فضا میں تحفظ حاصل تھا لیکن ایسا بھی ہوا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں چھوٹے ممالک کو کچلا گیا دونوں بڑی طاقتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے متحارب فریقوں میں تنازعات کو ہوا دی اور اسلحہ مہیا کیا۔ ان دونوں نے لاکھوں انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور ایک دوسرے سے انتقام لے کر اپنے تئیں سرخ رو ہوئے۔

تیسری دنیا کے ممالک فوجی معاہدوں کے بجائے دفاعی اسلحہ اور ساز و سامان حاصل کرنے کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے رجوع کرتے ہیں، ایسے معاہدوں کو دفاعی معاہدے نہیں دوستی کے معاہدے کہا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی بڑی قوت چھوٹی قوت کے ساتھ کئے گئے دوستی کے معاہدے کی پاسداری بھی کرے۔ امریکہ نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اپنے دام میں لانے کے لئے سینٹو معاہدے کی بنیاد رکھی تو اس میں پاکستان بھی شامل تھا لیکن جب 1971ء میں بھارت نے پاکستان پر جارحیت کی تو امریکہ نے پاکستان کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

عالمی رائے عامہ بھی اپنا وزن رکھتی ہے (یہی وجہ ہے کہ امریکہ جیسی واحد سپر پاور بھی کسی ملک پر حملہ کرنے سے پہلے اس ملک کے خلاف بڑی پراپیگنڈا مہم شروع کرتی ہے۔) گو بہت زیادہ ہنگامی کیفیت میں فیصلہ کن حمایت حاصل کرنے کی خاطر رائے عامہ پر انحصار حماقت ہوگی۔ دسمبر 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی غالب اکثریت نے بھارت کے خلاف اور افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت کے خلاف ووٹ دیا لیکن بھارت نے پاکستان اور روس نے افغانستان کے خلاف

جارحیت جاری رکھی۔اقوام متحدہ نے اسرائیل کی جارحانہ روش پر کئی بار مذمت کی لیکن وہ عرب علاقوں پر قبضہ جمانے کی مہم جو کی ہنوز جاری رکھے ہوئے ہے۔اسی طرح اسرائیل نے اپنی سرحد پر جو باڑ کی تعمیر کا کام شروع کر رکھا ہے بین الاقوامی عدالت بھی اسے غیر قانونی قرار دے چکی ہے لیکن اسرائیل نے اس فیصلے کو قطعی اہمیت نہیں دی کیوں کہ اسے بڑی طاقتوں کی آشیر باد حاصل ہے۔

نئی ایجادات کی بدولت دنیا ایک خاندان بن چکی ہے کوئی ملک الگ تھلگ نہیں رہ سکتا جس طرح ہمسایوں کی خیر سگالی شہر یا گاؤں میں اہمیت رکھتی ہے اسی طرح بین الاقوامی سطح پر بھی قدر قیمت رکھتی ہے۔ایک فریق کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لئے دوسروں کی حمایت اور دوستی حاصل کی جائے اور دشمن کو بدنام کیا جائے۔اس ضمن میں ایک مثال 1971ء کی پاک بھارت جنگ سے قبل بھارت کی سفارتی کارکردگی ہے اس نے دنیا میں ایک بہت بڑی پراپیگنڈا مہم جاری کی اور مغربی ممالک میں بڑی بے شرمی کے ساتھ پاکستان کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا جاری رکھا۔اسی طرح امریکہ نے افغانستان پر حملہ کرنے سے پیشتر اسامہ بن لادن اور طالبان کے خلاف شدید پراپیگنڈا کر کے دنیا کو ان کی دہشت گردی سے ڈرایا اور ان کے خلاف نفرت پیدا کی پھر افغانستان پر حملہ کر دیا۔اسی طرح عراق پر حملہ کرنے سے پیشتر بش نے اس کے خطرناک ہتھیاروں کا واویلا کیا اور بالآخر وہاں سے کیا نکلا؟اس کا مقصد صرف دنیا میں صدام حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا تھا۔

ہر عروج کو زوال کا مزہ بھی چکھنا ہے امریکہ کا زوال بھی شروع ہو چکا ہے اب دانشوروں اور ماہرین کو امریکہ اور یورپی یونین کے درمیان ایک زوردار معرکے کے امکانات پر غور کرنا چاہئے جس کے بعد امریکہ کی قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور اسے بھی ایسے ہی پر تذلیل معاہدات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مرتضیٰ انجم

اپریل 2005ء

لاہور

انیسویں صدی کے امن معاہدے

فرانس کا حکمران نپولین اپنے توسیع پسندانہ تجارتی مفادات کی تکمیل کی غرض سے پرتگال کی بندرگاہوں پر تصرف حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن پرتگال کے حکمران اسے یہ مراعات دینے کو تیار نہیں تھے، چنانچہ اپریل وسط میں شدید جنگ کا محاذ کھل گیا اور جس کے نتیجے میں پرتگال کو شکست اور فرانس و سپین کو فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ جون 1801ء کے آخر میں ایک بنام نہاد معاہدہ امن طے پایا بلکہ پرتگال پر مسلط کیا گیا کیوں کہ معاہدے کی شرائط پرتگالی مندوب کی غیر موجودگی میں تیار کی گئیں اور پرتگال کے وزیر خارجہ سے اس پر جبراً دستخط لئے گئے۔

اس شکستہ حالی میں پرتگال اس تسلط کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس معاہدے کو ''بدا جوز'' کا نام دیا گیا اور یہ معاہدہ انیسویں صدی کا سب سے پہلا معاہدہ تھا۔ معاہدے کی شرائط اس طرح تھیں:

☆ امن صرف اس صورت ممکن ہے کہ پرتگال اپنی تمام بندرگاہیں فرانس کو بلا معاوضہ استعمال کے لئے دے دے تاہم کچھ عرصے بعد فرانس اپنی مرضی سے معقول معاوضہ دینے کے بارے میں غور کرے گا۔

☆ پرتگالی بندرگاہ پر کوئی برطانوی بحری جہاز نہیں ٹھہرے گا۔

☆ پرتگال بطور تاوان فرانس کو 9 ملین فرانک تین سال کے اندر اندر دینے کا پابند ہوگا۔

☆ پرتگال اسپین کو اپنا علاقہ OLIVENZA دینے کا پابند ہوگا جبکہ برازیل کے کچھ حصے جن پر پرتگال کا استحقاق ہے وہ فرانس کے حوالے کرے گا۔

☆ جنگ میں ہاتھ آنے والے بیس ہزار پرتگالی فوجیوں اور باشندوں سے فرانس

اور اسپین اپنے زرعی امور کے کام لیں گے۔

یہ ایک ایسا سیاہ معاہدہ تھا جس میں ہارنے والی قوم کو مزید تنزلی کی جانب دھکیلا گیا۔ پرتگال جیسی حکومت سے من مانی کرنے کے بعد نپولین کی ایسی ہمت افزائی ہوئی کہ کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ہند چینی، میکسکو، ارجنٹائن اور جرمنی تک سے خون ریز جنگیں لڑیں۔

29 اگست 1842ء کو ہونے والا معاہدہ نان کنگ پہلی جنگ افیون کے اختتام پر ہوا جو چین اور برطانیہ کے مابین لڑی گئی اور جس میں برطانیہ کو اپنی بحری اور بری قوت کی بنا پر فتح حاصل ہوئی۔ جنگ کے بعد ہونے والے معاہدے میں طے پایا کہ چین برطانیہ کو نہ صرف بھاری تاوان دے گا بلکہ معاہدے کے تحت چینی علاقہ ہانگ کانگ جبراً برطانوی عملداری میں چلا جائے گا۔ اس کے علاوہ برطانیہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ بلا معاوضہ تمام چینی بندرگاہیں استعمال کرسکتا ہے۔

اس معاہدے کے تحت چین میں غیر ملکیوں کو خصوصی حقوق حاصل ہوئے۔ معاہدے نے تنازعات اور اختلافات ختم کرنے کے بجائے انہیں بڑھاوا دیا۔ اب کشیدگی چین میں برطانوی تاجروں کی افیون کی تجارت کے حوالے سے نہیں تھی بلکہ علاقے کے حصول اور بندرگاہ سے حاصل ہونے والے محاصل کے حوالے سے بھی تھی۔ چنانچہ 1860ء میں فریقین کے مابین دوسری جنگ افیون لڑی گئی اور جنگ کے بعد پیکنگ کنونشن کے تحت کولون کے جزیرہ نما اور دیگر چینی جزائر پر بھی برطانوی استحقاق قائم ہو گیا۔ 1998ء میں برطانیہ نے چین کے ساتھ 99 سالہ معاہدہ کیا جس کے تحت تمام مقبوضات پر برطانیہ کو مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔

30 جون 1997ء کو چین کو اس جانب دارانہ اور جبری معاہدے سے آزادی نصیب ہوئی اور ہانگ کانگ چین کو واپس مل گیا۔ ہانگ کانگ کی واپسی برطانیہ کی کوئی صلح جوئی نہیں تھی بلکہ یہ اقدام اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ چین اس وقت معاشی اور دفاعی لحاظ سے اتنا کمزور نہیں جتنا وہ ایک صدی پہلے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو شائد ہانگ کانگ چین کو واپس نہ ملتا اور اس کی حیثیت بھی فاک لینڈ یا جبرالٹر جیسی ہوتی۔

اپریل 1846ء سے فروری 1848ء تک جاری رہنے والی دریائے ریوگرینڈی پر استحقاق اور ریاست ٹیکساس کے 29 دسمبر 1845ء میں امریکہ سے الحاق کے حوالے سے شروع ہونے والی امریکہ اور میکسیکو کی جنگ کا اختتام بھی ایک شرمناک معاہدہ امن پر ہوا جسے خود امریکی تاریخ دان اپنے قومی وقار پر بدنما داغ تصور کرتے ہیں۔ لاکھوں نفوس کے پیوند خاک ہو جانے کے بعد 7 ستمبر 1847ء سے شروع ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں 2 فروری 1848ء کو معاہدہ گڈالوپ ہائیڈیج طے پایا جو بائیس دفعات پر مشتمل تھا اس کی شرائط اس طرح تھیں:

☆ میکسیکو دریائے ریوگرینڈی اور اس کی جنوب مشرقی سرحدوں پر جو ٹیکساس سے جاملتی ہیں امریکہ کا استحقاق تسلیم کرتا ہے۔

☆ کیلی فورنیا اور نیو میکسیکو سٹی پر امریکہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔

☆ تیرہ لاکھ مربع کلومیٹر پر محیط میکسیکو کے بحر الکاہل سے ملحق علاقے اور جزائر امریکہ کو مل جائیں گے جن کے عوض امریکہ 1.5 ملین ڈالر ادا کرے گا۔

☆ جنگ میں امریکی شہریوں کے نقصانات کے عوض تاوان جنگ کی صورت میں میکسیکو امریکہ کو سوا تین ملین ڈالر ادا کرے گا۔

اس کے علاوہ تاوان جنگ میں سونے اور چاندی کی مالیتیں بھی رکھی گئیں تھیں۔ جنگ اور اس کے بعد ہونے والے معاہدے کے نتیجے میں امریکہ کو خطے میں جغرافیائی اور معاشی برتری حاصل ہوئی۔ کئی نئی ریاستوں نے معاہدے کے فوراً بعد تحفظ کے پیش نظر امریکہ سے الحاق کر لیا۔ 28 دسمبر 1848ء کو آئیوا، 29 مئی 1849ء کو وس کونسن اور 9 ستمبر 1850ء کو معاہدہ مذکورہ کے تحت ریاست کیلی فورنیا، امریکہ میں ضم ہوئی۔ معاہدے کے بعد نیو میکسیکو پر امریکہ کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو گیا لیکن یہ ریاست نیم خود مختار تھی۔ تاہم 6 جنوری 1912ء کو نیو میکسیکو بھی امریکی ریاست کی حیثیت اختیار کر گئی۔

21 مئی 1871ء کو ہونے والا معاہدہ فرینکفرٹ درحقیقت 19 جولائی 1870ء سے 10 مئی 1871ء تک جرمنی اور فرانس کے مابین ہونے والی جنگ کے اختتام پر ہوا، جو الساس اور لورین کے متنازعہ علاقوں کے حوالے سے ہوئی تھی۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں فرانس بجا طور پر ایک بڑی طاقت تھا لیکن اس جنگ سے یورپ میں فرانسیسی زعم ختم ہو گیا اور ایک طاقت ور اور متحد جرمنی وجود میں آیا۔ جرمنی کی فتح کے بعد معاہدہ امن ہوا جس پر جرمنی کی طرف سے بسمارک اور فرانس کی جانب سے نپولین نے مہر تصدیق ثبت کی۔

اس معاہدے کی شرائط کے تحت ہارنے والی قوم فرانس نے الساس اور لورین کے علاقے جرمنی کے حوالے کر دیئے۔ فرانس جرمنی کو تین سال کے اندر اندر پانچ بلین فرانک دینے کا پابند ٹھہرا۔ جنگی قیدیوں کے حصول کے لئے نپولین نے تاوان بھی دیا۔ جرمنی کے چانسلر بسمارک کا کہنا تھا کہ یہ سب اقدامات اس لئے کئے گئے کہ فرانس آئندہ جرمنی پر حملہ نہ کرے لیکن وہ بھول گیا تھا کہ کمزور کو دبا کر عارضی طور پر فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ سوچنا کہ اس سے مستقل مفادات کا حصول ممکن ہے یہ دیوانے کے خواب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس جنگ اور اس کے بعد ہونے والے معاہدہ فرینکفرٹ کے نتیجے میں جرمن قوم میں جذبہ قومیت اور نسلی برتری کے رجحانات مزید پنپنے اور جذبہ قومیت کے تحت حصول زمین کے نظریات نے جنم لیا۔ دوسری طرف فرانس پر حالات و واقعات نے ایسے اثرات مرتب کئے کہ اسے اپنی سلامتی اور تحفظ کی خاطر کئی دوطرفہ اور کثیر طرفہ دفاعی معاہدے کرنے پڑے۔ ان میں **1893**ء کو فرانکو رشین اتحاد اور **1904**ء کا برطانیہ فرانس دفاعی معاہدہ قابل ذکر ہے۔

دسمبر **1897**ء کو ہونے والا ترک، یونان امن معاہدہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے سلسلے کی پہلی کڑی ثابت ہوا جو سلطنت عثمانیہ اور یونان کے مابین لڑی جانے والی تیس روزہ جنگ کا منطقی انجام تھا۔ جنگ کا پس منظر قبرص کے علاقے کے حوالے سے تھا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر کفالت تھا لیکن یونان نے مقامی باشندوں کو اکسایا کہ وہ مکمل طور پر یونان سے الحاق کر لیں چنانچہ اختلافات نے طول پکڑا اور جنگ شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یونان کی شکست کی صورت میں سامنے آیا۔ جنگ کے بعد معاہدہ امن برطانیہ کی ثالثی کے تحت عمل میں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب جنگ میں ہاری ہوئی قوم کو مراعات سے نوازہ گیا۔ شائد اس کی وجہ مذہبی عصبیت تھی جو صلیبی جنگوں کے دور سے سلطنت عثمانیہ یا

مسلمانوں کے خلاف تھی۔

الغرض معاہدے کے تحت یونان نے معمولی تاوان جنگ تو سلطنت عثمانیہ کو ادا کیا لیکن یورپی قوتوں کی سازش اور خصوصاً یونان سے برطانیہ کی مذہبی و معاشی ہم آہنگی اور مفادات کے باعث پہلے وجہ نزع یعنی قبرص کے علاقے کو سلطنت عثمانیہ سے لے کر بین الاقوامی انتدابی علاقہ قرار دیا گیا اور بعد میں نام نہاد استصواب کے بعد شاہ یونان کے بیٹے شہزادہ جارج کو وہاں کا عارضی حکمران بنا دیا گیا۔ بعد ازاں 1913ء میں ''معاہدہ لندن'' (جو پہلی بلقانی جنگ کے بعد ہوا) کے تحت اس علاقے کو یونان کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔

12 اگست 1898ء کو ہونے والا معاہدہ امن درحقیقت اسپین اور امریکہ کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کا اظہاریہ تھا۔ وہ جنگ جو اسپین کے خلاف کیوبا کی تحریک آزادی کی اعلانیہ حمایت کا پیش خیمہ تھی۔ 24 اپریل 1898ء کو جنگ شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکہ اسپین پر حاوی ہو گیا اور اسپین کو اپنی شرائط کے میدان میں لے آیا۔

چنانچہ 12 اگست 1898ء کو ہونے والے معاہدے میں بھی ایسا ہی ہوا جو پہلے معاہدات میں ہوتا آیا ہے۔ یہ معاہدہ جس کی کل چھ دفعات تھیں اس کی شرائط اس طرح تھیں:

☆ ویسٹ انڈیز کے تمام جزیرے کیریبین کے کچھ علاقے (جو بعد میں بنانا اسٹیٹ یا امریکی طفیلی ریاستیں کہلائیں) اور پورٹوریکو کے جزائر اسپین امریکہ کو دے گا۔

☆ امریکہ کو خلیج منیلا اور بندرگاہ کو اس وقت تک قبضہ حاصل رہے گا جب تک فلپائن کی حکومت سے معاہدہ نہیں ہو جاتا یعنی معاہدے سے قبل تک فلپائن پر نیم خود مختار حکومت قائم رہے گا جس کا اقتدار اعلیٰ امریکہ کو حاصل ہوگا (حالانکہ اگر تاریخی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو فلپائن اسپین کا حصہ تھا بلکہ فلپائن کا نام بھی دراصل اسپین کے بادشاہ فلپ دوم کے نام پر رکھا گیا تھا)۔ معاہدہ امن واشنگٹن میں طے پایا جس پر امریکی وزیر خارجہ ولیم آرڈے نے

امریکہ کی جانب سے اور اسپین کی جانب سے امریکہ میں فرانسیسی سفیر جولس کیمبون نے دستخط کیے۔یعنی معاہدہ کی شرائط طے کرتے وقت اسپین حکومت کا کوئی فرد وہاں موجود نہیں تھا تاہم بعد میں امریکی سینٹ کی منظوری کے بعد فریقین کے مابین 10 دسمبر 1898ء کو اضافی دفعات پر مشتمل کل 17 دفعات پر مبنی معاہدہ ہوا جس پر امریکہ کے صدر ولیم میکنلے اور اسپین کی ملکہ ریجنٹ نے دستخط کیے۔یہ معاہدہ ''معاہدہ پیرس'' کے نام سے مشہور ہوا۔

اس جنگ اور اس کے بعد ہونے والے معاہدے نے نہ صرف توازن طاقت کا نیا معیار وضع کیا بلکہ یہ معاہدہ غیر معمولی بین الاقوامی جغرافیائی تبدیلیوں کا باعث بھی بنا۔ معاہدے کے بعد 1901ء کی پلیٹ ترمیم کے تحت کیوبا، امریکہ کا پروٹیکٹو ریٹ بنا اور امریکی استحقاق کے علاقے میں 20.7 فی صد اضافہ ہوا۔

------✡------

معاہدہ پورٹ اسمائتھ (روس، جاپان 1905ء)

1904ء سے پہلے کوریا روس کی عملداری میں تھا لیکن اس علاقے پر جاپان بھی اپنے حق کا دعوے دار تھا۔ چنانچہ اس علاقے میں جاپانی مداخلت اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھی۔ روسی حکومت اس مسئلے کے حل کے لئے سینٹ پیٹسبرگ میں جاپانی حکومت سے مذاکرات کرنے پر زور دے رہی تھی لیکن جاپانی حکومت کا رویہ ناقبل فہم تھا وہ نہ تو مذاکرات کی راہ اپنا رہی تھی اور نہ ہی کھلی جنگ کا راستہ۔

روس نے 31 جنوری 1904ء کو پورٹ آرتھر کے مقام پر اپنے دوسرے جہازوں کی مدد اور حفاظت کی غرض سے آدھی رات کے وقت اپنے جنگی جہاز بھیج دیئے، جہاں روسی اور جاپانی جنگی بحری بیڑے پہلے سے موجود تھے۔ پورٹ آرتھر پر جاپانی پیش قدمی کے باعث اس بات کا یقینی امکان پیدا ہو گیا تھا کہ روس اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ 10 فروری کو دونوں متحارب بحری بیڑوں کا تصادم ہوگیا، جاپانی بحری بیڑے نے آدھی رات کے وقت اچانک روسی بیڑے پر تارپیڈو سے حملہ کر دیا۔ پہلے ہی حملے میں دو روسی جنگی جہاز اور ایک کروزر جس کا نام پلاوہ تھا، جاپانی تارپیڈو سے بری طرح تباہ ہو گئے۔ دو دوسرے روسی جنگی جہازوں کو چموئی پو کی بندرگاہ (جو کوریا کے مغربی ساحل پر واقع ہے) پر گھیرے میں لے کر ناکارہ بنا دیا گیا۔ اس طرح بندرگاہ کے داخلی راستے پر روسی پیش قدمی رک گئی۔

حربی ماہرین کا کہنا تھا کہ جاپان نے کوریا اور منچوریا میں روسی فوجی عزائم پر کاری ضرب لگائی تھی۔ ان کامیابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت حال واضح ہو رہی تھی کہ جاپان منچوریا اور کوریا کے کسی بھی علاقے پر بڑی آسانی کے ساتھ اپنی فوجیں اتار سکتا تھا۔ 11 فروری کو جاپان کی آٹھ ہزار انفنٹری کوریا کی سرزمین پر اتری اور

انہوں نے سیؤل کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔روسی جنرل شمالی کوریا کے محاذ پر حملہ آور تھے ،روسی فوج نے کوریا پر حملے تیز کرنے کی حکمت عملی اختیار کی اور اس مقصد کے لئے سائبیریا سے مزید نفری بھیج دی گئی۔لندن کے ذرائع کے مطابق زار شاہی فوج کو محاذ پر پہنچنے میں ڈھائی مہینے تک لگ سکتے تھے۔

لیکن کمک پہنچنے سے پہلے روس کی فوجی پوزیشن بڑی ابتر ہو گئی ،مشرق بعید میں روسی بحری طاقت ختم ہو گئی مارچ کے اوائل میں جاپان نے ولادی واسٹک پر شدید بمباری کر کے روس کے جہازوں کو ان کی بنیادی بندرگاہوں سے کاٹ دیا اور اس سے پہلے جاپانی ایڈمرل ٹوگو نے روس کے سات جہاز ڈبو دیئے جس کے بعد پورٹ آرتھر پر اس کا محاصرہ مضبوط ہو گیا۔روسی فوجوں کو مزید جنگی جہاز دستیاب نہیں تھے ان کی موجودہ کمک صرف بالٹک اور بحیرہ اسود میں موجود تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے برطانوی مبصرین کا خیال تھا کہ جاپان بہت جلد پورٹ آرتھر پر قبضہ کر لے گا۔

اس ابتر صورت حال میں روس کو ایک اور بڑے جنگی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔13اپریل1904ء کو پورٹ آرتھر کے قریب ایک بڑا روسی جنگی جہاز پیٹروپاولوسک ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔اس جہاز میں سوار بحری کمانڈر ان چیف ایڈمرل ماکروف کے علاوہ چھ سو افراد کا عملہ تھا جو سب کے سب ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔صرف سات افسران اور بتیس ملاحوں کو بچایا جا سکا۔

دوسری طرف سوسیخا کے محاذ پر روس کی آخری امید ایڈمرل روجتدنسکی کا بحری بیڑہ بھی جاپانیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔جاپان نے 12 جنگی جہازوں کو ڈبونے کا دعویٰ کیا اور اپنے صرف دو جہازوں کی تباہی کا اعتراف کیا۔

روسی بحری بیڑہ جسے بحیرہ بالٹک میں تیار کیا گیا تھا اور آدھی دنیا کا سفر طے کرنے کے بعد میدان جنگ میں پہنچا تھا، جاپان کے ایڈمرل ٹوگو نے دھند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روسی بیڑے پر اچانک تارپیڈو سے حملہ کر دیا۔اس حملے کے نتیجے میں روسی بحری قوت کی کمر ٹوٹ گئی اور عملی طور پر مشرق بعید میں روس کی بحری قوت ختم ہو کر رہ گئی۔اس کے چند دن کے بعد روس کے جنرل لیایونو نے جزیرہ سخالین پر بھی

ہتھیار ڈال دیئے۔

اگرچہ روس اور جاپان کی طرف سے مخالف فریق کو بھاری نقصان پہنچانے کے دعوے کئے جا رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس جنگ میں دونوں فریقین کا بھاری نقصان ہو رہا تھا۔ البتہ روس کے پاس ایک ہی گرم بندرگاہ تھی جو سارا سال کھلی رہتی تھی اس کا جاپان نے محاصرہ کر لیا، جس کے بعد روس کی ٹوٹی ہوئی کمر بھی بے سہارا ہو گئی۔ جاپان نے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شمال میں واقع ٹرانس سائبرین ریلوے لائن جو 250 میل دور تھی، ریلوے کو حقیقتاً کاٹ دیا گیا تھا۔ تین بحری جنگی جہاز بندرگاہ میں ڈوب رہے تھے جنہیں ساحلی علاقے سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ شہر میں موجود روسی فوجوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ جاپانیوں کی حکمت عملی چونکا دینے والی تھی جس کے سامنے روسی افسر بے بس نظر آ رہے تھے۔ آخر کار پورٹ آرتھر پر جاپان کے تقریباً چھ ماہ کے زبردست محاصرے کے بعد 2 جنوری 1905ء کو جنرل انوتلی استوسل ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے ساڑھے چار بجے دوپہر ٹوکیو میں ہتھیار پھینکنے کی دستاویز بھیجی۔ اس طرح 8 فروری 1904ء کو کوریا اور منچوریا پر استحقاق کے تنازع سے شروع ہونے والی روس اور جاپان کی جنگ کا اختتام جاپان کی فتح اور روس کی شکست کی صورت میں سامنے آیا۔

جاپانی شہنشاہ نے روسی حکومت کو یقین دلایا کہ ہتھیار ڈالنے والے تمام فوجی دستوں کے ساتھ اچھا انسانی برتاؤ کیا جائے گا۔ البتہ جاپانی روایت کے مطابق اگر زار روس جنرل استوسل کی رہائی درخواست نہیں کرتا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ آخر کار 2 جنوری 1905ء کو پورٹ آرتھر کا جاپان کی جانب سے محاصرہ کرنے کے بعد روسی فوج کے کمانڈر جنرل (کمانڈر انچیف) کی ایماء پر پورٹ آرتھر پر روسی فوج کی کمان کرنے والے جنرل اناطولی استوسل کے اجتماعی طور پر ہتھیار ڈالنے کی باقاعدہ رسم اور شکست کے اقرار نامے کی تقریب منعقد ہوئی۔

امریکی صدر تھیوڈور روز ویلٹ نے ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے امن مذاکرات کی پیش کش کی جسے فریقین نے قبول کر لیا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ روس کے لاکھوں نفوس ہلاک ہوئے اور اس کی اربوں کی املاک راکھ کا ڈھیر بننے کے باوجود اسے

ہی مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ 5 ستمبر 1905ء کو زار روس اور جاپان کے میجی بادشاہ نے معاہدہ پورٹ اسمائتھ پر دستخط کئے جو امریکی صدر تھیو روز ویلٹ کی شبانہ روز کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ ہر چند کہ اس معاہدہ امن سے جنگ بندی ہوگئی لیکن جاپان نے جنگ کے تمام مقاصد حاصل کر لئے تھے جن میں منچوریا سے روسیوں کا اخراج بھی شامل تھا۔ شکست کے بعد منچوریا میں بھی روس کا کنٹرول کمزور پڑ گیا اور روسی جنرل کروپاٹکن اور جنوبی منچوریا کے علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ سمجھوتے کی شرائط اس طرح تھیں:

(1) جزیرہ نما لیاؤ تنگ اور بندرگاہ آرتھر پر جاپان کا استحقاق تسلیم کر لیا گیا۔

(2) روس نے کوریا میں جاپان کے سیاسی فوجی اور معاشی مفادات کو تسلیم کیا اور روس نے اس بات کی ضمانت دی کہ وہ کوریا میں جاپان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔

(3) معاہدے کی شقوں کے مطابق جنوبی منچوریا کے کچھ علاقے اور جزیرہ سخالین کے نصف حصے پر بھی جاپان کا استحقاق تسلیم کیا گیا۔

25 جولائی 1907ء کو نئے سمجھوتے کے تحت کوریا میں جاپان کے ریذیڈنٹ جنرل کو سیئول میں تمام انتظامی امور کا سربراہ بنا دیا گیا اس کے بعد کوریا کی حکومت تمام انتظامی امور میں جاپانی ریذیڈنٹ کے تابع ہو گئی۔

جاپان میں اس فتح کو بڑی شان و شوکت سے منایا گیا لیکن دوسری طرف روس میں عوام کو اس شکست کے بارے میں لاعلم رکھا گیا تھا۔ چنانچہ روس کے اندر روسیوں کے دلوں میں زار روس کے لئے نفرت کے جذبات جڑ پکڑ چکے تھے اور بحران شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ عوام سرکاری اہلکاروں اور جاگیرداروں پر حملے کر رہے تھے۔ 22 جنوری کو ایک لاکھ مزدوروں نے امن مارچ شروع کیا جس کا مقصد زار روس کو بہتر سہولتوں کی فراہمی کے لئے ایک عرضداشت پیش کرنا تھا۔ لیکن زار روس نے جلوس کے شرکاء کی عرضداشت سننے کے بجائے اپنے دستوں کو نہتے لوگوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا جس کے نتیجے میں پانچ سو لوگ ہلاک اور بڑی تعداد میں زخمی ہوئے۔

مارچ کے شرکاء عرضداشت پیش کرنے کے لئے ''سرد محل'' کی طرف جا رہے تھے جب انہوں نے فوجی دستوں کی قطاریں وہاں دیکھیں تو بھی وہ آگے بڑھتے گئے کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ فوجی اپنی نہتی عوام پر گولیاں نہیں چلائیں گے لیکن زار کے دستوں نے ہجوم کو سختی سے کچلنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں یہ بہیمانہ قتل عام ہوا۔ بالآخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ روسی عوام نے زار بادشاہت کا خاتمہ نہایت عبرت ناک طریقے سے کیا۔

معاہدے میں من مانی کرنے کے باعث جاپان میں استعماری رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ 1912ء میں جاپان میں میجی بادشاہت ختم ہو چکی تھی لیکن بعد میں آنے والے لوگوں نے بھی توسیع پسندی کے مظاہرے جاری رکھے، جو بعد میں چین پر جاپان کے حملے اور جنگ عظیم دوم کی صورت میں واضح ہوئے۔

------✡------

سہ فریقی معاہدہ (چین، بھارت، تبت)

چین اور بھارت جو آبادی کے لحاظ سے ایشیا کے دو عظیم ترین ملک ہیں اور ہزاروں سال پرانی دو تہذیبوں کے علمبردار رہے ہیں، ان کے درمیان ہمالہ کی حد فاصل نے جنگ کی نوبت کبھی نہیں آنے دی لیکن بیسویں صدی کی صنعتی ترقی نے پہاڑوں کی رکاوٹ کو کاٹ کر رکھ دیا اور یہ دو ملک جنہوں نے تاریخ کے کسی بھی دور میں باہمی جنگ کے امکان کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہو گئے۔

برصغیر ہند پر جب برطانیہ کی عملداری تھی تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کی شمالی سرحدوں میں توسیع کی کوشش کی۔ اس ضمن میں 1904ء میں ایک برطانوی کمانڈر کرنل ینگ ہسبنڈ کی قیادت میں انگریزی فوج کا ایک دستہ تبت کی طرف روانہ ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں تبت کے صدر مقام لہاسہ پر قابض ہو گیا۔ تبت کے روحانی اور سیاسی حکمران دلائی لامہ نے لہاسہ سے فرار کی راہ اختیار کی اور چین کی شمالی جانب منگولیا میں پناہ لی۔ 1907ء میں دلائی لامہ برطانوی حکومت سے ایک معاہدہ کے بعد لہاسہ واپس آ گئے، اس عہد نامہ کی رو سے قرار پایا کہ:

☆ تبت پر چین کا اقتدار اعلیٰ ہو گا۔

☆ تبت کو داخلی خود مختاری حاصل ہو گی لیکن اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ''اندرونی تبت'' جہاں دلائی لامہ کو داخلی معاملات میں کلی اختیارات ہوں گے لیکن خارجی معاملات میں حکومت چین کی عملداری ہو گی۔ ''بیرونی تبت'' جہاں دلائی لامہ کو داخلی معاملات میں اندرونی تبت کی طرح مکمل کنٹرول ہو گا لیکن بیرونی معاملات ہندوستان اور چین کی مشترکہ قیادت میں

سر انجام دیئے جائیں گے۔

☆ لہاسہ کے صدر مقام پر ہندوستان کا تجارتی مشن قائم کیا جائے گا اور چین اور ہندوستان کی مرضی کے بغیر تبت کے بارے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

اس معاہدے کے تین فریق قرار پائے اول تبت، دوم ہندوستان، سوم چین، لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جہاں تبت اور ہندوستان کی حکومتوں نے اس معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کر دی وہاں چین کی حکومت نے اس کی توثیق نہیں کی۔ چنانچہ اس طرح بین الاقوامی قانون کی رو سے اس معاہدے کی قانونی حیثیت باقی نہ رہی اور چین نے بعد ازاں اسی کا سہارا لے کر تبت کے معاملات میں مداخلت کی۔ بہر حال اس معاہدے کے بعد دلائی لامہ واپس پہنچ گئے لیکن چین اور ہندوستان کا یہ قضیہ ختم نہیں ہوا۔

1911ء میں چین میں ایک جمہوری انقلاب برپا ہوا جس کے نتیجہ میں خاندان مانچو کی حکومت ختم ہوگئی اور ڈاکٹر سن یات کی قیادت میں جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا۔ اس جمہوریہ کے قیام کے تھوڑا عرصہ بعد ہی ہندوستان اور چین کا تنازعہ ایک نیا رنگ اختیار کر گیا۔ اس مرتبہ حکومت چین نے اپنا فوجی دستہ لہاسہ روانہ کیا تاکہ تبت کو انگریزوں سے نجات دلائی جائے۔ ان دنوں دلائی لامہ پر انگریزی تسلط کافی اثر انداز ہو چکا تھا اور وہ چین کے فوجی دستے کی آمد پر ہندوستان میں پناہ لینے مجبور ہو گیا۔

دلائی لامہ کے اسی قیام ہندوستان کے دوران **1914**ء میں شملہ کے مقام پر ایک اور معاہدہ ترتیب پا گیا اور اس معاہدہ پر بھی متذکرہ بالا تینوں فریقوں کے دستخط تھے۔ لیکن بعد ازاں حکومت چین نے اس پر مہر تصدیق ثبت نہ کی اور اس طرح بین الاقوامی قانون کے نزدیک اس معاہدے کی بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہی، تاہم یہ بات قابل غور ہے کہ دلائی لامہ اس معاہدے کی رو سے ایک بار پھر تبت واپس چلے گئے اور وہ اس معاہدے کے فریق کی حیثیت سے ثابت قدم رہے۔ حکومت چین کا نقطہ نظر

یہ تھا کہ تبت کے بارے میں کوئی تبدیلی اس وقت تک عمل میں نہیں لائی جا سکتی جب تک تینوں فریق اس پر متفق نہ ہوں اور خصوصاً چین کی رضامندی سب سے زیادہ ضروری ہے کیوں کہ اس کو تبت پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ 1914ء کے معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں:

☆ چین کو تبت پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

☆ تبت میں ایک برطانوی تجارتی مشن قائم کیا جائے گا۔

☆ ہندوستان اور تبت کے درمیان سرحد کا تعین کیا جائے گا جو ایک فرضی خط کی شکل میں ہوگا۔

اسی فرضی خط کا نام برطانوی کمانڈر میکموہن کے نام پر میکموہن لائن رکھا گیا، یہ لائن تبت کے جنوب اور نیپال، بھوٹان اور سکم کی خود مختار ہمالیائی ریاستوں کے شمال سے گزرتی تھی اور اس کے بارے میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی تھی کہ کسی مقام پر بھی یہ لائن ان ریاستوں کی شمالی سرحدوں سے نہ ٹکرائے۔ اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ برطانیہ کی حکومت نیپال، بھوٹان اور سکم کی ریاستوں پر بالواسطہ اپنا اثر قائم رکھنا چاہتی تھی۔ تاکہ چین کسی طرح بھی ان ریاستوں میں کوئی دخل اندازی نہ کر سکے۔

اس کے برعکس اس معاہدہ کی رو سے انگریزوں کو تبت کے معاملات میں پہلے سے کہیں زیادہ دخل دینے کا موقع مل گیا لیکن چین کی طرف سے اس معاہدہ کی عدم توثیق اس بات کی حامل تھی کہ آئندہ کسی موزوں وقت پر تبت اور ہندوستان کے ساتھ سرحد کے معاملات میں موثر مداخلت کر سکے۔

1914ء کے عہد نامہ میں 1907ء کے عہد نامہ کی طرح چین نے یہ شرط منوانی چاہی کہ تبت کی سرحدیں مندرجہ بالا ہمالیائی سرحدوں سے ٹکراتی ہیں۔ 1914ء کے بعد چوں کہ جمہوریہ چین اندرونی خلفشار کی وجہ سے کبھی اس قابل نہ بن سکا کہ انگریزوں سے کوئی بڑی سیاسی چپقلش پیدا کر سکے لہٰذا مدتوں تک کوئی سرحدی جھگڑا وجود میں نہ آیا الٹا چین میں انگریزی اثر اس حد تک نفوذ کر چکا تھا کہ چین کے لئے اپنی دور

افتادہ ہمالیائی سرحدوں کے معاملات کی طرف توجہ دینا مشکل ہو گیا۔

عوامی جمہوریہ چین اپنے قیام کے پہلے دس سال کے دوران اندرونی معاملات میں مشغول رہی بالآخر 1959ء میں چین نے اعلان کیا کہ تبت کی جنوبی سرحد میکموہن لائن نہیں ہے یہ لائن انگریزوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر خود ہی قائم کی تھی اور چین نے کبھی اپنی پوری تاریخ میں اسے تسلیم کیا ہی نہیں۔ چین کا یہ اعلان خطرے کی واضح نشان دہی تھا مگر پنڈت نہرو سب کچھ جانتے بوجھتے بار بار یہ کہتے رہے کہ چین اور بھارت کے درمیان کوئی جھگڑا ہی نہیں اور یہ کہ میکموہن لائن کی کوئی عملی اور واقعاتی حیثیت نہیں ہے۔

چین نے بھارت کے انہیں اعلانات کو درست سمجھ کر بڑی خاموشی سے جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ چین نے واضح طور پر کہہ دیا کہ تبت کا وجود ایک ہتھیلی کی مانند ہے اور ہر ہتھیلی کی طرح اس کی بھی پانچ انگلیاں ہیں۔ لداخ، سکم، بھوٹان اور شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) چین نے لداخ کے ایک حصے پر اپنا دعویٰ کیا، نیفا میں بھی اس نے اپنی سرحدوں کو توسیع دے لی، البتہ اس نے باقی ماندہ ریاستوں کی خود مختار حیثیت کو باقاعدہ معاہدوں کی شکل میں تسلیم کر لیا۔ اکتوبر 1962ء میں بھارت نے اچانک ان تمام علاقوں کو چینی قبضے سے آزاد کرانے کا عہد کیا جن پر چین نے پچھلے چند سالوں سے دعویٰ بھی کر رکھا تھا اور قبضہ بھی۔ بھارت کے اسی اعلان کے نتیجے میں سرحدی جنگ کا آغاز ہو گیا۔

چین کا کہنا تھا کہ بھارت چین پر ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے چنانچہ 11 اکتوبر کی صبح چین نے متوقع بھارتی حملہ کی پیش بندی کر کے بھارت پر حملہ کر دیا۔ بھارت کی شمال مشرقی سرحد پر چینی اور بھارتی فوجوں میں زبردست جنگ چھڑ گئی، جس میں دو انچ دہانے کی خود کار توپیں اور دستی بم استعمال کئے گئے۔ جنگ کی اطلاع پر بھارتی سیاسی حلقوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ چینیوں کی موجودہ فوجی کارروائی اس بھارتی حملہ کی پیشگی روک تھام کی ایک تدبیر تھی جو بھارت چینی فوجوں کو اس علاقے سے نکال باہر کرنے کے لئے آئندہ چند روز میں

کرنے والا تھا۔

جنگ کی تازہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے نئی دہلی میں پنڈت نہرو کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطح کانفرنس منعقد ہوئی۔اجلاس میں بعض دور رس جنگی اہمیت کے فیصلے کئے گئے۔اجلاس کے بعد جب بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل این تھاپر اور بھارتی فضائیہ کے ائیر مارشل اے ایم انجینئر کمرہ اجلاس سے باہر نکلے تو وہ خاصے متفکر معلوم ہو رہے تھے۔

اجلاس کے بعد کرشنا مینن نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ بھارت چین کے ساتھ اپنے تنازعہ کو اقوام متحدہ میں پیش نہیں کرے گا۔اس سے پہلے پنڈت نہرو نے روسی سفیر سے بھی نصف گھنٹے تک بات چیت کی۔24 اکتوبر کو بھارت وزارت دفاع کے ایک اعلان کے مطابق دہلی کی وزارت داخلہ نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے سونے کے محفوظ ذخائر اور زیورات فوری طور پر بینک آف انڈیا میں جمع کرا دیں تاکہ بھارت تیزی سے غیر ممالک سے اسلحہ خرید سکے۔چین نے سرحدی تنازعہ کے پرامن حل کے لئے ایک سہ نکاتی فارمولا پیش کر دیا جسے بھارت نے مسترد کر دیا۔نیفا کے علاقے میں تازہ صورت حال پر غور کے لئے مسٹر نہرو کی جنگی کابینہ کے دو وزیر لال بہادر شاستری اور گلزاری لال نندہ دہلی پہنچے۔بھارتی وزیر دفاع نے بھی لداخ کے علاقہ میں پرواز کی اور جنگی صورت حال کا معائنہ کیا۔

16 نومبر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پانسہ پلٹ گیا ہے اور بھارتی فوج کی پیش قدمی جاری رہے گی لیکن شام کے بعد میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا چینی فوج نے زبردست جوابی حملہ کر دیا۔چینی فوج کا توپ خانہ آگ اگلتا ہوا آگے بڑھنے لگا رات بھر والونگ کے شمالی افق پر بجلی کڑکتی رہی۔ایک اندازہ کے مطابق چینی توپ خانہ نے رات میں دو ہزار گولے پھینکے۔صبح تک بھارتی مورچے میں شگاف پڑنا شروع ہو گئے اور بھارتی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔دوپہر کے وقت بھارتی فوج کی پسپائی رک گئی اور اس نے اپنے قدم جمانے کی آخری کوشش کی۔کئی گھنٹے تک خونریز جنگ ہوتی رہی، بھارتی فوج کو طیاروں کے ذریعہ کمک پہنچانے کی کوشش کی گئی لیکن اس وقت

تک والونگ کا ہوائی اڈہ چینی توپ خانے کی زد میں آچکا تھا۔ چنانچہ شام تک بھارتی فوج شہر خالی کر گئی۔

جس وقت چینی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سڑکیں اور گلیاں بھارتی فوج کی نعشوں اور زخمیوں سے بھری پڑی تھیں کیوں کہ بھارتی فوج پسپا ہوتے وقت اپنے بہت سے زخمیوں اور نعشوں کو ساتھ نہیں لے جا سکی۔ چینی فوج نے دعویٰ کیا کہ اسے بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا ہے جس میں جدید قسم کا وہ امریکی اسلحہ جو حال ہی میں بھارتی فوج کے حوالے کیا گیا تھا شامل ہے۔

11 نومبر کو بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو نے رام لیلا گراؤنڈ نئی دہلی میں ایک بہت بڑے جلسہ عام مین خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بھارت کے بڑے بڑے شہروں پر چینی طیاروں کی بمباری کا خطرہ ہے اس لئے بھارت کے عوام کو ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے اور ایک طویل جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ لداخ اور شمال مشرقی سرحدی علاقوں میں ہماری پسپائی کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ہم نے شکست قبول کر لی ہے اور ہم موجودہ صورت حال میں چین کی ان دست درازیوں کو درست قرار دے کر اس سے صلح کر لیں گے۔ بلکہ یہ علاقے واپس لینے کے لئے ہر ممکن کاروائی کریں گے، ہم موقع کی تاک میں رہیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بھارت کے جنگی سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں گذشتہ دو تین ہفتوں کے دوران پیداوار میں چار گنا اضافہ ہوا ہے اور یہ تمام سامان فوجوں کو فراہم کیا جا رہا ہے تا کہ فوج کو اسلحہ کی کمی کی وجہ سے کوئی ہزیمت نہ اٹھانی پڑے۔

اس لڑائی میں بھارتی فوج نے مغربی ممالک کے جدید ترین ہتھیار استعمال کیئے۔ چین کے مقابلہ میں بھارتی فوجوں کی پے در پے شکست کے بعد پنڈت نہرو نے بھارتی فوج کے سپہ سالار جنرل تھاپر کی جگہ پر لیفٹیننٹ جنرل جے این چوہدری کو چیف آف سٹاف مقرر کر دیا۔ لیکن اسی روز بڑے ڈرامائی انداز میں چین نے جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب چینی فوجیں آسام میں داخل ہو چکی تھیں اور بھارت کے فوجی ہیڈ کوارٹر تیز پور سے صرف تیس میل دور

لڑائی ہو رہی تھی۔

والونگ کے محاذ پر چینی فوجیں تیل کے چشموں کے قریب پہنچ چکی تھیں اور بوم ولا کے قریب پندرہ ہزار بھارتی فوج محصور ہو چکی تھی اور فرار کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔اس کے ساتھ ہی چین نے یہ بھی اعلان کیا کہ چین کے خالی کردہ علاقے میں بھارتی فوجیں داخل ہوئیں تو چین پھر جوابی کاروائی پر مجبور ہو جائے گا۔چین نے اپنے اعلان میں یہ بھی کہا کہ بھارت کو اپنی امن دشمنی کے لئے عالمی رائے عامہ سے معافی مانگنی چاہئے۔

------✡------

معاہدہ لندن (بلقانی اتحاد و سلطنت عثمانیہ 1913ء)

علاقائی جنگ جدل اور لڑائی جھگڑے بلقان ریاستوں کے لئے ہمیشہ کا معمول بنے رہے ہیں، شائد ہی کوئی ریاست ایسی ہو جہاں کشیدگی، افراتفری اور بے چینی نہ پائی جاتی ہو۔ علاقے میں موجود قوم پرستوں کی بڑی تعداد کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ مستقبل قریب میں کوئی بڑی تباہی پھیلانے والے ہیں۔

جولائی 1908ء میں آفیسرز اور عوام کے اشتراک عمل کے نتیجے میں وجود میں آنے والی تنظیم "نوجوان ترک" ترکی نے سلطان عبدالحمید دوئم کو ایک نئے آئین کا فرمان جاری کرنے پر مجبور کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ بیرونی سامراجی طاقتوں کو شکست دینا ممکن ہے۔ انتہا پسند سرب بلغاریہ کو ترکی سے علیحدہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

سربیا کا مطالبہ تھا کہ آسٹریا ہنگری بوسینا ہرزوگوینا سے دستبردار ہو جائیں جسے پچھلے سال ہی انہوں نے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔ یہ علاقہ چھ سو سال پہلے سربیا کی عملداری میں تھا اور اسے کھونے کے بعد اب دوبارہ یہاں اپنا حق جتا رہا تھا، چنانچہ اس نے اپنے آپ کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ یورپی طاقتیں اس مسلح تصادم کو روکنے کے لئے بھرپور کوشش کر رہی تھیں اور سربوں پر دباؤ بڑھا رہی تھیں کہ وہ آسٹریا سے بہتر معاشی رعائتوں کے بدلے اس علاقے پر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن سربیا ایسا کرنے کے بجائے اپنے توسیع پسند مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ سربیا کے وزیر اعظم استوجن نوا کوک کے اعلان کے مطابق یہ صرف تیس لاکھ سربوں کا سوال نہیں جو سربیا اور مونٹے نیگرو میں رہ رہے ہیں، بلکہ یہ ان ستر لاکھ سربوں کے مستقبل کا بھی سوال ہے جو ڈالمیشیا، کروشیا، سلوانیا، بوسنیا اور ہرزے گوینا

میں رہ رہے ہیں اور آسٹریا کے زیر تسلط ہیں اور آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ استوجن کا کہنا تھا کہ سربیا ضرورت پڑنے پر ان کی مدد کرے گا۔

اس علاقائی صورت حال میں ترکی اور بلقان اتحادیوں میں پچھلے چار سال سے جاری سرد جنگ میں اس وقت شدت پیدا ہوگئی جب دونوں طرف کی جنگی تیاریاں عروج پر تھیں۔ادھر روس نے بھی اپنے اتحادی ترکی کی حمایت میں پولینڈ کے شہر وارسا میں اپنے فوجی دستوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ بلغاریہ، سربیا اور یونان کے قریب ایسی صورت حال علاقے کی سالمیت کے لئے سخت خطرہ بن گئی۔

اس مسئلے پر روس اور برطانیہ کے سرکاری اہلکاروں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا تھا کہ روس نے صرف امن قائم کرنے کے لئے اپنے دستوں کو حکم جاری کیا ہے۔روس نے اپنے اتحادی ترکی کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ بلغاریہ کے بارے میں اپنے ارادوں کو ترک کر دے اور بلغاریہ کو یقین دہانی کرائے۔ترکی نے اپنے دستے آڈریانوبل سے ہٹا کر میسے دونیہ میں تعینات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ بلغاریہ کے لئے باعث تشویش تھا۔ واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ بلغاریہ کسی بھی وقت ترکی پر حملہ کر دے گا۔ بلغاریہ حملہ کرنے کے لئے اس لئے بھی بہانے تلاش کر رہا تھا کہ ترکی کی فوج اٹلی کے ساتھ ہونے والی حالیہ جنگ میں بہت تھک چکی تھی۔ بالآخر یہ انتشار اور کھنچاؤ 31 اکتوبر 1912ء کو اس وقت جنگ بلقان کا موجب بن گیا جب میسے دونیہ کے شہر کیلر میں بلقان فوجوں نے ترکوں پر حملہ کر کے دو ہزار افراد ہلاک کر دیئے۔حتیٰ کہ استنبول کا آخری حفاظتی حصار بھی توڑ کر شہر میں داخل ہوگئیں۔

بلقان اتحاد میں شامل سربیا، یونان، مونٹے نیگرو اور بلغاریہ کی فوجوں نے ترکی کے خلاف برق رفتاری کے ساتھ ایک بڑے حملے میں ترکی کی ناقابل تسخیر فوج کا بھرم توڑ کر رکھ دیا اور بیشتر محاذوں پر لڑی جانے والی لڑائیوں میں ترکی کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا اور بڑی تعداد میں فوجوں کو قیدی بنا لیا۔ بلغاریہ کے کمانڈر ان چیف ایوانوف کی جنگی حکمت عملی بہت کامیاب رہی۔بعض مبصرین نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ترکی کے وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف کو تھریس میں گولی مار دی گئی ہے یا

گرفتار کرلیا گیا ہے۔

یہ دنیا کی تاریخ میں سب سے کامیاب اور مختصر ترین لڑائی تھی۔ مبصرین کا خیال تھا کہ یورپی طاقتوں کی مداخلت سے استنبول کی فتح سے پہلے کوئی سمجھوتہ طے پا جائے گا۔ لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ''نوجوانان ترک'' تنظیم کے انقلابی تھے جو ہتھیار نہ ڈالنے کے فیصلے پر سختی سے ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یا تو لڑتے ہوئے قومی وقار کو بچالیں گے یا پھر اس کوشش میں ختم ہو جائیں گے۔ پانچ ماہ تک جاری رہنے والی اس جنگ میں اتحادیوں کا پلہ بھاری رہا۔ عین اس وقت جب قومی اسمبلی نے بلقان لیگ کی امن سمجھوتہ کی شرائط کو قبول کرنے کے حق میں ووٹ دے دیا تو 31 جنوری 1913ء کو ایک مجاہد اور ایک اعلیٰ فوجی افسر محمود شفقت پاشا نے کامل پاشا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

اس طرح بلقان اتحاد اور ترکی کی حکومت کے درمیان ہونے والے مذاکرات سبوتاژ ہو گئے۔ یورپی ممالک نے از سر نو امن کوششوں کا آغاز کیا اتحادیوں کی مرضی اور خواہشات کے تابع معاہدہ امن طویل گفت و شنید اور مذاکرات کے بعد 30 مئی 1913ء کو لندن میں ہوا۔ ترکی اور بلقان لیگ کے ارکان نے ایک سمجھوتے پر دستخط کر کے بلقان جنگ کے خاتمے کا اعلان کیا۔ لندن کے جیمز پیلس میں ہونے والی اس کانفرنس کی صدارت سمجھوتے کے ایک مرکزی کردار سر ایڈورڈ گرے نے کی۔ ترکی اور بلغاریہ کے نمائندوں نے ایک پروٹوکول پر بھی دستخط کیے جس کا مقصد فوجوں کو متاثرہ علاقوں سے واپس بلانا تھا۔

بلقانی اتحاد کے عدم اتفاق کی وجہ سے شرائط میں رد و بدل ہوتا رہا لیکن بالآخر معاہدے کی شرائط طے کر لی گئیں۔ معاہدے کے تحت:

(الف) سلطنت عثمانیہ کو مقدونیہ اور البانیہ کے علاقوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ (بلقانی اتحاد نے البانیہ کی آزادی تسلیم کر لی جبکہ مقدونیہ میں چوں کہ مسلم آبادی اکثریت میں تھی لہٰذا اسے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کرلیا)

(ب) معاہدے کے تحت سلطنت عثمانیہ بلقانی اتحاد کو یورپ میں دریائے مرتزا سے بحر

ایجئین اور اس کے بعد بحر سیاہ (بحر اسود) تک کا علاقہ دینے کی پابند ہوئی۔

(ج) البانیہ کا اسٹیٹس اور سرحدوں کا تعین اتحاد خود کرے گا۔

(د) ترکی کے سلطان کریٹ کے علاقے کے تمام حقوق اتحادیوں کو دے کر اس علاقے سے دست کش ہو جائیں گے۔

(ح) بلقانی اتحاد کو اختیار ہوگا کہ وہ بحر ایجئین کے جزائر کی قسمت کا فیصلہ اپنے تئیں کرے۔

(ر) ماؤنٹ ایتھوز پر اتحاد کا قبضہ ہوگا، تاہم اس کے حصے بخرے کرنے یا کسی فریق کو مکمل استحقاق دینے کا فیصلہ اتحاد باہمی صلاح مشورے سے کرے گا۔

اس معاہدے کی تمام جہتیں اور سب ہی زاویے سراسر سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کی غمازی کرتے تھے۔ اس مبہم معاہدے میں ایک کمی یہ تھی کہ اختیارات کا منبع بلقانی اتحاد کو گردانا گیا تھا نہ کہ کسی ایک اتحادی ریاست کو۔

جنگ کے بعد صورت حال یہ تھی کہ چاروں اتحادی قومیں اپنے اختلافات روسی مصالحت کاروں کو پیش کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے لیکن مال غنیمت کی تقسیم پر اتحاد میں اتنا خلفشار پیدا ہوا کہ صرف ایک مہینے کے بعد یعنی 30 جون کو بلغاریہ اور اس کے سابق اتحادیوں یونان اور سربیا میں جنگ چھڑ گئی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میسے دونیہ کا علاقہ جو ترکی کے زیر تسلط تھا جنگ کے بعد اتحادیوں کے زیر تسلط آ گیا لیکن اپنے اپنے حصے کی بندر بانٹ کے سلسلے میں ان کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو سکا اور چھتیس ہزار بلغارین دستوں نے بظاہر یونان اور سربیا کے اتحاد میں دراڑ ڈالنے کے لئے گوکالی پر سمجھوتہ کر لیا۔ اس کے جواب میں یونان نے سلونیکا پر چڑھائی کر کے بلغاریہ کے فوجی دستوں کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ بلغاریہ کے اس اچانک حملے پر یونان کی حکومت نے سخت احتجاج کیا۔

رومانیہ نے بھی بلغاریہ کو دھمکی دی کہ اگر بلغاریہ نے سربیا، یونان اور مونٹے نیگرو کے خلاف جارحیت کی تو رومانیہ بھی بلغاریہ کے خلاف اس اتحاد میں شامل ہو جائے گا۔ چنانچہ لڑائی شروع ہونے کے سولہویں دن سربوں اور یونانیوں کی حمایت

میں رومانیہ بھی اس جنگ میں شریک ہو گیا۔

اس جنگ میں بلغاریہ نے ہزاروں بے گناہ لوگوں کا قتل عام کیا۔اس قسم کے زیادہ تر واقعات دیہاتوں اور خاص طور پر دوگساتو کے شہروں میں پیش آئے۔ایک جنگی مبصر کے مطابق بلغارین جہاں سے بھی گزرے وہاں صرف بہتا ہوا خون لٹی ہوئی عزت اور تباہی نظر آئی۔تاہم بلغاریہ کے شاہ فرڈنینڈ کا کہنا تھا کہ یہ محض الزامات تھے۔

بالآخر 6 اگست 1913ء کو رومانیہ کے شہر بخارسٹ میں ایک امن کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملکہ الزبتھ، رومانیہ کے شاہ چارلس، اور جنگ میں شریک تمام قوموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔امن کانفرنس میں ہونے والے معاہدے کے مطابق:

(الف) بلغاریہ کو لازمی طور پر جنگ بندی کرنا ہوگی۔

(ب) سربیا اور یونان کی فوجیں تین دن میں واپس آجائیں گی۔

(ج) رومانیہ پندرہ دن کے اندر اندر اپنی فوجیں بلغاریہ سے نکال لے گا۔

اگر اس معاہدہ پر عمل نہ ہوا تو بیلجیم، ہالینڈ اور سوئزرلینڈ ثالثی کا کردار ادا کریں گے۔

------✡------

پہلی جنگ عظیم کے معاہدے

1914ء کے آغاز میں دنیائے آسمان پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے اور یورپ ایک بڑی جنگ کی زد میں آ گیا۔ برطانیہ نے زیادہ سے زیادہ اسلحہ کی تیاری کا پرگرام مرتب کرنے کے علاوہ ونسٹن چرچل فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی نے ایوان عام میں جرمنی کے پانچ سکواڈرن کے مقابلے میں آٹھ سکواڈرن تیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اس سے پارٹی کے عہدے داروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے چرچل کی طرف سے کی جانے والی جنگی تیاریوں کی مذمت کی ان کا کہنا تھا کہ چرچل کی پالیسی دنیا کے امن کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے گی۔

دنیا کے ممالک یورپ کی جنگی تیاریوں سے خوف زدہ تھے کہ 28 جون 1914ء کو سربیا کے ایک قوم پرست نے آسٹریا ہنگری کے تخت کے جانشین آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ اور اس کی بیوی کو گولی مار کر دنیا میں سنسنی پھیلا دی۔ گولی اس وقت ماری گئی جب ان کی گاڑی بوسنیا کے شہر سراجیوو کی گلیوں میں سے گزر رہی تھی۔ (بوسنیا آسٹریا ہنگری کی سلطنت کا حصہ تھا) انیس سالہ قاتل نے اپنی پستول سے سات فائر کیے۔ ایک گولی ڈچز کے پیٹ میں پیوست ہو گئی دوسری آرچ ڈیوک کی گردن میں لگی جس سے فوری طور پر اس کی موت واقع ہو گئی۔ ڈچز ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ گئی۔ قاتل نے اپنے عدالتی بیان میں کہا کہ اسے اس واقعہ پر کوئی پشیمانی نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے سربوں پر ہونے والے ظلم کا انتقام لیا ہے۔

آرچ ڈیوک کو قتل کرنے کی اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ کوشش کی گئی تھی جب ایک حملہ آور نے گھات لگا کر اس کی گاڑی میں بم پھینکا تھا۔ آرچ ڈیوک نے ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے بم کو پھٹنے سے پہلے گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔ آرچ ڈیوک کو اس

سے قبل خراب حالات کے پیش نظر بوسنیا نہ جانے کا مشورہ دیا گیا تھا لیکن آرچ ڈیوک مخالف دھڑوں کے درمیان کوئی مصالحانہ راستہ تلاش کرنا چاہ رہا تھا جس کا نتیجہ موت کی صورت میں سامنے آیا۔آرچ ڈیوک کی ہلاکت سے تمام یورپ میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔نہ صرف یورپ کے تیور بتا رہے تھے بلکہ دنیا کے امن پسند ممالک کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب جنگ ہو کر رہے گی۔

جب سربیا کے نوجوان قوم پرست نے آرچ ڈیوک فرڈیننڈ پر سراجیوو میں پہلی گولی چلائی تو بلاشبہ یہ یورپ میں لڑی جانے والی جنگ کی پہلی گولی ثابت ہوئی۔آرچ ڈیوک اور اس کی بیوی کے قتل نے یورپ میں امن کا توازن بگاڑ دیا اور براعظم جنگ کی آگ میں سلگنے لگا،تمام ممالک میں جنگی جنون سوار تھا۔یہ ایک ایسا طوفان تھا جو لاکھوں انسانوں کی زندگیوں سے کھیل کر بھی نہیں تھمنے والا تھا۔

دفاعی ساز و سامان کی تیاری میں جرمنی سب سے آگے تھا جس کا دفاعی بجٹ پچاس فیصد بڑھ گیا تھا اس نے پچھلے سال 1.8 بلین مارک دفاع پر خرچ کیے بجٹ میں 2.24 بلین مارک کا اضافہ ہوا۔جرمنی اس دوڑ میں واحد ملک نہیں تھا روس 1.8 روبل خرچ کر رہا تھا اور فرانس اور برطانیہ بھی کسی طرح اس سے پیچھے نہیں تھے۔روس اور جرمنی کی دوستی ختم ہو چکی تھی اور بلقان کے مسئلے پر روس اور آسٹریا کی کشمکش عروج پر تھی۔دونوں ممالک اس جگہ پر اپنے اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے تھے۔

روس کو ڈر تھا کہ آسٹریا آرچ ڈیوک کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے سربیا پر حملہ کرے گا اور بلقان پر اپنی پوزیشن مضبوط کرے گا۔جرمنی بلقان کے مسئلے پر آسٹریا کی پشت پناہی کر رہا تھا کیسر ولیم نے ویانا میں اپنے سفیر کو لکھا کہ اب سربوں کا قصہ پاک ہو جانا چاہیے۔آسٹریا نے سربیا کو الٹی میٹم بھیجا تھا کہ وہ قتل کی تفتیش میں آسٹریا کی پولیس کی مدد کرے جو بالآخر سربیا کو ماننا پڑا۔

جرمنی کو خطرہ تھا کہ جنگی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد روس 1916ء میں جرمنی پر حملہ کر دے گا۔روس اور فرانس میں بیس سال سے اتحاد تھا اور فرانس جرمنی سے اپنے علاقے بازیاب کرانا چاہتا تھا۔جرمنی نے اس خدشے کے پیش نظر کہ بیلجئم فرانس سے

تعاون نہ کرے بیلجئم کو الٹی میٹم بھیجا کہ وہ جرمنی کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دے ورنہ جنگ کے لئے تیار رہے، بیلجئم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً 2 اگست کو جرمنی نے بیلجئم اور لکسمبرگ کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے اس پر حملہ کر دیا۔ بیلجئم کے شاہ البرٹ نے برطانیہ کے شاہ جارج کو مدد کی اپیل کی برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم بھیجا کہ وہ بیلجئم کی غیر جانبدارانہ حیثیت کو تسلیم کرے ورنہ برطانیہ جنگ میں کود پڑے گا، اس طرح برطانیہ بھی جنگ میں شریک ہو گیا۔

بیلجئم کی فوج نے برطانیہ اور فرانس کی مدد سے جرمنوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب جرمنی نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہیں فرانس کی سرزمین پر پہنچنے کے محدود ذرائع کا علم تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ہالینڈ کا آسان اور سیدھا راستہ اپناتے جرمنی نے بیلجئم کے راستے فرانس پر چڑھائی کو ترجیح دی جو کہ نسبتاً ایک مشکل علاقہ تھا۔ جرمن فوج کو فرانس کے چار بڑے دریاؤں کو عبور کرنا تھا اس میں دریائے میوز، دریائے سوم، دریائے الیس اور دریائے ولیسے شامل تھے۔ یہ فوجیں بالآخر ''مارن'' پہنچ گئیں۔ اس محاذ پر جرمن کو فیصلہ کن کاروائی کا موقع مل گیا اور پیرس ان کے رحم وکرم پر تھا۔ پھر نہ جانے کیوں وہ یکا یک پیچھے ہٹے اور خندقیں کھود کر ان میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے بعد کے تین سال انہیں خندقوں میں گزار دیئے۔

اتحادیوں کی دو لاکھ پچاس ہزار ہلاکتیں ہوئیں اور جرمنی کی کچھ اس سے زیادہ جو ایک مہنگی فتح تھی لیکن فتح بہر حال تھی۔ اگست کے آخر میں ٹائن برگ کی لڑائی میں جرمنوں کی فتح فیصلہ کن ثابت ہوئی، بحیرہ بالٹک کے قریب مشرقی پرشیا کے محاذ پر ہڈن برگ نے روسی جنرل سیمونوف کی دوسری روسی فوج کو شکست دے کر کونگیز برگ کی فتح کا راستہ روکا۔ جرمنوں کے دس ہزار سے پندرہ ہزار تک فوجی ہلاک ہوئے۔

ٹائن برگ کی فتح سے نہ صرف جرمنوں کی یورپ میں پوزیشن مضبوط ہوئی بلکہ ان کا حوصلہ بھی بلند ہوا جبکہ یورپ میں روس کی ساکھ کو شدید جھٹکا لگا۔ بعض وجوہ کی بنا پر ترکی کے وزیر دفاع انور پاشا کا جھکاؤ جرمنی کی طرف تھا چنانچہ اکتوبر کے آخر میں ترکی نے بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا جس کی وجہ سے اتحادیوں

کے لئے پیچیدہ صورت حال پیدا ہو گئی۔ برطانیہ اور فرانس کے جنگی جہازوں نے ترکی کے جزیرہ نما گیلی پولی کے قلعوں پر شدید بمباری کی جو کہ بحیرہ ''میمورا'' اور استنبول میں رسائی کا راستہ ہیں۔ اتحادیوں کا بنیادی اور فوری مقصد استنبول پر قبضہ تھا۔ چرچل کے مطابق اس سیکٹر پر حملے سے جرمنی کا روس کی طرف دباؤ کم ہو جائے گا۔ روسی دو مرتبہ اتحادیوں سے اس علاقہ میں مداخلت کی درخواست کر چکے تھے، کیوں کہ وہ استنبول پر قبضہ اپنے فوجی مقاصد کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

ایک بلند و بالا جنگی جہاز بھاپ اڑاتا، سمندری لہروں کو چیرتا، جھاگ اڑاتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ایک تارپیڈو نے اس کے پرخچے اڑا دیئے، جہاز میں ہلچل مچ گئی اور اس پر سوار انسان اس ناگہانی آفت پر شور مچانے لگے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کی سمندری جنگ کی ابتداء تھی اور یہ تارپیڈو سمندری جنگ میں استعمال ہونے والا ایک نیا اور منحوس ہتھیار تھا جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے ایک کشتی کے ذریعے جہاز میں سوراخ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد آب دوز کشتی سمندر پر تیر رہی تھی۔

اس صورت حال سے پریشان ہو کر جرمنی نے اعلان کیا کہ وہ اپنی ''یوبوٹوں'' کے ذریعے اب تجارتی جہازوں کو بھی تباہ کرے گا۔ جرمنی میں ''یوبوٹوں'' پر سوار آدمی قومی ہیرو بن گئے اور باقی دنیا جرمنوں کی اس حرکت کی شدید مذمت کرنے میں لگی ہوئی تھی جس کے تحت وہ بلا کسی وارننگ کے غیر ملکی جہازوں کو تباہ کر رہے تھے۔ اسی دوران حکومت امریکہ نے شدت کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کیا کہ جرمنی ایسا کرنے سے باز آ جائے۔

امریکہ کی طرف سے جرمنی کے ساحل کے قریب دو جہاز ڈبونے اور ناروے کے جہاز پر تارپیڈو کے حملے کے بعد جرمنوں نے برطانیہ کے قریب نیوٹرل سمندر میں حملے تیز کر دیئے۔ جرمنوں نے 18 فروری 1915ء کے بعد اس علاقہ کو جنگی علاقہ قرار دے دیا، ان کے اعلان کے مطابق اس زون میں کوئی بھی جہاز چاہے وہ مسافر بردار ہو یا سامان بردار تباہ کر دیا جائے گا۔ ریاست متحدہ امریکہ نے اس

علاقے میں اپنے کسی جہاز پر ممکنہ جرمنی کے حملے کے پیش نظر جرمنی کو دھمکی دی لیکن جرمنی نے کوئی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وارننگ دی کہ آئر لینڈ اور برطانیہ کے ارد گرد سمندر میں بارودی سرنگیں بچھائی جائیں گی جسے اس نے حفاظت خود اختیاری کا نام دیا۔

31 مئی **1916**ء کی ایک دوپہر کو جرمنی کے دو تباہ کن جہازوں نے شمالی سمندر میں ڈنمارک کے ایک مال بردار جہاز کو گھیر لیا اور اس کی تلاشی لینے لگے کہ اس میں اسلحہ وغیرہ تو نہیں چھپایا گیا۔ جرمن اپنے کام میں مشغول تھے کہ دور سمندر کے افق پر ایک دھندلا سا نقطہ نظر آنے لگا۔ جلد ہی یہ نقطہ دو برطانوی کروزوں میں بدل دیا گیا۔ برطانوی جہازوں کو دیکھتے ہی جرمنوں نے اپنے جہازوں پر نصب توپیں درست کیں اور تیزی کے ساتھ گولہ باری کرنے لگیں۔ اس کے جواب میں برطانوی جہازوں نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ ہی ''جٹ لینڈ کی جنگ'' کا آغاز ہو گیا۔

اٹلی نے جرمنی اور آسٹریا سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن اس معاہدے کی پاسداری نہ کرتے ہوئے **22** مئی **1916**ء کو اٹلی نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور عام پیش قدمی کا حکم دیا اور جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ اٹلی کے خلاف جنگ میں شامل ہو گیا اس طرح جنگ کا دائرہ مزید وسیع ہوتا گیا۔

1917ء میں برطانوی محاصرہ دن بدن سخت ہوتا جا رہا تھا اور جرمن سمندر میں بے خوفی کے ساتھ منظم ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی آبدوزوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور ان کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ اپریل تک برطانوی بحری بیڑے کا دس لاکھ ٹن وزن سمندر کی تہہ میں پہنچ چکا تھا اور اب ان کے پاس صرف اتنی خوراک باقی رہ گئی تھی کہ وہ بمشکل تمام چھ ہفتوں تک گزارہ کر سکتے تھے۔

اس خطرناک اور تباہ کن صورت حال سے پریشان ہو کر اتحادیوں نے اپنے جہازوں کو اکیلے سمندر میں بھیجنے کے بجائے کئی کئی جہازوں کے بیڑوں کی صورت میں بھیجنا شروع کر دیا، اس انتظام کے ساتھ کہ وہ جرمن آبدوزوں سے محفوظ رہیں اور اگر موقع ملے تو انہیں تباہ بھی کر سکیں۔ لیکن جرمنوں کی ''یو بوٹ'' اتحادیوں کے لئے موت کا

پھندہ بن چکی تھیں ۔اب تک دونوں سمندروں میں بے حد تباہی و بربادی پھیلا چکے تھے۔ برطانیہ کی بحری فوج کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا، جسے دیکھتے ہوئے کوئی بھی فوجی مبصر یہ بات آسانی کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ جرمنی یہ جنگ جیت لے گا۔لیکن جرمنی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے امریکی جہاز لوسی ٹینیا کوڈبو دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ بھی برطانیہ اور فرانس کے دوش بدوش براہ راست اس لڑائی میں شریک ہوگیا۔امریکہ نے جنگ کے پہلے اقدام کے طور پر جرمن کے اکانوے جہاز پکڑ لئے جن میں ستائیس نیویارک کی بندرگاہ پر لنگر انداز تھے۔پینسٹھ افراد کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

آسٹریا اور ہنگری کے وسائل دن بدن ختم ہو رہے تھے،سال کے اختتام پر وہ اٹلی کے مسلسل حملوں کو صرف جرمنوں کی مدد سے پسپا کر سکتے تھے۔بالآخر اٹلی کیپوریٹو کے محاذ پر ذلت امیز شکست کھا کر بھاگا۔1917ء کا سال روسیوں کے لئے بھی ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔فروری میں پیٹروگراں میں (اب سینٹ پٹیسرگ) جو بغاوت اٹھی تھی زار روس کی دستبرداری پر منتج ہوئی اور اس کے نتیجے میں صوبائی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

یہ حکومت جرمنوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھی جبکہ بالشویک پارٹی جنگ کا خاتمہ چاہتی تھی۔ جولائی میں بالشویکوں کی ناکام بغاوت کے بعد دوسری بغاوت زیادہ کامیاب رہی اور بالشویکوں نے بغیر کسی مزاحمت کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ 8 نومبر کو امن کا اعلامیہ جاری ہوا جس کے ساتھ ہی جرمنوں کے ساتھ جنگ بندی ہوگئی اور اس کے نتیجے میں مشرقی محاذ خاموش ہوگیا اور جنگ کا فیصلہ کن زور مغربی محاذ پر منتقل ہوگیا۔

امریکی صدر ووڈ رو ولسن نے جنگ کے بعد کے مسائل سے نمٹنے کے لئے کانگرس کے مشترکہ اجلاس میں اپنے چودہ نکات پیش کئے ۔جن کے مطابق:

(1) فوری طور پر معاہدہ امن کئے جائیں۔

(2) جنگ اور امن میں سمندر میں آزادانہ رسائی۔

(3) تجارت میں معاشی رکاوٹوں کو دور کیا جائے اور تجارت کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔

(4) ہتھیاروں میں تخفیف کی جائے۔

(5) نوآبادیاتی نظام کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور نوآبادیات کے عوام کے حقوق کو اہمیت دی جائے۔

(6) روسی علاقوں کا انخلاء اور روس کو اپنے ادارے آزادانہ طور پر قائم کرنے کا اختیار دیا جائے۔

(7) بلیجئم کا بلا شرط انخلاء تمام فرانسیسی علاقے کو خالی کیا جائے جس میں (Alsace Lorrain) کے علاقے کی بازیابی بھی شامل ہو۔

(8) اٹلی کی سرحد کو بین الاقوامی سرحد کے مطابق ٹھیک کیا جائے۔

(9) آسٹریا ہنگری کے عوام کو خود مختاری دی جائے۔

(10) رومانیہ، سربیا اور مونٹے نیگرو کو خالی کیا جائے اور سربیا کو سمندر تک رسائی دی جائے۔

(11) ترکوں کو سلطنت عثمانیہ میں خود مختاری دی جائے لیکن دوسری قوموں کو انفرادی طور پر ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔

(12) پولینڈ کی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی رسائی سمندر تک ہو۔

(13) اقوام کی ایسی مشترکہ ایسوایشن بنائی جائے جو تمام اقوام کی آزادی اور علاقائی سالمیت کی گارنٹی دے سکے۔

20 فروری 1918ء تک التوائے جنگ کی مدت ختم ہوگئی تو جرمنی کی فوج نے روس پر شدید حملے کا آغاز کر دیا۔ جرمنوں کا مقصد روس کے گھٹنے ٹیکنا اور اسے امن معاہدے کے لئے مذاکرات پر مجبور کرنا تھا کرنل جنرل کاؤنٹ کرک باخ کی زیر کمان دستے پیش قدمی کرتے ہوئے لیوانیا اور استوانیا کے شہروں میں داخل ہو گئے۔ انہیں بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ مقامی لوگوں نے جو بالشویک انقلاب کے مخالف تھے انہیں خوش آمدید کہا۔ جرمنوں نے جلد ہی ریگا اور خلیج فن لینڈ

کے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر لیا کوئی طاقت جرمن پیش قدمی کو نہ روک سکی اور پیٹر وگراڈ پر چڑھائی کرتے چلے گئے۔روسیوں نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنے پیچھے اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ دیا۔

برطانوی عوام فیلڈ مارشل ہیگ کی فوج میں کمی کا مطالبہ کر رہی تھی اور لوگوں تک افواج کے گرمی سے نڈھال ہونے کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔اتحادیوں نے 27 مئی کو نئے حملہ کا منصوبہ بنایا اس وقت جرمنوں کی 30 ڈویژن فوج AIONE کو عبور کر چکی تھی،انہوں نے خاموشی سے پیش قدمی کی تھی اور گھوڑوں کے سم نرم کپڑوں سے لپیٹ دیئے تھے۔فوجی دستے دن کے وقت جنگلوں میں چھپ جاتے اور جہازوں کی نظر میں نہ آتے اور رات کو پیش قدمی کرتے۔30 مئی کو کچھ جرمن Chateu Thierry کے مقام پر پہنچ گئے جو آمد ورفت کا ایک بڑا مرکز تھا۔امریکی ساتویں انفنٹری کے کچھ جوان پہلے ہی وہاں موجود تھے۔مرکزی پل پر تعینات کچھ جوانوں نے جرمنوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا اور بعد ازاں دست بدست جنگ کا آغاز ہوا۔جرمن مشرق کی طرف مڑ گئے اور 3 جون تک وہ ایک بار پھر Marne پر تھے اور پیرس 56 میل دور تھا۔جرمن بیڑے کے لئے آخری جدوجہد کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو 29 اکتوبر کو فوج میں بغاوت شروع ہوگئی جب بغاوت پر قابو پایا گیا تو جرمنوں کا عظیم بحری بیڑہ اتحادیوں کے حوالے کر دیا گیا۔اب جرمنوں کی شکست کے آثار نظر آرہے تھے۔

مارچ 1918ء میں جرمن فوج نے جتنے بھی حملے کئے اتحادی فوجوں نے مشترکہ حکمت عملی سے روک دیئے۔مارنے اور ویسلے کے مقام پر جرمن فوجوں کو دو میل تک پیچھے دھکیل دیا گیا۔30 ستمبر تک اتحادی افواج نے فرانس میں جرمن صفوں کے اندر تک رسائی حاصل کر کے اہم فتوحات حاصل کیں،ہزاروں سپاہیوں کو قیدی بنا لیا۔اسی قسم کا نقصان جنرل ہنڈن برگ کی فوجوں کو بھی اٹھانا پڑا۔جرمن ابھی پچھلے حملے سے سنبھل نہیں پاتے تھے کہ انہیں ایک نئے حملے کا سامنا کرنا پڑتا۔جرمن فوجوں کی شکست کا مطلب یہ تھا کہ جنگ اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی۔آخرکار

14 اکتوبر 1918ء کو جرمنی نے ولسن کے چودہ نکات کی بنیاد پر امن کی اپیل کی۔ 30 اکتوبر کو ترکی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد پورے یورپ کے جنگی میدانوں پر سے جنگ کے بادل چھٹ گئے۔ 11 نومبر کو صبح پانچ بجے جرمنوں نے جنگ بندی پر دستخط کر دیئے، جس کے بعد باضابطہ طور پر چار سالہ لمبی جنگ بند ہوگئی۔

اکیاون ماہ تک جاری رہنے والی اس جنگ کا اختتام اتحادیوں کی فتح اور محوری طاقتوں کی امریکی صدر وڈ رو ولسن کے چودہ نکات کو مانتے ہوئے ہتھیار ڈال کر شکست کی صورت میں ہوا۔ اس جنگ میں تقریباً تین کروڑ آدمی مارے گئے، دو کروڑ کے قریب زخمی ہوئے اس کے علاوہ جو جائیدادیں تباہ ہوئیں وہ بے حساب تھیں۔

درحقیقت جنگ عظیم اول کے خاتمے پر اتحادیوں نے جنگ میں ہتھیار ڈالنے والی اقوام کے ساتھ جو ذلت امیز برتاؤ کیا، اس کا اندازہ ان کے ساتھ کئے جانے والے معاہدوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ان معاہدوں نے شرم ناک معاہدوں کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ بعض مغربی دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ معاہدے جنگ کا ردعمل تھے۔ ان اقوام کے خلاف جو تہذیب سے خارج ہوگئی تھیں اور انہوں نے دنیا کو کشت و خون کی گھاٹیوں میں دھکیل دیا تھا۔ کیا جنگ کے بعد کئے گئے معاہدات امن تہذیب علامت اور مہذب قوم کے اخلاق کے آئینہ دار تھے۔ اس کا جواب کئی عشرے گزر جانے کے باوجود نفی میں ملتا ہے، کیوں کہ نام نہاد امن معاہدوں کے تحت جبراً جانبدارانہ شرائط پر مفتوح اقوام کے علاقوں کے حصے بخرے کئے قوموں کو تقسیم کر دیا گیا اور نہایت خودغرضی کے ساتھ تاوان جنگ وصول کیا گیا۔ یعنی یہ معاہدات امن تحکمانہ صلح تھے ان میں دیگر معاہدے اس طرح تھے:

(۱) جرمنی کے ساتھ معاہدہ ورسلز 28 جون 1919ء کو ہوا۔

(۲) آسٹریا کے ساتھ معاہدہ سینٹ جرمین 10 دسمبر 1919ء کو ہوا۔

(۳) ہنگری کے ساتھ معاہدہ ٹرائینن 4 جون 1919ء کو ہوا۔

(۴) بلغاریہ کے ساتھ معاہدہ نیولی 27 نومبر 1919ء کو ہوا۔

(۵) ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورز 10 اگست 1920ء کو ہوا۔

معاہدہ ورسلز (جرمنی اور اتحادی 1919ء)

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد پیرس میں ورسلز کے مقام پر 32 ممالک کے نمائندے اکٹھے ہوئے اور چار رکنی کونسل قائم کی گئی جس کا کام عہد ناموں (معاہدوں) کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ اس کی سربراہی امریکی صدر وڈرو ولسن اور برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج کر رہے تھے۔ مشاورت کے فرائض فرانس اور اٹلی کے صدور انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ معاہدہ تیار ہو گیا لیکن درحقیقت یہ معاہدہ ایسا تھا کہ اس سے یورپ کے علاقائی مسائل حل ہونے کی بجائے مزید پیچیدہ ہو گئے۔ اسی معاہدہ میں صدر ولسن کے پلان کے مطابق لیگ آف نیشنز کے قیام کی شق بھی شامل تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں جرمنوں کے لئے سخت سزا کا پہلو بھی تھا۔ جب معاہدے کا مسودہ تیار ہو گیا تو جرمنی سے اپنے نمائندے بھیجنے کے لئے کہا گیا لیکن جرمنی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے بعض ماتحت افسران کو مسودہ برلن لانے کے لئے بھیجے گی۔ اس طرز عمل کو اتحادیوں نے اپنی توہین سے تعبیر کیا اور جرمنی سے کہا کہ اگر وہ حالات کی گتھیاں سلجھانے کو تیار ہے تو مکمل اختیارات رکھنے والے نمائندوں کو بھیجے۔ چنانچہ جرمن حکومت کی طرف سے وزیر خارجہ کی قیادت میں ایک وفد پیرس بھیجا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب ورسلز میں امریکہ اور دیگر اتحادی اور غیر جانبدار ممالک کے وفود پہنچے تو گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ لیکن جرمن وفد کی آمد پر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ وفد کی فرانس آمد پر فرانس کے وزیر اعظم کلیمنشو نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: ''تم لوگوں نے پوری دنیا پر جنگ مسلط کی تھی، اب وقت آ گیا ہے کہ تم سے حساب چکایا جائے۔''

جرمن وفد کے ارکان کی نقل و حرکت کی اتحادیوں کی طرف سے سخت قسم کی نگرانی کی جاتی تھی۔ انہیں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے کہا گیا اور ان کا ہر قسم

کا مواصلاتی رابطہ ختم کر دیا گیا۔ 22 جون 1919ء کو معاہدہ امن کی شرائط ان کے حوالے کی گئیں اور کہا گیا کہ وہ اس کا جواب پانچ دن کے اندر اندر دیں۔ پانچویں روز جب جرمن وفد پیرس سے ورسلز محل معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے روانہ ہوا تو فرانسیسی عوام نے انتظامیہ کی سر پرستی میں اس پر پتھر برسائے اور اس کی تذلیل کی۔

ورسلز میں 28 جون 1919ء کو آسٹریا کے مقتول شہزادے آرچ ڈیوک فرڈینڈ کی پانچویں برسی کے موقع پر اس وفد کو شیشے کے ایک ہال میں کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے قیدیوں کی طرح لایا گیا۔ ان حالات میں اس شرمناک معاہدہ امن کو آخری شکل دی گئی۔ معاہدہ ورسلز کی دستاویز پندرہ حصوں اور 440 دفعات پر مبنی تھی۔ معاہدے کی شرائط کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

(الف) معاہدے کی ابتدائی دفعات مجلس اقوام کے حوالے سے تھیں۔

(ب) جرمنی سے الساس اور لورین کے علاقوں کو واپس لے کر فرانس کے حوالے کر دیا گیا۔ یوپین اور مال میڈی بلجئم کو دے دیئے گئے۔ سبل لتھونیا کو اور مشرقی پروشیا کی تقریباً چالیس میل لمبی ساحلی پٹی اور مغربی پروشیا کا صوبہ پوزن پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ سسلی کا اوپری حصہ اقتصادی اعتبار سے اہم تھا، وہ بھی پولینڈ کو دے دیا گیا۔ ڈینزک شہر کو جرمنی سے کاٹ کر آزاد شہر بنا دیا گیا اور اس شہر میں پولینڈ کو خصوصی حقوق دے دیئے گئے۔

(ج) وادی سار کو، جو کان کنی کی وجہ سے مشہور ہے پہلے ریفرنڈم کے لئے مجلس اقوام کے حوالے کرنے کے لئے کہا گیا (مجلس اقوام کا قیام بھی معاہدہ ورسائی کا مرعون منت تھا) لیکن فرانس نے مطالبہ کیا کہ جنگ کے دوران فرانس کی کئی کوئلے کی کانیں تباہ ہوئی ہیں لہٰذا اس علاقے پر اس کا حق ہے، چنانچہ اسے اس علاقے سے نوازہ گیا۔

(د) رائن لینڈ کے سرحدی فوجی علاقے کو غیر مسلح کر دیا گیا اور جرمنی پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ اس کے مشرقی اور مغربی حصے پر پچاس کلومیٹر تک کوئی فوجی تنصیبات قائم نہیں کرے گا اور جو فوجی اڈے یا تعمیرات موجود ہیں انہیں ختم

کر دیا جائے گا۔ اس علاقے میں نہ فوج رکھی جائے گی اور نہ ہی فوجی معاملات کا کوئی کام ہوگا۔

(ر) آسٹریا ہنگری کی بادشاہت ٹوٹ جانے سے آسٹریا کے جرمن علاقے بوہیمیا، بموراویا اور آسٹریائی سلیشیا نے الگ ہو کر چیکوسلوا کیا کی شکل اختیار کر لی اور جرمنی سے کہا کہ وہ اپنے استحقاق اور الحاق سے ختم ہونے والی ریاستوں کو تسلیم کرے۔

(س) جرمنی کو سمندر پار اپنی تمام نو آبادیات سے دست بردار ہونا پڑا، جاپان کے حصے میں کیئو چو اور شانٹنگ کے صوبے اور دیگر جرمن مقبوضات آئے۔ برطانیہ کو مغربی افریقہ میں جرمن مقبوضات ملے۔ برطانیہ اور فرانس نے کیمرون اور ٹوکو لینڈ کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

(ص) جرمنی نے چین، تھائی لینڈ، مصر، مراکش اور لائبیریا میں اپنے مخصوص حقوق اور مراعات سے دست برداری اختیار کی۔ اتحادیوں نے ان علاقوں میں جرمن جائیداد اور ان کے شہریوں کی بیرون ملک جائیداد وغیرہ کو ضبط کرایا اور جرمن حکومت کو ان کا معاوضہ ادا کرنے کا پابند کر دیا گیا۔

(ع) جرمن جزائر کو تقسیم کر دیا گیا جاپان میں مارشل آئی لینڈ اور شن چن اور نیوزی لینڈ کو سموا اور برطانیہ کو ناروے دیا گیا۔

(ف) جرمنی کی فوجی طاقت بالکل کم کر دی گئی، جنرل اسٹاف کو ختم کر کے جرمن فوجوں کی کل تعداد ایک لاکھ مقرر کی گئی، جن کا کام محض ملک کے اندر امن و امان کی صورت حال برقرار رکھنا اور سرحدوں کی حفاظت کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کسٹم حکام سرحدی محافظ اور جنگلات کے محافظوں کی تعداد 2000 سے نہ بڑھنے پائے۔ پولیس آبادی کے تناسب سے بڑھائی جائے، جرمنی پر پابندی عائد کی گئی کہ جرمن افسروں اور سپاہیوں کی ریٹائرمنٹ پر اس غرض سے پابندی لگائی جائے کہ یہ بعد میں طاقت کے طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں، جامعات اور کسی بھی طرح سے سماجی اور سیاسی

اداروں کو فوجی سازو سامان رکھنے اور تربیت دینے کے انتظامات کرنے سے روک دیا گیا اور سخت پابندی عائد کر دی گئی۔

(ک) جرمن بحریہ کو کمزور کر دیا گیا اور صرف چھ جنگی جہاز رکھنے کی اجازت دی گئی۔اس کے علاوہ چھ چھوٹے بحری جہاز اور بارہ تارپیڈو کشتیاں رکھنے کی اجازت دی گئی۔اسے کوئی آب دوز رکھنے کی اجازت نہ تھی، بحریہ میں افسران سمیت کل پندرہ ہزار سے زیادہ تعداد رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔تعداد سے زائد بحری جہازوں کو تجارتی جہازوں میں بدل دینے کا حکم دیا گیا اور دھمکی دی گئی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انہیں تباہ کر دیا جائے گا۔جرمنی کو فضائی فوج رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔تمام فضائی ہتھیاروں کو اتحادیوں کے قبضے میں دے دیا گیا اور تمام فضائی اکادمیاں بند کرنے کی شرائط عائد کی گئیں۔اتحادیوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے ذرائع سے یا کسی کمشن کے ذریعے جب چاہیں یہ پتا چلائیں کہ جرمنی ان فوجی پابندیوں پر عمل کر رہا ہے یا نہیں۔

(ل) جرمنی کے بادشاہ ولیم دوم کو بین الاقوامی اخلاقیات و معاہدات کی خلاف ورزی کرنے کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس کے خلاف مقدمہ چلایا جائے لیکن ولیم چونکہ نیدر لینڈ میں پناہ لے چکا تھا اور وہاں کی حکومت نے اسے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔لیکن جرمنی کو پابند کیا گیا کہ وہ اتحادیوں کو مطلوب افراد حوالے کرے گا۔تاہم جرمنی کے ایک درجن کے قریب جنگی مجرموں کو عدالت میں جنگی جرائم کی سزائیں دی گئیں۔

(م) جرمنی کو مجبور کیا گیا کہ وہ جنگ کی ذمہ داری قبول کرے، معاہدے کی دفعہ 231 میں جو جنگ کی ذمہ دار کہلاتی ہے ان الفاظ میں جرمنی کو جنگ عظیم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا:

''اتحادی اور محوری ریاستیں یقین کرتی ہیں اور جرمنی یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس تمام نقصان اور تباہی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے جو اتحادیوں اور جرمنی کے

حمایتی محوری ریاستوں اور ان کے شہریوں کو جرمنی اور اس کے ساتھیوں (آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ترکی) کی جارحانہ جنگ کی وجہ سے نتائج کے طور پر مسلط کردہ جنگ کی وجہ سے اٹھانی پڑی ہیں"۔

(ن) یہ طے کیا گیا کہ جرمنی تمام نقصانات کا معاوضہ تو ادا نہیں کر سکتا تاہم ان نقصانات کا تاوان ادا کرے گا، جو اتحادیوں کی جائیداد کی تباہی کی صورت میں زمین، سمندروں اور فضا میں ہوا۔ ان کی تفصیل ایک ضمیمے میں دی گئی تھی جس میں نقصانات کی دس اقسام درج تھیں۔ جرمنی پر ذمے داری عائد کی گئی کہ وہ بیلجیم کی وہ تمام رقوم و قرضہ جات معہ سود ادا کرے گا جو بیلجیم نے دوران جنگ دوسرے ممالک سے لئے تھے۔

(و) ایک کمشن کے تحت جرمنی سے تاوان جنگ اور اس کی وصولیابی کے طریقہ کار کا تعین کرایا گیا، بعد میں مئی 1921ء تک جرمنی کو چھ ارب ساٹھ کروڑ برطانوی پاؤنڈ (بمطابق 32 ملین امریکی ڈالر) قسطوں میں ادا کرنے کو کہا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ نہ صرف رقوم بلکہ جنس کی صورت میں بھی جرمنی تاوان جنگ ادا کرے گا۔ لہٰذا جرمنی کے معاشی وسائل (خصوصاً معدنیات جن میں کوئلہ بھی شامل تھا) کو حملے میں متاثر ہونے والے ممالک کے علاقوں کی تعمیر نو کے لئے استعمال میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ دریائے ایلب، ڈینوب، اوڈر اور نیمن کو بین الاقوامی حیثیت دے دی گئی، نہر کیل کو تمام دنیا کے لئے کھول دیا گیا۔ جرمنی کے ہمبرگ وسٹن کی بندرگاہوں کے آزاد علاقے چیکوسلواکیا کو 99 سالہ پٹے پر دے دیئے گئے۔

مندرجہ بالا شرائط پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک الگ دفعہ رکھی گئی تھی کہ رائن کے مغرب میں جرمنی کے علاقے پر مع پلوں کے پندرہ سال تک اتحادی فوجوں کا قبضہ رہے گا۔ اگر جرمنی نے وفاداری کے ساتھ وعدوں کو نبھایا تو کولون کو پانچ سال بعد کوبیز کو دس سال بعد اور نیمس کو پندرہ سال بعد خالی کر دیا جائے گا اور اگر جرمنی نے معاہدے کی شرائط کے برخلاف رویہ اپنایا تو قبضہ مزید عرصے تک جاری رہے گا۔ معاہدہ

ورسائی میں جرمنی کی طرف سے دستخط کرنے والے جنرل سمنٹس کا کہنا تھا کہ: ''میں نے دستخط اس لئے نہیں کئے تھے کہ یہ قابل یقین یا قابل اطمینان دستاویز ہے بلکہ اس لئے کئے تھے کہ کسی طرح قیام امن ہو جائے''۔ جرمن چلاتے رہے کہ انہوں نے صدر وڈرو ولسن کے چودہ نکاتی امن فارمولے کے مطابق ہتھیار ڈالے تھے لیکن معاہدہ ورسلز کی شرائط کا اس فارمولے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جرمنی میں معاہدہ ورسلز کے مخالف احتجاجاً سڑکوں پر نکل آئے اور جرمن طلباء نے فرانسیسی ملٹری نشان جلا دیا۔ اس معاہدے کے اثرات جرمنی پر ایسے پڑے کہ وہ سکڑ کر معمولی رقبے پر محیط ریاست بن کر رہ گیا اور تاوان جنگ ادا کرتے کرتے کنگال اور دیوالیہ ہو گیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگست 1920ء کے وسط تک مارک کی قیمت 20 مارک فی پاؤنڈ اسٹرلنگ سے گر کر 250 مارک فی پاؤنڈ کے لگ بھگ ہو گئی اور نومبر 1920ء تک مارک کی قیمت ایک ہزار مارک فی پاؤنڈ تک گر گئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب 1923ء کے وسط میں ایک پاؤنڈ کے پچاس ہزار مارک مل سکتے تھے۔ جرمنی کو 6 ارب 60 کروڑ پاؤنڈ بہ طور تاوان جنگ ادا کرنے کا پابند کیا گیا تھا۔ ظلم و ستم پر مبنی اس معاہدہ امن نے جہاں جرمن قوم کو بالکل غلام بنا دیا تھا وہاں دوسری جانب جرمنی کی قومی زندگی میں انانیت پروان چڑھی اور جذبہ قومیت نئے زاویئے سے نمودار ہوا۔

———✡———

معاہدہ سینٹ جرمین (آسٹریا و اتحادی 1919ء)

جنگ عظیم اول کے خاتمے پر اتحادیوں نے نہ صرف جرمنی بلکہ دیگر محوری طاقتوں کے ساتھ بھی امن کے نام پر اپنی پر تذلیل شرائط پر مبنی معاہدے کیے جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ہو بہو معاہدہ ورسلز کی طرز پر تھے اور یہ معاہدات امن بھی اقتصادی کاروائی کے احساس کو مدنظر رکھتے ہوئے کیے گئے تھے۔ آگے چل کر انہیں معاہدوں نے دوسری جنگ عظیم کی راہ ہموار کی اور دنیا ایک مرتبہ پھر تباہی و بربادی کے خطرے سے دوچار ہوگئی۔

معاہدہ سینٹ جرمین 10 دسمبر 1919ء کو سلطنت آسٹریا اور اتحادیوں کے مابین طے پایا، مفتوح سلطنت کے عوام سمجھ رہے تھے کہ اب امن ہو جائے گا اور حالات اسی طرح رہیں گے۔ لیکن جب جب انسان نے خون گوشت اور ہڈیوں کی راکھ پر بیٹھ کر امن بحال کرنے کی نام نہاد تدابیر کیں اور شیطانیت کے عملی مظاہرے کیے تو انسانیت کو بڑی بربریت کا سامنا کرنا پڑا۔ کل 286 دفعات اور 6 ضمیموں پر مشتمل اس معاہدے کی شرائط کے تحت آسٹریا، ہنگری کی سلطنت ختم کر دی گئی۔

آسٹریا نے چیکوسلواکیا، پولینڈ اور یوگوسلاویہ کی خودمختاری کو تسلیم کیا۔ یہ وہ ریاستیں تھیں جن میں خود آسٹریا کے علاقے شامل تھے۔ اس کے علاوہ بھی اتحادیوں نے آسٹریا کے بہت سے علاقے آپس میں تقسیم کر لئے، خاص طور پر ٹائیرول اٹلی کے حوالے کیا گیا۔ اس کے علاوہ معاہدے کی رو سے آسٹریا پر یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ وہ جرمنی کے ساتھ نہ عارضی الحاق کرے گا اور نہ مکمل طور پر متحد یا ضم ہوگا۔

آسٹریا کے دفاع کو قابل تسخیر بنانے کی غرض سے اتحادیوں نے لاکھوں کی تعداد میں افواج رکھنے والے ملک کو صرف تیس ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی۔ آسٹریا

کی بندرگاہیں اتحادیوں نے نہ صرف آپس میں تقسیم کر لیں بلکہ اب ان بندرگاہوں سے معاشی فوائد حاصل کرنے کی غرض سے خود آسٹریا کے لئے اتحادیوں کو محصول دینا لازمی قرار دے دیا گیا اس کے ساتھ ہی آسٹریا کو بھاری تاوان جنگ ادا کرنے کا بھی پابند کیا گیا لیکن **1920** ء تک جب آسٹریا مکمل طور پر دیوالیہ ہو گیا اور لوگوں کے لئے پیٹ کی آگ بجھانا مشکل ہو گیا تو اتحادیوں نے ملکی نوادرات، صنعتیں اور زیر کاشت اراضی اونے پونے داموں فروخت کر کے یا پھر ان پر مکمل قبضہ کر کے تاوان نہ ملنے کی بھڑاس نکالی۔ الغرض اس معاہدے کی وجہ سے آسٹریا ایک چھوٹی سی جمہوریہ بن گیا جس کے پاس نہ کوئی بندرگاہ تھی اور نہ دیگر معاشی ذرائع۔ اس کی آبادی اور رقبہ پرتگال سے بھی کم ہو کر رہ گیا۔

معاہدہ نلی (بلغاریہ و اتحادی 1919ء)

معاہدہ نلی 27 نومبر 1919ء کو سلطنت بلغاریہ اور اتحادیوں کے درمیان طے پایا۔ یہ معاہدہ کل 296 دفعات اور 13 حصوں پر مشتمل تھا، جس کی ابتدائی 26 دفعات انجمن اقوام کے حوالے سے تھیں ۔ یہ معاہدہ امن بھی مفتوح اقوام کو محکوم بنانے کے اقدام سے کسی طرح کم نہیں تھا جو بلغاریہ سے ڈنڈے کے زور پر لیا گیا تھا۔ معاہدے کی رو سے بلغاریہ وہ تمام علاقے واپس کرنے کا پابند تھا جو بلقان کی جنگوں کے اختتام پر اسے معاہدہ لندن مئی 1913ء کے تحت دیئے گئے تھے۔ (واضح رہے کہ بلقانی جنگ میں بلغاریہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف تھا، اس لئے مغربی اقوام خصوصاً برطانیہ اس کے ساتھ تھیں لیکن اب بلغاریہ خود یورپ سے برسرِ پیکار تھا اس لئے اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو یورپ کے فاتح ملک اپنے دشمن کے ساتھ کیا کرتے تھے) مقدونیہ کا ایک حصہ یوگوسلاویہ کو اور دبروجا کا تمام علاقہ رومانیہ کو دیا گیا۔ بلغاریہ نے ٹرین شیئن ،تھریشین چرسونیز کا ساحل اتحادیوں کے حوالے کر دیا۔

تاوان جنگ کے تعین کے لئے تاوان کمشن قائم کیا گیا جس نے طے کیا کہ بلغاریہ نہ صرف کرنسی کی صورت میں تاوان ادا کرے گا بلکہ جنس کی صورت میں بھی بلغاریہ سے تاوان وصول کیا جائے گا جس میں معدنیات خصوصاً مویشی قابل ذکر تھے۔ تاوان کمشن نے بلغاریہ کو ابتدائی طور پر 5 لاکھ ڈالر بطور تاوان ادا کرنے کا پابند کیا۔ اس کے بعد بھی مخصوص مالیت کا تاوان وصول کرنے کے لئے کمشن غور وخوض کرتا رہا۔ بلغاریہ کو اپنی افواج میں کل 414 افسران اور 5380 رنگروٹ رکھنے کی اجازت تھی۔ فوجی اعتبار سے بلغاریہ کو اتنا پابند کر دیا گیا کہ اسے اتحادیوں کی جانب سے تعین

کردہ تعداد کے اعتبار سے زائد افواج یا سامان حرب رکھنے کی اجازت نہ تھی ۔ وہ ایک مخصوص تعداد سے زیادہ مشین گنیں اور ان کی گولیوں کے راؤنڈ تک نہیں رکھ سکتا تھا۔ معاہدے کا اثر بلغاریہ پر ایسا پڑا کہ یہ قوم کافی عرصے تک خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور رہی اور معاشی وسائل اتحادیوں کی مرضی کے تابع ہو کر رہ گئے۔

معاہدہ ٹرائینن (ہنگری و اتحادی)

معاہدہ ٹرائینن جنگ عظیم اول کے بعد اتحادیوں اور محوریوں کے درمیان ہونے والے معاہدات کی ایک بدترین علامت کے طور پر تاریخ میں آج تک زندہ ہے جو ہنگری سے سلوک کے حوالے سے 4 جون 1919ء کو ہوا۔ اس معاہدے کو امریکہ، فرانس، برطانیہ، اٹلی اور جاپان نے تیار کیا تھا۔ دیگر فریقین میں بیلجیم، کیوبا، چین، یونان، نکاراگوا، پانامہ، پولینڈ، پرتگال، رومانیہ، سیام اور چیکوسلواکیہ شامل تھے۔ کل 314 دفعات پر مبنی اس معاہدے میں ہر فریق ریاست سے ہنگری کے تعلق اور پابندیوں کے حوالے سے الگ الگ شرائط رکھی گئی تھیں۔ معاہدے کی رو سے ہنگری نے مکیارکی آبادی سے دست برداری اختیار کی۔ سلویک کا صوبہ چیکوسلواکیہ کو دے دیا گیا ٹرانسلو کا علاقہ رومانیہ کے حوالے کر دیا گیا، کروشیا کا علاقہ یوگوسلادیہ کے حوالے کر دیا گیا معاہدے کی رو سے ہنگری کی فوجی قوت کو 35 ہزار افراد تک محدود کر دیا گیا۔

درحقیقت صلاح نامہ مرتب کرنے والوں کو کسی قدر یہ دھن تھی کہ جہاں کہیں بن پڑے اپنے اصولوں میں ایسی کھینچ تان کریں کہ اتحادیوں کو فائدہ پہنچے اور دشمن ملک کو نقصان ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کے نتیجے میں یورپ کے نقشے کی ازسرنو تشکیل ہوئی۔ ٹرینن سے قبل آسٹریا ہنگری کا ہنگرین مکیار پر مشتمل کل رقبہ 125.600 مربع میل تھا معاہدے کے بعد یہ رقبہ 89.700 مربع میل رہ گیا۔ یعنی پہلے رقبے میں سے 71.4 فیصد علاقہ باقی رہ گیا تھا اور 29.6 فیصد علاقے کو اتحادیوں نے مال غنیمت سمجھتے ہوئے آپس میں تقسیم کر لیا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہنگری نہ آسٹریا سے دوبارہ الحاق کر سکتا ہے اور نہ کسی اور ریاست سے۔ اس لئے اس معاہدے کے ذریعے ہنگری کا ایک طرح سے نیا وجود عمل میں آیا۔

معاہدہ سیورز (ترکی واتحادی 1920ء)

معاہدہ سیورز ترکی اور اتحادیوں کے مابین 10 اگست 1920ء کو طے پایا۔ یہ 13 حصوں اور 433 دفعات پر مشتمل تھا۔ درحقیقت ترکی نے جنگ میں اتحادیوں کے خلاف محوری طاقتوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے ان کے ساتھ اسے بھی امن معاہدے کی چکی میں پسنا پڑا، ورنہ اٹلی اور ترکی کے درمیان کوئی تنازعہ نہ تھا طرابلس الغرب کی تمام آبادی مسلمان تھی اور نسلاً ترک اور عرب اور کچھ اطالوی بھی تھے لیکن وہ سلطنت عثمانیہ میں اچھی طرح مطمئن تھے چنانچہ اٹلی نے بلا کسی اشتعال کے ستمبر 1911ء کو اعلان کر دیا کہ وہ ترکی پر حملہ کرنے والا ہے۔

اٹلی کو دوسری بڑی طاقتوں کی وجہ سے شہہ ملی کیوں کہ فرانس تیونس پر قابض تھا اور روس قسطنطنیہ پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا، چنانچہ فرانس نے اٹلی کی رنجش دور کرنے کے لئے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ ترکی پر حملہ کرے۔ صرف یہی نہیں اس نے مصر کے ترکوں کا ملک ہونے کے باوجود مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے ترکوں کو براستہ طرابلس الغرب اپنی فوجیں لے جانے سے روک دیا۔

ترک اطالویوں کا بڑی دلیری سے مقابلہ کر رہے تھے لیکن 1912ء کے آغاز میں یونان حکومت کی کوششوں سے یونان، بلغاریہ اور سرویا کا ترکیہ کے خلاف ایک اتحاد وجود میں آگیا اور انہوں نے سلطنت عثمانیہ کی عیسائی آبادی کے حقوق کی حفاظت کے بہانے ترکوں سے جنگ لڑنے کا اعلان کر دیا۔ ترکوں نے زیادہ محاذوں پر مقابلہ کرنے کے بجائے اٹلی سے معاہدہ صلح کرنے میں عافیت سمجھی اور ایک معاہدے کے تحت اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ بلقان کی جنگ میں ترکوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ یورپی مداخلت نے ان کی فوجوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا کیوں کہ ترکی حکومت اور بیوروکریسی

میں یورپ کے آلہ کار موجود تھے۔اسی دوران جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو ترک کسی صورت بھی برطانیہ اور فرانس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ ترک جرمنی کے حلیف بن کر جنگ میں شامل ہو گئے۔اس جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور ہنگامی طور پر ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے۔

معاہدے کی رو سے اتحادیوں کو یہ حق حاصل تھا کہ آبناؤں پر قبضہ کر لیں اور ایشیائی ترکی کے کسی بھی حصے پر قابض ہو جائیں۔ترکی کے زیر استحقاق علاقے میں ایک نئی عیسائی جمہوریہ آرمینیا کو وجود میں لا کر بین الاقوامی تحفظ میں دیا گیا اور اس کی حدود کا تعین امریکہ کی مدد سے کیا گیا۔اس میں مشرقی اناطولیہ، ارض روم، وان بتس، ترابزون اور زنجان کے صوبے شامل تھے۔مشرقی تھریس کا سارا علاقہ اور مغربی تھریس کا کچھ علاقہ یونان کو دیا گیا۔سمرنا کا ضلع امبروس، گیلی پولی روڈ وسٹا کے جزائر بھی یونان کو دے دیئے گئے۔جنوبی اناطولیہ، ڈوڈی کانسیس کے جزائر بشمول رہوڈز اٹلی کے سپرد کر دیئے گئے۔درہ دانیال اور باسفورس کو بین الاقوامی تحویل میں دے دیا گیا۔شام کا انتراب فرانس کو اور میسو پوٹیما (موجودہ عراق) فلسطین اور مشرقی اردن کے انتراب برطانیہ کو دینے کی سفارش کی گئی، جس پر عملدرآمد چند سال بعد معاہدہ لوسین کے تحت ہوا۔عثمانی سلطنت کے بقیہ عرب صوبوں نے آزادی حاصل کر لی۔

بحیرہ احمر کے کنارے عرب کی ساحلی پٹی میں جو مسلمانوں کی نظر میں اس لئے اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات ہیں، حجاز کی خود مختار بادشاہت قائم ہو گئی۔بقیہ عرب میں ترکی کا اقتدار اعلیٰ بس برائے نام تھا اور ان علاقوں میں کئی خود مختار امیر سلطان شیخ شریف اور امام اپنا اپنا حکم چلاتے تھے۔ترکی کو صرف پچاس ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی گئی اور لازمی فوجی تربیت ختم کر دی گئی۔اسلحے کی تعداد بھی مقرر تھی۔اتحادیوں کے نمائندوں پر مشتمل دو کمشن بنائے گئے۔پہلے کمشن کا کام ترکی کا بجٹ عوامی قرضوں، کرنسی، کسٹم، مراعات، بالواسطہ یا بلا واسطہ ٹیکسوں پر کنٹرول اور نگرانی تھا۔دوسرے کمشن کے امور میں معاہدات کی شرائط پر پابندی کروانا شامل تھا۔ترکی کے لئے شرائط اس طرح تھیں:

(1) ترکی اپنی تمام افواج برخاست کر دے گا۔
(2) ترکی کے تمام جنگی جہاز اتحادی فاتحین ضبط کر لیں گے۔
(3) ملک کی ریلوے کی نگرانی اور ان پر تصرف کا حق صرف اتحادیوں کو ہوگا۔
(4) ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدوں کے تعین کے علاوہ اندرون ملک کا انتظام ترکی کے اختیار میں ہی رہے گا۔

اس کے بعد اتحادیوں کے نمائندے سان رومیو (پیرس) میں جمع ہوئے اور انہوں نے ترکی کے لئے معاہدے کی شرائط مرتب کیں یہ معاہدہ سیورے کے نام سے مشہور ہے۔اس کی شرائط یہ تھیں:

(1) سلطان اتحادیوں کی زیر حمایت قسطنطنیہ پر حکومت کرے گا۔
(2) اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آبناؤں پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی کہ ایشیائی ترکی کے کسی حصے پر قابض ہو جائیں گے۔
(3) ارمینہ کی ایک نئی حکومت قائم کی جائے گی جس میں مندرجہ ذیل علاقے شامل کئے جائیں گے: مشرقی اناطولیہ ،ارض روم، دان ، بتلس ، ترابزون، ارزنجان، اس ریاست کی حد بندی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی رضامندی سے قائم کی جائے گی۔
(4) ترکی عرب کے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار سمجھا جائے گا۔
(5) شام کی حکم برداری فرانس کو ،عراق اور اردن کی برطانیہ کو ،عدلیہ اٹلی کو اور مغربی اناطولیہ یونان کو سونپی جائے گی۔

متعصبانہ رویے اور تذلیل پر مبنی اس معاہدے کے خلاف مسلمانان عالم نے نفرت کا اظہار کیا حتیٰ کہ ترکی کی حکومت بھی احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکی جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچاری کے ساتھ ترک اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہی تھی ۔تاہم مصطفیٰ کمال پاشا کو حکومت اور عظمت بخشنے میں یہ معاہدہ کارگر ثابت ہوا، جن کی قیادت میں ترکوں نے اس معاہدے کے خلاف مزاحمت کی ۔ نام نہاد امن کے ٹھیکیدار یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے ہیں، یہ ان کی

خام خیالی تھی۔ درحقیقت ان کے ان اقدامات نے نفرت کی جنگاریوں کو شعلہ بنا دیا تھا۔ جس کے نتائج معاہدے کے چند ماہ بعد ہی ترک یونان جنگ کی شکل میں ظاہر ہوئے اور اس جنگ میں ترکوں نے روائتی انداز میں مقابلہ کرتے ہوئے یونانیوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

معاہدہ لوزین (ترکی و یونان 1923ء)

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی و یونان جنگ میں جب یونانی ترکوں کے مقابلے میں پسپا ہونے لگے تو قوی اندیشہ پیدا ہوا کہ برطانیہ بھی اس جنگ میں کود پڑے گا لیکن برطانوی عوام اس جنگ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مقدمہ کراچی (1921ء) کے بعد ہندوستانیوں نے بھی برطانیہ سے صاف کہہ دیا کہ اب ہم جنگ عظیم کی طرح اس جنگ میں ترکوں سے نہیں لڑیں گے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر لائیڈ جارج نے برطانوی نوآبادیات سے اپیل کی کہ وہ یونانیوں کی مدد اور حمایت کریں مگر کہیں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ چنانچہ بالکل مایوس ہو کر انگریزوں نے 21 نومبر 1922ء سے لوزین میں امن مذاکرات کی کانفرنسوں کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں 24 جولائی 1923ء کو معاہدہ لوزین ہوا۔

معاہدہ لوزین کے فریقین میں ایک جانب ترکی اور دوسری جانب یونان، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان، رومانیہ اور ریاست سرب، کروٹ سلووین شامل تھیں۔ ترکی کی جانب سے وزیر خارجہ عصمت پاشا نے مذاکرات میں شرکت کی۔ کل پانچ حصوں پر مشتمل 145 دفعات نوے فیصد جانب داری کی غمازی کر رہی تھیں۔ معاہدے کی رو سے میسوپوٹیمیا اور فلسطین مکمل طور پر برطانوی انقلاب میں دے دیئے گئے۔ شام کو ترکی سے آزاد کر کے فرانس کی عارضی تحویل میں دے دیا گیا۔ بقیہ تمام عرب علاقوں کو خود مختاری دے دی گئی۔ یورپ میں ترکی کے تمام مقبوضات ماسوائے تھریس اس سے واپس لے لئے گئے۔ بحیرہ ایجین کے جزائر یونان کو مکمل طور پر دے دیئے گئے۔ لیبیا مصر اور سوڈان کی سیاست سے ترکی دست بردار ہو گیا۔ قبرص کا علاقہ برطانیہ کو مل گیا۔ درہ دانیال بحیرہ مارمورہ اور باسفورس تمام اقوام کے لئے کھول دیئے گئے۔ (واضح رہے کہ

یونان کے حوالے سے ترکی کی یہ دوسری فتح تھی اس سے قبل ترکی ''تیس روزہ جنگ'' میں بھی فاتح تھا لیکن دونوں جنگوں کے بعد حالات کی ستم ظریفی تھی کہ فاتح (ترکی) کو بین الاقوامی دباؤ کے تحت گھٹنے ٹیکنے پڑے)

ان تمام شرائط کے باوجود ویسٹرن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ ڈبلیو زگلر اپنی مشہور زمانہ کتاب ''جنگ امن اور بین الاقوامی تعلقات'' میں رقم طراز ہیں کہ اس معاہدے میں ترکی کے ساتھ سخت پالیسی نہیں اپنائی گئی تھی۔ یعنی یہ معاہدہ ڈنڈے کے زور پر نہیں ہوا۔

درحقیقت امن بحال کرنے کے ان تمام عہد ناموں میں ہارنے والوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ ان کی تباہ شدہ جائیدادیں آپس میں تقسیم کر لی گئی تھیں اور ان کی عزت نفس کو اس قدر مجروح کیا گیا بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ مظالم کا جواب اپنی قوم پرستی اور اپنے حصے بخرے دوبارہ متحد کرنے کی صورت میں دیں، جرمنی نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔ وقت اور حالات نے ثابت کر دیا کہ جس بات کا اتحادیوں کو ڈر تھا اور جسے روکنے کے لئے انہوں نے سزا (جبری معاہدات) اور جزا (مراعات) کے طریقہ کار اختیار کئے، وہ ہو کر رہی۔ یعنی جرمنی کا دوبارہ طاقت ور ہونا اور دوسری جنگ عظیم جس نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ہونے والے معاہدوں پر پانی پھیر دیا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والی امن کوششیں یا امن کی اندھی دیوی (مجلس اقوام) دھڑام سے زمین پر گر گئی اور اپنی موت آپ مر گئی۔ ایک مرتبہ پھر چشم فلک نے اتحادی اور محوری طاقتوں کے درمیان طاقت کے استعمال کے مظاہرے دیکھے۔

------✡------

لیگ آف نیشن کا قیام

ریاستوں کے مابین تعلقات کا سلسلہ اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا جب ریاستوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ لیکن قدیم دور میں کسی بین الاقوامی تنظیم کے متعلق کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ اٹھارھویں صدی میں روسو نے امن قائم کرنے کے لئے یورپ کے وفاق کی تجویز پیش کی تھی جس کے بعد عملی طور پر امن قائم کرنے کے معاہدے وجود میں آئے تھے اور ان معاہدات نے بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کیا اور ریاستوں کے درمیان ثالثی کے طریقہ کار نے کافی اہمیت حاصل کر لی۔

بین الاقوامی تنظیموں کی بنیادوں کو استوار کرنے میں **1899**ء اور **1907**ء کی ہیگ کانفرنسوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ انہیں کانفرنسوں کا نتیجہ تھا کہ ہیگ میں بین الاقوامی عدالتی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کی کوششوں سے بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے میں پیش رفت کی گئی لیکن یہ کوششیں ناکافی ثابت ہوئیں اور **1914**ء میں پہلی عالمی جنگ کو شروع ہونے سے کوئی نہ روک سکا۔ جنگ کے خاتمہ پر **1919**ء کے معاہدہ ورسلز کے ذریعے جو مجلس اقوام وجود میں آئی وہ دراصل صحیح معنوں میں بین الاقوامی تنظیم کہلانے کی اہل تھی جس نے امن برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

پہلی جنگ عظیم میں قوموں کی تباہی و بربادی کے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے جس سے انسانیت تلملا کر رہ گئی اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ فاتح اور مفتوح دونوں کی خواہش تھی کہ بین الاقوامی سطح پر امن کی ٹھوس بنیادوں کو استوار کیا جائے اور ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جس سے بین الاقوامی برادری کے درمیان موجود تنازعات کو مذاکرات اور ثالثی کے ذریعے حل کرنے کے علاوہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی ہولناکیوں سے بچایا جائے۔ چنانچہ امریکی صدر وڈرو ولسن نے اس مقصد کے لئے

چودہ نکات پیش کئے اور 1919ء میں معاہدہ ورسلز کے تحت بین الاقوامی امن کو قائم رکھنے کی خاطر ''لیگ آف نیشن'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس مقصد کے لئے چار امور پر اتفاق کیا گیا:

(1) اعلیٰ متعاہدین بین الاقوامی تعاون واتحاد کوعمل کی ترقی اور بین الاقوامی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے جنگ کا ذریعہ اختیار نہ کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

(2) اقوام کے درمیان کھلے منصفانہ اور باعزت تعلقات کے اصول کوقبول کرتے ہیں۔

(3) ملکوں کے درمیان بین الاقوامی قانون کو امن کی مضبوط بنیاد اور حقیقی ضابطے کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔

(4) انصاف کے قیام اور منظم اقوام کے درمیان تعلقات اور برتاؤ میں تمام معاہداتی اصولوں کی سختی سے پابندی قبول کرتے ہیں۔

(5) اعلیٰ متعاہدین مجلس اقوام کے معاہدے سے متفق ہیں۔

لیگ آف نیشن کی دستاویز پر ابتدائی طور پر 34 ممالک نے رکن کی حیثیت سے دستخط کئے جن میں دوسری بڑی طاقتوں کے علاوہ ہندوستان بھی شامل تھا۔اس کے بعد دوسرے مرحلے میں 18 مزید ممالک کو دعوت دی گئی اور وہ اس معاہدے میں شریک ہو گئے۔21 فروری 1939ء تک لیگ آف نیشن کے ممبران کی تعداد 54 ہو چکی تھی تاہم پیرو گوئے نے 24 فروری 1935ء کو اس سے علیحدگی کا نوٹس دے دیا اور فروری 1937ء میں اس سے علیحدہ ہو گیا۔اس کے بعد 3 جون 1937ء کو سالویڈرے نے لیگ کو اپنی علیحدگی کے ارادے سے آگاہ کر دیا، 11 ستمبر 1937ء کو اٹلی نے بھی لیگ سے علیحدگی کے بارے میں نوٹس بھیج دیا پھر 12 جولائی 1938ء کو وینزویلا نے بھی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

لیگ آف نیشن اگر چہ ناکام ہو گئی لیکن اس کے باوجود بھی اس کے کارناموں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلی بین الاقوامی تنظیم لیگ آف نیشن تھی،اس سے پہلے بین الاقوامی سطح پر تنظیم سازی کا کوئی تصور نہیں تھا۔لیگ آف

نیشن کے ذیلی اداروں کی طرز پر ہی اقوام متحدہ نے اپنے اداروں کو تشکیل دیا اور نئے سرے سے منظم کیا۔ لیگ آف نیشن نے چھوٹی اقوام کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے بین الاقوامی سیاست میں اہم کردار ادا کریں۔

لیگ آف نیشن کی اسمبلی ،کونسل اور سیکرٹریٹ نے انسانیت کی بھلائی کے لئے عظیم کارنامے سرانجام دیئے اور دنیا کے ہر حصے میں ذرائع نقل وحمل کو ترقی دی اور متاثرہ علاقوں میں فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیا۔اپنے قیام کے پہلے دس سالوں میں لیگ آف نیشن نے بہت کارکردگی دکھائی اور دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ لیگ آف نیشن نے امن عالم کے لئے قابل قدر کارناموں کو انجام دیا۔جو ریاستیں مجلس اقوام میں شامل ہونا چاہتی تھیں اس کو رکنیت دے دی جاتی ۔مجلس اقوام نے اپنے قیام سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک جو کارنامے انجام دیئے ان میں آسٹریلیا کو دیوالیہ ہونے سے بچانا، **1924**ء میں اٹلی کے آمر مسولینی نے یونان کے جزیرہ پر قبضہ کرلیا اور لیگ آف نیشن کی کوششوں سے اٹلی وہاں سے فوجیں ہٹانے پر رضامند ہوا،لیگ آف نیشن نے تخفیف اسلحہ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔لیگ آف نیشن کا مقصد یہ تھا کہ عالمی سطح پر یہ کوشش کی جائے کہ دنیا کے تمام ممالک اسلحہ اکٹھا کرنے سے باز آجائیں تاکہ آئندہ عالمی سطح پر ہونے والی جنگ کو روکا جاسکے۔

بڑی بڑی طاقتوں نے باہمی سلامتی کی خاطر **1925**ء میں اس تحریک کی حمایت کی اور باہمی اتفاق رائے سے تخفیف اسلحہ کے معاہدات پر دستخط کئے جن میں معاہدہ لوکارنو بھی شامل ہے۔معاہدہ ورسلز کی رو سے جرمنی بالائی سایلیشیا کے علاقے میں استصواب رائے کے ذریعہ یہ طے کرتا تھا کہ اس علاقے کو کس ریاست کا حصہ ہونا چاہئے۔استصواب رائے کے نتیجہ میں لوگوں نے جرمنی کو ترجیح دی لیکن اس کی سرحد کی بابت کوئی معاہدہ طے نہ پاسکا سفیروں کی کانفرنس نے اس معاملہ کو حل کرنے کے لئے کونسل سے رجوع کیا۔لیگ آف نیشن کی کونسل نے غیر جانب دار ممالک کی ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ اس معاملے کی چھان بین کرے چنانچہ تحقیق کے بعد اس علاقے کی حد مقرر کردی گئی جسے فریقین نے تسلیم کرلیا۔

جب برطانیہ کا موصل کے علاقے میں ترکی سے تنازعہ ہو گیا تو برطانیہ نے اس مسئلہ کے حل کے لئے کونسل سے اپیل کی ۔کونسل نے بین الاقوامی عدالت سے مشاورتی رائے طلب کی جس نے بتایا کہ کونسل کو اختیار سماعت حاصل ہے،کونسل نے فریقین کے مابین سمجھوتہ کرا دیا۔دونوں فریقین نے کونسل کی تجاویز کو مان لیا اور ایک معاہدے کی رو سے دونوں فریق 1926ء میں ایک سرحدی خط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

شاہ الیگزینڈر کے قتل کے بعد یوگوسلاویہ بحران سے دوچار ہو گیا جسے بحران سے نکالنے میں لیگ آف نیشن کا کردار ناقابل فراموش ہے۔اسی طرح اٹلی اور ایتھوپیا، یونان اور بلغاریہ کے تنازعات کو بھی لیگ آف نیشن نے حل کیا۔

مجلس اقوام نے انتدابی علاقوں کی ذمہ داری بھی قبول کی اور مفتوحہ علاقوں کو لیگ آف نیشن کی زیرنگرانی دے دیا گیا تھا اس کا انتظام سنبھالنے کے لئے چند طاقتوں کو متعین کر دیا گیا ،انتدابی علاقہ کو ایک مقدس امانت قرار دیا گیا۔انتدابی علاقہ کا الحاق لیگ آف نیشن کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان علاقوں کو کسی بڑی طاقت کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔

بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے اتحادی اور فاتح طاقتوں نے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی ۔لیگ آف نیشن کا کام یہ تھا کہ وہ انتدابی طاقتوں اور انتدابی علاقوں کے درمیان طے پائے گئے معاہدوں پر عمل درآمد کی نگرانی کرے، یہ نگرانی ایک انتدابی کمشن کے سپرد ہوتی تھی۔انتدابی کمشن کی ذمہ داری تھی کہ وہ مقامی آبادی کے مفادات کا تحفظ کرے ،سیاسی و اخلاقی تعلیم کے علاوہ رہنے سہنے کے حالات کو بہتر بنائے۔معاشی معاملات میں تفریق کرنے اور علاقہ کی قانونی حیثیت ،سلمیت اور انفرادیت کو قائم رکھے اس کے علاوہ لیگ آف نیشن نے بہت سی خدمات انجام دیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کے مسائل کو احسن طریقے سے حل کیا ،ملیریا کی روک تھام کے لئے ہنگامی بنیادوں پر کام کیا عورتوں اور بچوں کی تجارت کے کاروبار کو ختم کیا بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک انجمن بنائی، دنیا کی قوموں کے درمیان تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لئے ایک مستقل کمیٹی قائم کی جس کا

مقصد دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان تہذیب وثقافت کو متعارف کرانا تھا، مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے کام کئے۔ یہ تمام کارنامے سرانجام دینے کے باوجود لیگ آف نیشن بری طرح ناکام ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کا ایک بڑا مقصد دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے اقوام کے درمیان باہمی رابطے کو مضبوط کرنا تھا، لیکن مجلس اقوام میں تمام قوموں نے شمولیت اختیار نہ کی اور نہ ہی اس کی رکنیت حاصل کی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ممکن تھا کہ لیگ آف نیشن اور زیادہ مضبوط ہوتی اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتی۔

اس تنظیم کی ابتداء معاہدہ ورسلز سے ہوئی اور اس کے پس منظر میں امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات تھے لیکن امریکہ لیگ آف نیشن کا رکن نہ بنا کیوں کہ امریکی سینٹ نے لیگ آف نیشن کی توثیق نہیں کی تھی۔ جرمنی بھی 1925ء تک اس بین الاقوامی تنظیم میں شامل نہیں ہوا تھا، 1934ء میں روس نے اس کی رکنیت حاصل کی۔ لیگ آف نیشن میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا تھا کہ اجتماعی تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی سطح پر امن کو قائم رکھا جائے لیکن اس اصول پر کبھی بھی عملدرآمد نہ کیا جا سکا۔

بعض ممالک نے اپنے اپنے مفادات کے تحت لیگ آف نیشن کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کرنا شروع کر دی مثلاً جب جاپان نے منچوریا پر قبضہ کر لیا تو اس نے لیگ آف نیشن کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جب اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا تو اس نے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ دو بڑے ملک تھے جن کی علیحدگی نے لیگ آف نیشن کو کمزور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہٹلر اور مسولینی کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور ان کی جنگی تیاریوں اور جارحیت کے ارتکاب نے دنیا کو دوسری عالمی جنگ میں دھکیل دیا۔ کونسل کے سامنے تصفیہ کے لئے جو جھگڑے پیش کئے جاتے ان کو حل کرنے کے لئے کونسل کے ممبران کا اتفاق رائے ضروری تھا جس سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے اگرچہ اس میں بعض تبدیلیاں بھی کی گئیں لیکن وہ کارگر ثابت نہ ہو سکیں۔

لیگ آف نیشن کے قیام میں لیگ آف نیشن کو بنیادی حیثیت حاصل تھی بہت سی ریاستوں نے اس معاہدے کی توثیق اس لئے نہیں کی کہ معاہدے کو ممبر ممالک اپنے اپنے

مفاد کے لئے استعمال کرتے تھے ان ریاستوں کے نزدیک یہ معاہدہ انتقام پر مبنی تھا۔ الغرض اسے رضا کارانہ طور پر قبول نہیں کیا گیا بلکہ زبردستی ریاستوں پر ٹھونسا گیا تھا۔ چھوٹی اقوام اس سے یہی تاثر لیتی تھیں کہ یہ فاتح قوموں کا ادارہ ہے اور اس پر فرانس اور برطانیہ کی اجارہ داری ہے۔ چھوٹی اقوام عدم تحفظ کا شکار ہو گئیں اور اس محرومیت کے احساس کیوجہ سے بعض اقوام کا اس ادارے پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ لیکن اگر یہی معاہدہ حق و انصاف اور امن و سلامتی کے اصولوں پر قائم کیا جاتا تو اس کے مثبت نتائج نکلتے۔ لیکن لیگ آف نیشن کی ناکامی کے سبب دنیا ایک مرتبہ پھر جنگ کی ہولنا کیوں کی لپیٹ میں آ گئی اور کروڑوں انسان صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے معاہدے

دوسری جنگ عظیم کی تمام تر ذمہ داری ایڈولف ہٹلر اور نازی جرمنی پر عائد کی جاتی ہے۔ ہٹلر نے مسلسل جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھ کر عالمی اشتعال کو ہوا دی۔ دوران جنگ جو خفیہ رپورٹیں ہاتھ لگیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ پہلے یورپ کو مسخر کرنا چاہتا تھا پھر پوری دنیا پر نظم وضبط قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے دل ودماغ پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ جرمن نسل سب سے اعلیٰ ہے اور اس کے لئے عالم انسانیت کی حکمرانی مقدر ہے۔ حالانکہ ایک موقع پر ہٹلر نے یہ بھی کہا تھا کہ ''میں پاگل نہیں ہوں کہ جنگ کی خواہش کروں، جرمن قوم کی صرف ایک خواہش ہے کہ وہ اپنے طریقے سے خوش خوش زندگی گزارے اور امن سے رہے۔''

1943ء سے **1945**ء تک ہٹلر تاریخ عالم کی مرکزی شخصیت تھا۔ اس نے ذاتی مطالعے سے علم حاصل کیا اور غذا سے سیاسیات عالم، موسیقی سے فوجی چالوں تک ہر چیز پر بحث کرتا تھا۔ اسے عوام کی نفسیات سے حیرت انگیز حد تک آگاہی حاصل تھی۔ ہٹلر نے برسر اقتدار آتے ہی مطلق العنان حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ تمام مخالف سیاسی پارٹیاں تباہ کر دیں۔ ٹریڈ یونینیں منسوخ ہوگئیں۔ ان کی املاک اور سرمائے ضبط کر لئے گئے۔ تمام انفرادی حقوق ختم ہو گئے۔ قومی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اتحاد قائم کر دیا گیا، ان میں کلیسا، مطابع، تعلیم اور فوج بھی شامل تھے۔

5 نومبر **1937**ء کو ایک خفیہ اجلاس میں ہٹلر نے اپنے فوجی لیڈروں کے روبرو دوسرے ملکوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کا عملی خاکہ پیش کیا۔ فیوہرر نے بیان کیا کہ:

☆ جرمن پالیسی کا مدعا یہ ہے کہ قوم کے تحفظ و فروغ کا انتظام کیا جائے۔ اس

انتظام کے لئے علاقوں کی ضرورت ہے۔ جرمنی کے لئے سوال یہ ہے کہ کم سے کم نقصان اٹھا کر کسی حصے میں زیادہ سے زیادہ علاقہ کس طرح فتح کیا جا سکتا ہے۔

☆ جرمن سیاستدانوں کو دو قابل نفرت دشمنوں سے سابقہ پڑے گا، ایک انگلستان اور دوسرا فرانس۔ یہ دونوں یورپ کے قلب میں طاقت ور جرمن مملکت برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جرمنی کی مزید تقویت کی مخالفت کریں گے۔ یورپ میں بھی اور سمندر پار بھی۔ اس مخالفت میں تمام فریق ان کے معاون ہوں گے۔

☆ جنگی سیاسی حیثیت بہتر بنانے کے لئے ہمارا پہلا مقصد یہ ہوگا کہ جنگ شروع ہو جانے پر چیکوسلواکیہ اور آسٹریا کو بیک وقت فتح کر لیں۔ اس طرح بازوؤں کی طرف سے حملے کا خطرہ ختم ہو جائے گا اور ہم مغربی جانب بڑھ سکیں گے۔ چیکوسلواکیہ کی تسخیر کے بعد ہماری اور ہنگری کی سرحد مل جائے گی۔ جرمنی اور فرانس کی کشمکش میں پولینڈ کی غیر جانبداری پر زیادہ آسانی سے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ پولینڈ سے ہمارا معاہدہ اس وقت تک پکا ہے جب تک جرمنی کی قوت ناقابل تزلزل نہ ہو جائے۔

☆ غالباً برطانیہ اور فرانس چپکے چپکے چیکوسلواکیہ سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ فرانس بھی برطانیہ کی امداد کے بغیر ہالینڈ اور بیلجیم سے گزرتا ہوا آگے نہیں بڑھ سکتا۔ طبعاً ہمیں ہر حال میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کر لینا چاہیے۔ اسی صورت میں ہم چیکوسلواکیہ اور آسٹریا پر حملہ کر سکتے ہیں۔

☆ روس کی فوجی تیاریوں کے مقابلے میں ہماری جنگی کاروائیاں بہت تیز ہوں گی۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جسے جاپان کی روش کے پیش نظر زیر غور لانا ضروری بھی سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

14 مارچ 1938ء کو ہٹلر آسٹریا میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے استقبال کے لئے موجود تھے جو جرمن کے ساتھ الحاق کے حق

میں نعرے لگا رہے تھے۔ چیکوسلواکیہ کے خلاف اقدام میں فیوہرر نے وقت کا صحیح اندازہ لگالیا تھا اس نے کامیاب جوابی اقدامات کے لئے مخالفوں کو کم سے کم موقع دیا تھا۔

فروری 1938ء میں ہٹلر نے ریشتاغ میں ایک تقریر کی جس میں اپنے چیکوسلواکی بھائیوں کے ہولناک حالات بڑے درد انگیز انداز میں پیش کئے۔ ہٹلر نے دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ غریب سوڈیٹن جرمن چیکوں کے مظالم کے ہاتھوں جرمنی کی حفاظت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ جرمنی کے اخباروں نے جرمن اقلیتوں پر چیکوں کے مظالم کی مذمت زور شور سے شروع کر دی۔

13 ستمبر 1938ء کو ہٹلر نے ایک نہایت پر زور تقریر کی جس میں اعلان کر دیا کہ وہ مظلوم سٹوڈیٹن جرمنوں کی امداد کے لئے فوراً روانہ ہونا چاہتا ہے۔ برطانیہ اور فرانس کے فائدے کے لئے اعلان کر دیا کہ جرمنی کی مغربی سرحدوں پر ایسے دفاعی استحکامات تیزی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچائے جا رہے ہیں جنہیں توڑا نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جس کے بعد چیکوسلواکیہ کے صدر بینش نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ جب صورت حال نازک ہوگئی تو چیمبرلین بھی دوسرے ایکٹروں میں شامل ہوگیا۔ وہ فوراً برخس گارڈن پہنچا ہٹلر نے چیمبرلین کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ سٹوڈیٹن علاقہ فوراً جرمنی میں شامل کر دیا جائے ورنہ جنگ ہو جائے گی۔ وہ چیمبرلین کو صرف اتنی مہلت دینے پر آمادہ ہوا کہ وہ اپنے رفیقوں سے مشورہ کر لے۔ چنانچہ چیمبرلین لندن پہنچا اور اس نے اپنے رفیقوں کے ساتھ مشورے کئے جن میں فرانس کا وزیراعظم دلادیہ اور وزیر خارجہ بونے بھی شامل تھے۔

20 ستمبر 1938ء کو برطانیہ اور فرانس نے حکومت پراگ (مرکز چیکوسلواکیہ) سے مشورہ کئے بغیر چیکوسلواکیہ کو اطلاع دے دی کہ تمام ضلعے ہٹلر کے حوالے کر دینے چاہئیں، جن میں زیادہ تر سوڈیٹن جرمن آباد ہیں۔ اگر چیکوسلواکیہ اس پر راضی ہو جائے تو آئندہ کے لئے اس کی سلامتی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چیکوسلواکیہ کی وزارت نے سر تسلیم خم کر دیا اور مستعفی ہوگئی۔ چیمبرلین ہوائی جہاز کے ذریعے ایک مرتبہ پھر جرمنی پہنچا تاکہ ہٹلر کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے علاوہ دیگر

تفصیلات بھی مرتب کر لی جائیں۔چیمبرلین گاڈز برگ پہنچا تو ہٹلر کا غیض وغضب انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔اب اس نے مزید مطالبے پیش کر دیئے جو پہلے سے بھی زیادہ سخت تھے۔ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی دی کہ اگر چیکو نے یکم اکتوبر تک یہ مطالبے تسلیم نہ کئے تو فوجوں کو کوچ کا حکم دے دوں گا۔

چیمبرلین اس درجہ حیرت زدہ رہ گیا کہ منہ سے بات تک نہیں نکلتی تھی ہٹلر نے ایک نقشہ اس کے حوالے کیا جس میں نشان دہی کی گئی تھی کہ کون کون سے علاقے فی الفور واپس لئے جائیں گے۔چیمبرلین نے یہ نقشہ لے لیا اور وعدہ کیا کہ اپنی سفارشات کے بغیر اسے چکوں کے سامنے پیش کر دے گا۔چیکو نے جب یہ صورت حال دیکھی تو غصے میں آ کر گاڈز برگ کا الٹی میٹم ٹھکرا دیا۔اس مرحلے پر مسولینی بھی اس اہم ڈرامے کا کردار بن گیا۔اس نے تجویز پیش کی کہ چار طاقتوں کے نمائندے باہم مل کر تعطل پر بحث کر لیں۔مسولینی کی یہ تجویز چیمبرلین کو تنکے کا سہارا معلوم ہوئی۔

چنانچہ 26 ستمبر 1938ء کو میونخ میں مقررہ کانفرنس سے تین دن پہلے ہٹلر نے برلن میں ایک تقریر کرتے ہوئے دنیا کو یقین دلایا کہ اگر سٹوڈیٹن کا مسئلہ حل کر دیا گیا تو جرمنی یورپ کے اندر کوئی اور علاقائی دعویٰ نہیں کرے گا۔یہ آخری علاقائی مطالبہ ہے جو میں یورپ سے کر رہا ہوں۔1919ء میں حواس باختہ مدبروں نے پینتیس لاکھ جرمن اپنے ہموطنوں سے کاٹ کر الگ پھینک دیئے تھے۔چیک مملکت ایک بہت بڑے جھوٹ کی بدولت وجود میں آئی تھی اور جھوٹ بولنے والے کا نام بینش تھا۔عین اس موقع پر چیکوسلواکیہ کے صدر کا نام زبان پر آیا تو ہٹلر کی کرختگی آخری حد کو چھونے لگی۔حاضرین نے انتہائی زور و شور سے ''زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔

چیمبرلین نے میونخ کی دعوت قبول کر لی اور تیسری مرتبہ جرمنی گیا اور طے ہوا کہ جرمن فوج یکم اکتوبر 1938ء کو چیکوسلواکیہ میں داخل ہو جائے گی۔ایک بین الاقوامی کمشن قائم کیا جائے جو ان تمام علاقوں میں استصواب رائے عامہ کی نگرانی کرے۔چار طاقتیں جرمنی،اٹلی،فرانس اور برطانیہ چیکوسلواکیہ کی سرحدات کی ضمانت دیں۔چیکوں سے کہا گیا کہ ہٹلر جن علاقوں کا الحاق کرے گا ان میں پورا سامان

خصوصاً اسلحہ چھوڑ دیئے جائیں۔اس کے ساتھ ہی برطانیہ اور جرمنی نے دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔

اس طرح چیکوسلواکیہ ان طاقتوں کے ہاتھوں فروخت ہو گیا جو اس کی تخلیق کی ذمہ دار تھیں۔چیمبرلین یہ معاہدہ کر کے اپنے وطن واپس پہنچا تو اس کا پر جوش استقبال کیا گیا۔اس نے کہا کہ: میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم ہماری زندگی میں امن قائم رہے گا۔لیکن ہٹلر کے نزدیک چیکوں کے کسی وعدے کو کوئی قیمت نہیں تھی اس نے چیکوسلواکیہ کے ایک تہائی رقبہ اور آبادی پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی نئے مطالبات بھی پیش کر دیئے۔پہلا یہ کہ چیک پورے ملک میں اسے ایک فوجی شاہراہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دیں۔ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ سلواکیہ اور روتھیبیا کے فیصلے کا حق مجھے دے دیا جائے اس طرح وہ خود ثالث بن گیا کہ فیصلہ کرے کہ پولینڈ اور ہنگری کو کتنا علاقہ دے دینا چاہئے۔

ای مل ہاہا جو سلواکیہ کا صدر تھا نے احتجاج کیا تو اسے برلن بلا لیا گیا اور ہٹلر نے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ 15 مارچ 1939ء کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور نہ ہو گیا۔جس کے مطابق چیکوسلواکیہ جرمنوں کے زیر نگرانی ایک ریاست بن گیا ہٹلر نے اعلان کر دیا کہ میں بوہیمیا اور موریویا کا محافظ ہوں،سلواکیہ کی حفاظت کا بھی ذمہ اٹھاتا ہوں۔اسکے ساتھ ہی جرمن فوج پراگ میں داخل ہو گئی،سلواکیہ کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔

اس طرح چار آدمیوں نے چار گھنٹے کے اندر یورپ کا امن درہم برہم کر دیا۔ابتدائی رد عمل یہ تھا کہ دنیا بھر نے اس پر اطمینان کا سانس لیا کہ اب دنیا سے جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں۔لیکن یہ محض خام خیالی تھی،چیمبرلین کی ڈرپوکی،بے ہمتی اور نااہلی نے دنیا کو ایک بڑے عالمی بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔دنیا پر جلد ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر ہٹلر کو روکا نہ گیا تو فرانس اور برطانیہ سمیت پورا مشرقی یورپ اپنے انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

ہٹلر فتوحات کا راستہ اختیار کر چکا تھا اور چیمبرلین یورپی ممالک کے اتحاد کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تا کہ نازی فیوہرر کو مشرق ومغرب دونوں جانب پیش قدمی سے

روکے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سر پر منڈلاتی ہوئی اس آفت کو ٹالنے کے لئے کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ ہٹلر کو اطمینان تھا کہ برطانیہ اور فرانس کی زوال پذیر جمہوریتیں کبھی جنگ نہیں کریں گی۔ اگلا قدم وارسا پر پڑنا چاہیے پھر دنیا پاؤں تلے آجائے گی۔

1939ء میں ایک اور اہم واقع ہوا جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ 23 اگست کو ہٹلر اور روس کے سٹالن کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے میں شرائط اس طرح تھیں:

(1) روس اور جرمنی ایک دوسرے کے خلاف جنگی کاروائی نہیں کریں گے اور اگر ان دونوں پر کسی تیسرے فریق نے حملہ کیا تو اسے کسی قسم کی امداد نہیں دیں گے۔

(2) مشترکہ مفادات کے تمام مسائل پر آپس میں صلاح مشورہ کیا جائے گا۔

(3) ایک دوسرے کے خلاف دیگر طاقتوں کی گروہ بندی میں شرکت نہیں کریں گے۔

ایک خفیہ تحریر بھی اس معاہدے میں شامل تھی جو 1948ء میں منظر عام پر آئی وہ یہ تھی کہ مشرقی یورپ کو جرمن اور روسی حلقوں میں تقسیم کرلیا گیا تھا اور دونوں فریقوں نے علاقے کی تقسیم بھی طے کرلی تھی۔ یہ وہ معاہدہ تھا جس نے ہٹلر کے لئے جنگ کا آغاز ممکن بنا دیا تھا۔ ان دونوں فریقوں نے معاہدہ تو کرلیا تھا لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے تھے ان کا مدعا یہ تھا کہ جب تک خاص فائدہ پہنچتا رہے اس وقت تک اس معاہدے کو قائم رکھا جائے اور دوسری صورت میں اپنے مفاد کے لئے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا موقع بھی ضائع نہ کیا جائے۔

اس سے ہٹلر کو اتنا ضرور فائدہ پہنچا کہ اسے فوری تشویش سے نجات مل گئی، کیوں کہ پولینڈ کی امداد کے لئے برطانیہ اور فرانس کی طرف سے جنگ کی صورت میں مشرقی محاذ فی الحال محفوظ ہو گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہٹلر بالشوازم کا خطرہ فراموش کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپی جمہوریتوں کو کچلنے کے بعد وہ بالشوکوں سے بھی با آسانی نپٹ سکتا ہے۔

اسی طرح سٹالن کو بھی اس معاہدے میں کچھ فائدے نظر آتے تھے۔ سٹالن کو خاص طور پر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں برطانیہ فرانس اور جرمنی متحد ہو کر سوویت روس پر

حملہ نہ کر دیں۔ جرمنی کی طرف سے پولینڈ کی آزادی کی حفاظت کے لئے برطانیہ اور فرانس نے جنگ کا معاہدہ کر لیا تھا جس سے سٹالن کو یہ موقع مل گیا کہ وہ جرمنی اور اتحادیوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لے۔ سٹالن نے اتحادیوں اور جرمنی کے ساتھ آنکھ مچولی کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اتحادی قوتوں نے اس کی اغراض پوری نہ کیں تو وہ جرمنی سے استفادہ کر لے گا لیکن لندن اور پیرس کو یہ موقع نہیں دے گا کہ وہ فاشسٹ توسیع کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیں۔ یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ہٹلر اور سٹالن دونوں معاہدہ کرنے کو تیار تھے اور انہوں نے معاہدہ کر لیا۔

یکم ستمبر 1939ء کو دس لاکھ پچیس ہزار فوج پر مشتمل جرمن قوت کی ناقابل تسخیر طوفانی موجیں پولینڈ کی مغربی سرحدوں کو روندتی ہوئی پولینڈ میں داخل ہوئیں اور مشرقی پروشیا، پومی رینیا، سیلیشیا اور سلوا کیا سے بیک وقت برق رفتاری سے پیشقدمی کرتی ہوئی وارسا کی طرف بڑھیں۔ یہ دنیا میں برق رفتار جنگ کا پہلا مظاہرہ تھا۔ برق رفتاری کے ساتھ فتح حاصل کرنے کے نئے جرمن نظریئے نے ماہرین حرب کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

17 ستمبر 1939ء کو پولستانیوں کے لئے مزید بری خبریں آئیں۔ سٹالن اور ہٹلر نے ضرورت اور سہولت کے پیش نظر آپس میں اتحاد کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ماسکو میں جو میثاق ہوا تھا اس کی خفیہ شرطوں پر عمل شروع ہو گیا یعنی مغربی جانب سے روسی فوجیں بلا انتباہ پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ اسٹالن نے اس کا استدلال یہ پیش کیا کہ ہم آزادی دلانے والوں کی حیثیت سے آ رہے ہیں تاکہ یوکرینی اور سفید روسی اقلیتوں کی حفاظت کا فرض انجام دیں۔ کیمونسٹ فوجوں نے باقاعدہ پولینڈ کے مشرقی صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ہٹلر کو یہ اندازہ نہ تھا کہ روسی اتنی سرعت کے ساتھ اندر گھس آئیں گے۔ روسی ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھے کہ ہٹلر نہ صرف گلیشیا سے محروم ہوا، جہاں تیل کے بیش بہا چشمے تھے بلکہ رومانیہ کے تیل تک پہنچنے کے سیدھے راستے کا دروازہ بھی اس کے لئے بند ہو گیا۔

پولینڈ کی تقسیم کے بعد واقعات بڑی تیزی کے ساتھ بدلنے لگے ہٹلر اور سٹالن نے سیاسیات اقتدار کی بساط پر نئی چالیں شروع کیں۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف

جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر چکے تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں تھا۔ دونوں نے اپنا اپنا راستہ اختیار کر لیا لیکن دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی حرکات کی کڑی نگرانی کر رہی تھیں۔ نازیوں کی برق رفتار فتوحات نے سٹالن کو پریشان کر دیا تھا، اسے نازیوں سے ایسی توقع نہ تھی۔ یہ بھی امکان تھا کہ جرمن پلٹ کر اسی پر حملہ آور ہو جائیں سٹالن کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ حریف سے پہلے نقل و حرکت کی مختلف تجاویز سوچ لے اور اپنی شمالی سرحد کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنائے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت بحیرہ بالٹک کی ریاستوں کو حاصل تھی۔

23 اگست 1939ء کے معاہدے میں روس نے خفیہ طور پر ایک دفعہ شامل کروائی تھی کہ ریاست ہائے بالٹک سوویت روس کا حلقہ اثر قرار پائے گی۔ بالٹک ریاستیں چار تھیں۔ ایسٹونیا، لٹویا، لتھوانیا اور فن لینڈ۔ سٹالن نے سابقہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایسٹونیا کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا جس کا مقصد ایسٹونیا کی سرزمین پر روس کو فوجی چھاؤنیاں اور بحری اور ہوائی مراکز قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ تھوڑی ہی مدت میں اسی قسم کے معاہدے لٹویا اور لتھوانیا کے ساتھ بھی ہو گئے۔ لتھوانیا کو اس کے بدلے میں ولنا اور آس پاس کا علاقہ دے دیا گیا۔

اب مسئلہ تھا فن لینڈ کا۔ فن لینڈ ریاست ہائے بالٹک میں سب سے شمالی ریاست تھی، سوویت یونین کے لئے اس کی جنگی اہمیت بہت زیادہ تھی، اگر کوئی دشمن طاقت اس پر اپنا نظم و ضبط قائم کر لیتی تو روس کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو جاتا۔ لینن گراڈ فن لینڈ کی سرحد سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھا اور خاکنائے کریمیا پر توپیں نصب کر کے لینن گراڈ پر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔ پہلے ڈپلومیٹک دھمکیاں دی گئیں پھر گفت و شنید سے مسائل کو حل کرنے کی پیش کش کی گئی۔

روس کی خواہش تھی کہ خاکنائے کریمیا کا ایک حصہ حوالے کر دیا جائے تا کہ لینن گراڈ توپوں کے خطرے سے محفوظ ہو جائے نیز انتہائے شمال میں ایک خطہ روس کے حوالے کیا جائے۔ سوویت اور فن لینڈ کی سرحد پر کوئی فوج نہ رہے اور تیس سال کے لئے فن لینڈ ہنگو بندرگاہ اجارے پر دے دے تا کہ روس وہاں اپنا بحری مرکز

بنالے۔اس کے معاوضے کے طور پر روس فن لینڈ کی وسطی سرحد کے ساتھ ساتھ دو ہزار ایک سو چونتیس مربع میل رقبہ دینے کے لئے تیار تھا۔فن لینڈ کو اپنی مشکلات کا پورا احساس تھا اس نے جواب دیا کہ ایک کے سوا تمام مطالبات مانے جا سکتے ہیں۔ حکومت فن لینڈ اپنی زمین کے کسی حصے کو کسی اجنبی طاقت کے فوجی مرکز کے لئے نہ اجارے پر دے سکتی ہے اور نہ فروخت کر سکتی ہے۔

یہ سنتے ہی روس نے فن لینڈ کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ختم کر دیا۔اس کے دو روز بعد روسی طیارے ہلسنکی (دارالحکومت فن لینڈ) اور وائی پری پر بم برسانے لگے۔فن لینڈ کے عوام نے بھی کمال جرأتمندی مظاہرہ کیا۔ایک لاکھ روسی فوج اس چھوٹے سے ملک میں گھس گئی۔مٹھی بھر مجاہدوں نے اسے شکست دی روسیوں کے کچھ ڈویژن تباہ ہو گئے اور کچھ سرحدوں سے پسپائی پر مجبور ہوئے اور وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔

دنیا کی نظریں چھوٹی سی جمہوریہ بالٹک کے ڈرامے پر جمی تھیں برطانیہ اور فرانس کی روش ایک حد تک اہم تھی کہ فروری 1940ء میں یہ دونوں ملک سوویت روس کے خلاف جنگ کے قریب پہنچ گئے تھے۔دونوں نے ایک لاکھ آدمیوں کی مہم تیار کی جو فن لینڈ کی مدد کو جانے والی تھی۔ناروے اور سویڈن کو فن لینڈ سے ہمدردی تھی لیکن انہوں نے روسی دھمکیوں سے ڈر کر اتحادی فوجوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ 11 مارچ 1940ء تک روس نے وائی پوری کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا 12 مارچ کو برطانیہ اور فرانس سویڈن اور ناروے سے فوج گزارنے کے لئے مذاکرات کرتے رہے۔عین اس وقت فن لینڈ کا ایک نمائندہ سٹالن کی شرطیں قبول کرنے کے لئے ماسکو پہنچ گیا سوویت یونین نے پہلے سے بھی سخت شرائط پر سمجھوتہ کر لیا۔جس کے تحت فن لینڈ نے سولہ ہزار مربع میل کا علاقہ اور تقریباً پانچ لاکھ آبادی روس کے حوالے کی۔

پولینڈ کی فتح نے روسی فوج اور شہری آبادی دونوں میں شادمانی کی لہریں دوڑا دیں وارسا سے جنگجو خوشی خوشی واپس آئے تا کہ فتح کے ہار وصول کر سکیں۔ان کے شہری ہم وطن جوش وخروش میں دیوانے ہو رہے تھے۔23 نومبر 1939ء کو ہٹلر نے اپنے

جرنیلوں کو اکٹھا کیا اور اعلان کیا کہ ''میرے فیصلے ناقابل تبدیل ہیں۔ میں فرانس اور انگلستان پر مناسب وقت پر حملہ کروں گا۔''

لندن نے 8 اپریل 1940ء کو ناروے لکھ بھیجا کہ ہم نے ناروے کے پانیوں میں سے ان جہازوں کا بے مزاحمت گزرنا روک دینے کا فیصلہ کیا ہے جن پر جنگ کا سامان لدا ہوتا ہے۔ یہ اطلاع بھی دے دی گئی کہ ساحل کے ساتھ ساتھ بحری سرنگیں بچھا دی گئی ہیں۔ دوسری طرف 8 اپریل ہی کو جرمنی سے گوئرنگ نے اعلان کیا کہ مغرب پر ایک فیصلہ کن ضرب لگائی جائے گی۔ 9 اپریل 1940ء کو پانچ بجے صبح جرمنی کا ایک مراسلہ ڈنمارک پہنچا جس میں بتایا گیا کہ ہمیں پختہ شہادت مل چکی ہے کہ اتحادی طاقتیں سکنڈے نیویا کو میدان جنگ بنانا چاہتی ہیں، چونکہ یہ ملک اپنی حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے ہٹلر نے ان کی حفاظت کا فیصلہ کیا ہے۔ جرمنی نے ڈنمارک کے تمام وسائل دنیا سے منقطع کر دیئے۔

مغرب کی تسخیر کے نقشے میں بنیادی حیثیت زیریں ممالک ہالینڈ، بیلجیم اور لکسمبرگ پر حملے کو حاصل تھی پھر فرانس کو پامال کرنا تھا۔ اس طرح نازیوں کو جو مراکز حاصل ہوتے وہاں سے انگلستان پر ضرب لگانا مقصود تھا۔ ہٹلر جانتا تھا کہ دفاعی خط ماجینو پر براہ راست حملہ سخت نقصان میں رہے گا لہٰذا انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی بکتر بند فوجوں کو خط ماجینو کے اطراف سے تیزی کے ساتھ گزار لے اور تین چھوٹے ملکوں میں سے بلا مزاحمت گزرتے ہوئے براہ راست پیرس کی طرف بڑھے۔

یہ دراصل 1914ء کے اس منصوبے کا اعادہ تھا جو فان شلیفن کا منصوبہ کہلاتا تھا اور جس میں بتایا گیا تھا کہ فرانس اور روس کے دو محاذوں پر جنگ کرنے کی صورت کیا ہے۔ اتحادی فوجیں مختلف قومی فوجوں کا ناآزمودہ کار مجموعہ تھیں، ان میں ربط ضبط بہت ڈھیلا تھا، مشترکہ فوجی تجربہ کچھ نہ تھا، فرانسیسی فوج کی شہرت تو بہت تھی لیکن وہ معرض انحطاط میں تھی۔ اس کے برعکس جرمن فوج پولینڈ اور سکنڈے نیویا میں شکار کا پہلا خون چکھ چکی تھی اور نہایت اعلیٰ تربیت کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط بھی کمال درجے کا تھا۔ جرمنوں نے مہم کا نقشہ روایتی صلاحیت اور ہنر مندی کے ساتھ تیار کیا تھا، اس میں

ہر پہلو پر گہری نظر رکھی گئی تھی۔

9 مئی 1940ء کی شام کو ولندیزی خبر رسانوں نے پانچ لفظوں کا ایک پیغام اپنی حکومت کو بھیجا ''صبح بوقت طلوع تیار رہو''لیکن جرمنوں کا حملہ اتنا تیز تھا کہ ولندیزیوں کی مدافعت شروع ہی سے بے حیثیت ہوگئی پھر برق رفتار جنگ شروع ہوگئی ایسی کہ پولینڈ کی ابتدائی برق رفتاری بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

18 مئی 1940ء کو فرانس کے وزیراعظم پال ریناڈ نے وزارت میں رد وبدل کیا، وزارت دفاع خود سنبھال لی۔ 3 جون 1940ء کو پیرس پر پہلا ہوائی حملہ ہوا ، دو روز بعد ہٹلر نے ایک سو ڈویژن الگ کر دیئے جنہوں نے چار مقامات سے نہایت خوفناک حملہ کیا۔ جرمن طیارے فرانس کی فضا پر چھائے رہے اور تباہی پھیلاتے رہے حتیٰ کہ فرانسیسی فوج بکھر کر رہ گئی۔ جرمن پیش قدمی کی رفتار نے کسی جوابی حملے کے لئے کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

فرانسیسی جو جرمنوں کی پے در پے ضربوں سے لڑکھڑا رہے تھے ان تک یہ خبر پہنچی کہ مسولینی نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ جب جرمن فوجیں پیرس سے پینتالیس میل دور رہ گئی تھیں چار لاکھ اطالویوں نے رویرا میں سے فرانس پر بلہ بول دیا۔ مسولینی جرمن فوجوں کی فتوحات پر بڑا خوش تھا لیکن ساتھ ہی اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ مبادا اٹلی عظمت و وقار کی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔ وہ کسی چھوٹے کردار کو اپنے شایان شان نہیں سمجھتا تھا۔

مسولینی نے ستمبر 1939ء کو برطانوی سفیر مقیم رومہ تک کسی نہ کسی طرح یہ خبر پہنچا دی تھی کہ رومہ اور برلن کے درمیان محوری رشتہ قائم ہو جانے کے باوجود اٹلی جنگ میں شریک نہیں ہوگا۔ اسی یقین دہانی کی بنا پر ہی برطانیہ نے ہٹلر کے مقابلے کا حوصلہ کیا تھا۔ لیکن جب جرمنی یورپی جنگ میں کامیابی حاصل کر چکا تھا تو عین اس وقت مسولینی نے فاشسٹ فوجوں کو جنگ کا حکم دے دیا تاکہ فتح کے بعد مال غنیمت میں حصہ دار بن جائیں۔ 18 مارچ 1940ء کو ہٹلر اور مسولینی کے درمیان درہ برینر میں ملاقات ہوئی جس میں باہم مشورہ ہوا اور ایک دوسرے کی مدح و ستائش کی گئی۔

16 جون تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ فرانس شکست کھا چکا ہے اسی روز چرچل نے یہ تجویز پیش کی کہ فرانس اور برطانیہ متحد ہو کر ایک یونین بنا لیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سقوط فرانس چرچل کے نزدیک نہایت اہم اور نازک واقعہ تھا۔ چرچل نے یہ بھی کہا کہ یونین ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے یہ التجا کرتی ہے کہ اتحادیوں کے اقتصادی وسائل مستحکم کیے جائیں۔ فرانسیسیوں نے برطانیہ کی اس پیش کش کو شک کی نظر سے دیکھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اب فرانس کے بعد برطانیہ کی باری آنے والی ہے۔ ہر طرف سے حوالگی کی صدائیں آنے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ کی پیش کش ٹھکرا دی گئی اور فرانسیسیوں نے شکست قبول کر لی۔

انگریزوں نے رات دن جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں ادھر امریکہ سے بھی ساز و سامان کے ذخیرے پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس جنگ میں جرمنوں نے ایسا بم استعمال کیا جو کچھ دیر بعد پھٹتا تھا، انگریزوں نے اس بم کا نام ''یو ایکس بی'' رکھا۔ اس کا ایک سرا زمین میں دھنس جاتا اور یہ کچھ دیر بعد پھٹتا تھا۔ شہری دفاع کے کام پر معمور لوگوں کے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں تھا جس سے وہ اندازہ لگا سکتے کہ یہ بم یو ایکس بی ہے یا عام بم جو پھٹا نہیں۔ 29 اور 30 دسمبر کی رات لندن پر ایک خوفناک حملہ ہوا۔ اس کے بعد بندرگاہوں کی باری آئی۔ ہر طرف تباہی کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔ ہٹلر اس جنگ میں ناکام رہا، کیوں کہ وہ بار بار ہدف بدلتا رہا اور مختلف جگہوں پر بم پھینکنے کے لئے زیادہ سے زیادہ قوت صرف کرتا رہا لیکن ایک ہدف پر ایک وقت میں پوری قوت صرف نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی کی شدید ضربوں کے باوجود برطانیہ کا عزم مزید پختہ ہو گیا۔

22 جون 1940ء کو ہٹلر نے سوویت روس پر حملہ کر دیا، جبکہ سقوط فرانس کے بعد برطانیہ کی پوزیشن بھی انتہائی نازک ہو گئی، خاص طور پر 1940ء کے موسم خزاں میں حکومت برطانیہ وطن کی حفاظت کے لئے سخت پریشان تھی۔ چرچل نے تمام فوجی ذخیرے کھنگال ڈالے۔ انگلستان، ہندوستان، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے بمشکل دیول کے لئے کمک کا انتظام کیا۔ جب ہٹلر کی فتوحات دیکھ کر اٹلی فرانس کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا تو بحیرہ روم کا پورا نقشہ بدل گیا۔ مسولینی خود اٹلی کی تمام بری، بحری اور

فضائی فوجوں کا سالار اعظم بن گیا اور وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد فتوحات کا انتظام کرے۔ نپولین کی طرح مسولینی بھی برطانیہ کی شہ رگ پر ضرب لگا کر اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مصر اور انگریزی و مصری سوڈان پر قبضہ کر کے قدیم روم کی شان و شوکت بحال کر دے۔

اگست 1940ء میں مسولینی نے یونان سے گفتگو شروع کی اس کا مطالبہ تھا کہ 1939ء میں برطانیہ نے یونان کو آزادی کی جو ضمانت دی ہے وہ واپس کر دی جائے۔ لیکن مسولینی کا یہ مطالبہ ٹھکرا دیا گیا جس پر مسولینی نے اعلان کر دیا کہ یونان غیر جانبدار ملک نہیں بلکہ برطانیہ کو خفیہ خفیہ امداد دے رہا ہے اور اس نے البانیہ کی سرحد پر دہشت انگیزی شروع کر دی ہے۔ 28 اکتوبر کو تین بجے اطالوی سفیر مقیم ایتھنز نے تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا جس میں اٹلی کی طرف سے شکایات کی فہرست پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا تھا کہ دوران جنگ میں متعدد مقامات پر اطالویوں کو قبضے کی اجازت دے دی جائے۔ ایتھنز نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا جس پر دو لاکھ اطالوی فوجیں البانیا سے یونان میں داخل ہو گئیں اطالویوں کے نزدیک اس جنگ میں کامیابی حد درجہ آسان تھی۔ اطالوی فوجیں بلا روک ٹوک یونان کی شمالی وادیوں کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

یونانیوں نے پہاڑی باشندوں سے منتخب پیادے بھرتی کئے تھے ان کی وردیاں اور ان کا دیگر سامان بھی سفید تھا اور جنرل میٹکساس اعلیٰ درجے کا ماہر فن حرب مانا جاتا تھا وہ اس انتظار میں تھا، جب اطالوی لشکر تنگ وادیوں میں دور دور تک پھیل گیا اور رسد کے مرکزوں سے خاصا دور ہو گیا تو پھر میٹکساس نے ضرب لگائی۔ پہاڑی جنگجوؤں نے جم کر مقابلہ کیا اور اطالوی لشکر نیست و نابود کر ڈالا۔ پھر یونانیوں نے متحد ہو کر حملہ کیا اور اطالویوں کو پسپائی اختیار کرتے ہی بنی۔

22 جون 1941ء کو نازیوں کی زبردست جنگی مشین اچانک سرحدوں سے سیل کی طرح نکلی اور روس کے خلاف جنگ شروع ہو گئی۔ یہ ایک حد درجہ وحشیانہ جنگ تھی۔ اٹھارہ سو میل لمبا محاذ روئے زمین پر دوزخ کی مثال پیش کر رہا تھا۔ سٹالن نے ہٹلر کے حملے کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ روسیوں کو یقین تھا کہ آخر ان کے قدیم حلیف یعنی

زمینی حقائق اور موسم اعتماد کا حق ادا کریں گے۔

ابتداء میں تو جرمن ماسکو کے مفصلات میں داخل ہو گئے لیکن ادھر برف باری شروع ہونے سے جرمن بڑے ہراساں ہوئے کیوں کہ وہ زیادہ معتدل ہوا کے عادی تھے۔ہٹلر کی طرف سے شدید موسم سرما کی وجہ سے رسد کا انتظام فوجوں کی ضرورتوں کا ساتھ نہ دے سکا اور نازک صورت حال پیدا ہوگئی یہاں تک کہ فوجوں کو کھانے پینے تک کا سامان نہ مل سکا اور انہوں نے برف میں دب کر مرے ہوئے گھوڑے کھانے شروع کر دیئے۔سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ فوجوں کے پاس موسم کے موافق لباس بھی کافی نہ تھا اور فوجیں شدید سردی اور برف باری کا ہدف بننے لگیں۔اس کے برعکس روسیوں کے پاس بہترین انتظام موجود تھا چنانچہ وہ سردی میں اکڑے ہوئے جرمنوں پر بے تکلف ضربیں لگانے لگے۔

دریائے نیوا کے دہانے اور خلیج فن لینڈ کے سرے پر ماسکو کے شمال مغرب میں لینن گراڈ واقع ہے جو یورپ کے بہت بڑے اور نہایت اہم شہروں میں سے ایک ہے۔روس پر جرمن حملے کے آغاز پر ہی ایک فوج لینن گراڈ بھی بھیج دی گئی تھی۔جس نے پہلے ہوائی حملوں سے ہی پورا علاقہ تباہ کر دیا اور شہر کو گھیرے میں لے لیا۔روسی مزدوروں نے اپنے اوزار چھوڑ کر ہتھیار اٹھا لئے ان کی جگہ کارخانوں میں عورتیں کام کرنے لگیں۔ ہٹلر کو اس ناقابل تسخیر عزم کا کوئی اندازہ نہ تھا۔اپریل 1942ء میں جب برف پگھلی تو جرمنوں نے زیادہ زور شور سے محاصرہ کر دیا مگر روسیوں کی بھرپور مزاحمت نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

ایشاغ میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے بالشوازم، سرمایہ داری اور یہودیت کی مذمت کی اور کہا کہ امریکہ برطانوی سلطنت پر قبضہ کر لینے کا خواہاں ہے۔عین اسی وقت اعلان ہو گیا کہ ہٹلر اور مسولینی اپنے اپنے ملکوں کو جاپان کا حلیف بناتے ہیں۔محوری سلطنتوں کی تابع مملکتوں نے بھی جاپان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ایک ہفتے کے اندر اندر پینتالیس قومیں جو دنیا کی نصف آبادی کی نمائندہ تھیں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر جنگ میں شریک ہو گئیں۔

پرل ہاربر کے واقعے کے بعد امریکہ باقاعدہ طور پر جنگ میں شریک ہو گیا اس کے پیش نظر سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ سمندروں پر پورا اقتدار قائم کر لیا جائے۔ چرچل نے 1942ء میں ایک خفیہ اجلاس کے رو برو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''صرف جہاز سازی کی بدولت جمہوریہ امریکہ یا خود ہم مشرق و مغرب کے جنگی میدانوں میں موثر مداخلت کا بندوبست کر سکتے ہیں'' چنانچہ جلد سے جلد جہاز سازی نے بے انتہا وسعت اختیار کر لی جس کے بغیر اتحادی نہ جنگ جاری رکھ سکتے تھے اور نہ زندہ رہ سکتے تھے۔امریکہ نے جہاز سازی میں دنیا بھر میں ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

اتحادیوں کے لئے 1942ء مایوسی کا سال تھا ہٹلر ایک وسیع منصوبے کے مطابق پورے بحیرہ روم اور مشرق بعید کو گھیرے میں لے رہا تھا۔پھر وہ مشرق کا رخ کر کے جاپانیوں سے ربط وضبط پیدا کر لینا چاہتا تھا جنہوں نے بحرالکاہل میں ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔1942ء تک یورپ ایشیا شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کی اٹھائیس قومیں جنگ میں محوریوں کے خلاف مغربی جمہوریتوں اور سوویت روس کی معاون بن چکی تھیں۔ان سب نے حلف اٹھالیا تھا کہ وہ محوریوں کے خلاف لڑتی رہیں گی اور کسی صورت بھی الگ صلح نامے پر دستخط نہیں کریں گی۔جنگ ختم ہونے سے پہلے اکیس قومیں محوریوں کے خلاف اس اتحاد میں شامل ہو گئیں۔اس سارے اتحاد کا نام روز ویلٹ نے اقوام متحدہ تجویز کیا تھا۔

ہٹلر 1941ء کے آخری چھ مہینے میں نہ لینن گراڈ لے سکا جو محاذ کے شمالی حصے میں تھا نہ ماسکو لے سکا جو عین وسط میں تھا۔ایک تہائی روسی آبادی کے علاقے فتح کرنے ایک تہائی کوئلے اور بجلی کے مراکز لے چکنے کے بعد وہ سمجھتا تھا کہ ایک اور کوشش کے بعد بالشویک حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔لیکن اس کے ساتھ ہی روسیوں کو شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ مغرب میں دوسرا محاذ قائم کیا جائے تاکہ روسی فوجوں پر دباؤ کم ہو جائے۔اہل مغرب نے فیصلہ کیا کہ سٹالن کی حوصلہ مندی کے لئے کچھ کیا جائے لیکن ہٹلر کا یورپی حصار بڑا مستحکم تھا جس کی وضاحت کے لئے چرچل خود ہوائی جہاز کے ذریعے ماسکو پہنچا۔سٹالن نے بے اعتمادی کا اظہار کیا اور کہا کہ روسی جنگجو

لڑائی کا سارا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ جب تک 1944ء میں نارمنڈی پر حملہ نہ ہوا سٹالن کو یقین نہ آیا کہ چرچل اور روز ویلٹ ہٹلرازم کو تباہ کرنے کا ویسا ہی عزم کیے ہوئے ہیں جیسا کہ وہ خود رکھتا ہے۔

فروری 1943ء میں سیاسی بحران کی علامتیں نمودار ہوئیں مسولینی نے اپنی کابینہ میں رد وبدل کیا۔ اس کے اکثر ساتھی بیوفائی اور غداری کے مجرم بن چکے تھے۔ مسولینی 19 جولائی کو اپنے ایک جرنیل کو ساتھ لے کر ہٹلر سے ملاقات کے لئے گیا اور مزید امداد کے لئے اپیل کی جسے ہٹلر نے خارج از بحث قرار دیا کیوں کہ جرمنی کے پاس جو کچھ تھا وہ روسی محاذ کے لئے از حد ضروری تھا۔ اسی دوران سات سو اتحادی طیاروں نے رومہ پر حملہ کر دیا۔

آخر مایوس ہو کر مسولینی واپس لوٹا جب اس کا طیارہ رومہ پر اترنے والا تھا تو ارد گرد دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پانچ روز بعد فاشسٹوں کی مجلس اعلیٰ کا 1939ء کے بعد پہلی مرتبہ اجلاس ہوا۔ مسولینی نے ایک مرتبہ پھر لاف زنی سے اقتدار قائم رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن گرینڈی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسولینی فوراً مسلح افواج کی کمان بادشاہ کے حوالے کر دے۔ ووٹنگ میں مسولینی کو واضح شکست ہوئی۔ جس کے بعد بادشاہ نے یہ اعلان کر دیا کہ مسولینی نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اطالوی خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے اور مسولینی پر لعنت بھیجنے لگے۔ فاشسٹ لیڈر اور پولیس کے آدمی روپوش ہو گئے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ اس تمام صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹلی نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی دوران وسط اٹلی کے ایک چھوٹے سے پہاڑی مقام پر جہاں مسولینی کو قید رکھا گیا تھا جرمن ہوائی فوج کے کوئی ایک سو آدمی اترے اور مسولینی کو ایک ہلکے طیارے میں سوار کر کے لے گئے۔ مسولینی نے شمالی اٹلی میں ایک فاشسٹ جمہوریت قائم کر لی اور جماعت کی تنظیم نو کا آغاز کیا۔

1945ء کے اوائل میں اتحادیوں نے زبردست اور شاندار فتوحات حاصل کیں۔ یورپ میں جنگ خاتمے کے قریب پہنچ گئی۔ اس سازگار حالت میں تین بڑے

روز ویلٹ ، چرچل اور سٹالن 4 فروری سے 12 فروری تک یالٹا میں بات چیت کرتے رہے۔اس بات چیت کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے بعد تمام معاملات کے تصفیئے کے لئے بنیادی امور طے ہو جائیں۔اسی ملاقات میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ قیام امن عالم کے لئے ایک عالمی تنظیم کی داغ بیل ڈالی جائے۔یہ بھی طے ہوا کہ جرمنی کی شکست اور یورپ میں جنگ کے خاتمے کے دو یا تین مہینے بعد روس جاپان کے خلاف میدان جنگ میں آجائے گا جس کے لئے روس نے اپنی شرائط پیش کیں جو باقی دو بڑوں نے قبول کر لیں۔ہٹلر تلملا رہا تھا،اس کے شہروں پر بم برسائے جارہے تھے اور ان کے پرخچے اڑ رہے تھے،شمالی افریقہ سے وہ محروم ہو چکا تھا،سویز پر قبضے کی ہر امید ختم ہو چکی تھی۔اٹلی میں اس کی فوجیں رومہ تک دھکیلی جا چکی تھیں۔جرمن فوج بھی اب ویسی حوصلہ مند نہیں تھی جیسی فتوحات کے ابتدائی دور میں تھی۔جانی نقصان بہت زیادہ ہو چکے تھے اور مقتولین اور مجروحین کی کمی پوری کرنے میں مشکلات پیش آرہی تھیں۔

6 جون کو صبح تین بج کر بتیس منٹ پر جنرل آئزن ہاور کی زیر کمان متحدہ بحری فوجیں زبردست ہوائی قوت کی حفاظت میں اتحادی فوجوں کو شمالی فرانس کے ساحل پر اتارنے لگیں۔صبح تک ایک ہزار امریکی بمبار طیاروں کا ایک بیڑہ روانہ ہوا اور انگلستان سے اڑ کر فرانس کے اندر تک چلا گیا۔گویا انہوں نے ایک چھتری سی تان لی جس کی حفاظت میں فوجیں ساحل پر اتریں۔نارمنڈی کے ساحل پر آتشبازی سے ہر چیز تباہ کر دی گئی۔متحدہ ہوائی حملے کا یہ نہایت خوفناک مظاہرہ تھا۔

اتحادی طیاروں اور جرمن طیاروں میں پچاس اور ایک کی نسبت تھی۔آخر جرمن طیاروں نے خستہ حالی میں اپنے اڈے اٹھائے اور حلقہ پیرس کے عقب میں چلے گئے۔چھاتا فوج کے بہت سے آدمی جرمن فوج کے حلقے میں پہنچ گئے لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کا ساتھ خوش نصیبی نے نہ دیا۔چونکہ ہوا تیز تھی اور گھنی کہر پڑی ہوئی تھی اس لئے بعض آدمی اصل مقامات سے پینتیس میل دور جا گرے بعض درختوں میں اٹک گئے بعض دلدلوں میں جا گرے۔بعض اپنے سازوسامان اور چھتریوں کی بدولت اتنے بوجھل ہو گئے کہ تین تین فٹ سے بھی کم پانی میں ڈوب گئے۔اس کے فوراً بعد ہی

طیاروں کے ذریعے سے تیرہ ہزار فوج چار گھنٹوں کے اندر اندر فرانس پہنچا دی گئی۔ اتحادی ڈویژنوں نے جلد ہی سواحل کے آس پاس حلقے قائم کر کے فرانس کے اس حصے کو باقی یورپ سے الگ کر لیا۔ اس اثناء میں اتحادی طیاروں نے جرمنوں کو پیرس سے نارمنڈی کی طرف حرکت کرنے کا موقع نہ دیا۔

اتحادی کمانداراعلیٰ کو ایک خفیہ ذریعے سے پہلے ہی یہ علم ہو چکا تھا کہ جرمن ایک آخری حربے کی تلاش میں ہیں ایٹمی جنگ کے لئے مسابقت جاری تھی۔ جرمن سائنسدانوں کو ایٹمی قوت سے کام لینے کا راز معلوم ہو چکا تھا لیکن آدمیوں اور جنگی سامان کی قلت کے باعث وہ کام کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ایسی متعدد کارگاہوں میں ایک اور خفیہ حربے پر کام ہو رہا ہے۔ یہ خفیہ حربہ 13 جون 1944ء کو ظاہر ہوا جب لندن پر راکٹ بم گرا۔ یہ بم ایک طیارے کی شکل میں تھا جس پر کوئی پائلٹ سوار نہ ہوتا۔ انگریزوں کو ہٹلر کے اس نئے حربے پر بڑی تشویش ہوئی چرچل نے آئزن ہاور سے کہا کہ کیلے کے آس پاس راکٹ بم پھینکنے کے جتنے مرکز بنے ہوئے ہیں ان پر ضربیں لگائی جائیں۔

اگست 1944ء میں فیوہرر نے دوسرا راکٹ بم چلانے کا حکم دیا۔ یہ ساٹھ ستر میل کی بلندی پر اڑتا اور اس کی رفتار تین ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ یہ بھی عین نشانے پر پہنچ کر نیچے گرتا اور پھٹنے سے پہلے زمین میں دھنس جاتا۔ یہ دیکھا نہ جا سکتا تھا اس کے بارے میں پتہ ہی اس وقت چلتا تھا جب یہ پھٹتا تھا۔ اگرچہ یہ بم انتہائی خطرناک تھے لیکن وہ شکست خوردہ اور مرتے ہوئے ہٹلر کی آخری ہچکیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

26 اگست کو جنرل ڈیگال شہر کی سڑکوں پر پھرا اور آبادی جوش سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ عوام نے چارلس ڈیگال کو اپنی آخری پناہ گاہ اور امید کا واحد نشان قرار دے لیا تھا۔ اس لئے اس شخص کا منظر عام پر آنا ضروری تھا تا کہ اسے دیکھ کر قومی اتحاد میں مزید جلا پیدا ہو۔ چار سال کے قبضے کے بعد پیرس نے آزادی حاصل کی۔ جس کے بعد اتحادیوں کے چار لشکر برق رفتاری کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھے اور بیلجئم کے تین کلیدی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ وسط ستمبر 1944ء میں اتحادیوں نے ایک شاندار قمار

بازی کا فیصلہ کرلیا تا کہ جنگ جلد از جلد ختم ہو جائے انہوں نے سوچا کہ خط سیگ فریڈ پر حملہ کر کے کیوں خون بہایا جائے جس کی اتنی ہی بڑی فوج حفاظت کر رہی تھی جتنی کہ خود اتحادیوں کی تھی۔ کیوں نہ اس خط کے بازوؤں سے حملہ کیا جائے۔ دریائے ماس اور دریائے وال کے دو بڑے پلوں پر قبضہ کر کے شمال طرف سے طیارہ فوج کے ساتھ مل کر جرمنی میں داخلے کا راستہ پیدا کرلیا جائے۔

مغرب میں اتحادی خط سیگ فریڈ تک پہنچ گئے تھے اور جرمنی کے اندر گھس جانے کے لئے تیار تھے۔ جنوب کی جانب اٹلی کی فوجیں شمال کا رخ کیے ہوئے زور شور سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مشرقی جانب روسی فوجیں مشرقی یروشیا میں جرمنوں کی سرزمین پر قدم رکھ چکی تھیں۔ لیکن ہٹلر ایک آخری بازی اور کھیلنا چاہتا تھا۔ یعنی آرڈنس کے مقام پر اتحادیوں پر ایک زبردست ضرب لگائی جائے یہی مقام ہے جسے جرمنی کے بڑے بڑے ماہرین جنگ ایک محبوب شکارگاہ سمجھتے تھے۔ اس مقام پر اتحادی فوجوں کی تعداد کم تھی اور انہیں توڑتے ہوئے آگے بڑھ جانا تعجب انگیز نہ تھا۔ ہٹلر چاہتا تھا کہ اس حملے سے اتحادیوں کو متحیر کر دے۔

اس نے ستمبر 1944ء میں اس منصوبے کی تفصیلات مرتب کیں۔ 11 اور 12 دسمبر کو بوریا میں تمام کمانداروں کا ایک اجلاس بلایا جنہیں جوابی حملے میں حصہ لینا تھا۔ کمرے کی ایک طرف جرمنی کے نہایت تجربہ کار جرنیل اور پیشہ ور سپاہی تھے جو جنگ کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کے سامنے وہ عالی مرتبت سالار تھا جو تنہا دنیا کی بڑی قوتوں کے اتحاد سے نبرد آزما تھا۔ اس نے مدھم اور متذبذب آواز میں ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ ہٹلر کی تجویز یہ تھی کہ سب سے بڑی ضرب مرکز پر لگائی جائے شمال میں ذرا کم قوت رہے اور وہ صرف شمالی لکسمبرگ اور جنوبی و مشرقی بیلجیم میں سے ایک خط روکے رکھے تا کہ بڑے حملے کی حفاظت کا فرض انجام پائے اس اچانک حملے کے لئے بیس ڈویژن پانچویں اور چھٹی بکتر بند فوجوں اور ساتویں فوج سے لئے گئے جو زیادہ تر پیادہ فوج تھی۔ آگے چل کر ان ڈویژنوں کی تعداد پچیس کر دی گئی۔ فیلڈ مارشل رونسٹاٹ کو دس بکتر بند ڈویژن دیئے گئے اور اسی کو سب سے آگے رکھا گیا۔

16 دسمبر 1944ء کی صبح اچانک جو حملہ ہوا اس کا موازنہ پرل ہاربر سے کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی کی اڑھائی لاکھ سے زیادہ بہترین فوج نے آرڈنس پر ضرب لگائی۔ امریکیوں کے خون کی ندیاں بہنے لگیں لیکن ان کے لئے لازم تھا کہ وہ مقابلہ کرتے رہیں ورنہ آرڈنس کا سارا علاقہ جرمنوں کے لئے کھل جاتا۔ کرسمس کے دن رونسٹاٹ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ جنگ ہار چکا ہے۔ یورپ میں جنگ خاتمے کے قریب آگئی۔ ان سازگار حالات میں تین بڑے روز ویلٹ، چرچل اور سٹالن 4 فروری سے 12 فروری 1945ء تک یالٹا میں بات چیت کرتے رہے۔ اس بات چیت کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے بعد تمام معاملات کے تصفیے کے لئے بنیادی امور طے کر لئے جائیں۔

روسیوں نے سٹالن گراڈ سے مغربی جانب ایک ہزار میل سے زیادہ پیش قدمی کی اور اب ان کے تین زبردست لشکر جرمنی سے گزرتے ہوئے برلن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر اتحادیوں نے روہر کو نرغے میں لینے کی طرف توجہ کی۔ یہ جرمنی کا صنعتی قلب تھا۔ یہاں جرمن بڑی بہادری سے لڑے اور سخت مقابلہ کیا۔ لیکن وہ روہر کو نہ بچا سکے۔ اب جنگ کو طول دینا بے معنی تھا اتحادی فوجیں بڑی تیزی کے ساتھ جرمنی کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کارلس رہ 9 اپریل کو، نورمبرگ جو نازیت کا مرکز تھا 20 اپریل کو، سٹٹ گارٹ 21 اپریل کو اور میونخ 30 اپریل کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

ستمبر 1944ء میں شکست خوردہ فوجوں نے متارکے پر دستخط کر دیئے۔ روسی ریچھ نے آئندہ اپنا زور ہنگری ہی میں دکھایا جو یورپ میں ہٹلر کا آخری حلیف تھا۔ لیکن ہنگری نے جرمنی کی اس بات پر مذمت کی کہ انہوں نے ہنگری کے استقلال کی خلاف ورزی کی تھی۔ چنانچہ ہنگری میں ہورتھی کی حکومت معزول ہوگئی اور اس کی جگہ فاشزم کی حامی حکومت بن گئی اور جب روسی فوجیں ہنگری پہنچیں تو انہوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ چنانچہ ہنگری نے بھی متارکے پر دستخط کر دیئے۔

برلن پر نزع کی حالت طاری ہو چکی تھی امریکی و برطانوی فضائی قوت اور روسی توپوں نے اندھا دھند بمباری کی، سارا شہر ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ جگہ جگہ آگ

کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اہل برلن دہشت زدہ حالت میں انجام کے منتظر تھے۔ وہ فضائی بموں اور توپوں کے گولوں سے بچنے کے لئے تہہ خانوں اور زمین دوز راستوں میں گھس گئے۔ روسی افواج نے شہر میں موجود ڈھائی لاکھ عمارتوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اٹھارہ لاکھ گولے برسائے۔ ریڈ آرمی نے اس شہر پر قبضہ کرنے کی خاطر تین لاکھ سے زیادہ انسانی جانوں کو تلف کیا اور اس شہر کے محاصرے کے لئے ساڑھے تین ہزار ٹینک اور دوسری بکتر بند گاڑیاں استعمال کی گئیں۔ 527 ہوائی جہازوں نے بمباری میں حصہ لیا۔ شہر پر گرائے جانے والے بموں کے شیل اگر وزن کئے جاتے تو ان کا وزن 36 ہزار ٹن بنتا تھا۔

بڑے بڑے نازیوں کو احساس ہو گیا کہ اب انجام قریب ہے لہٰذا وہ ایک ایک کر کے برلن سے نکلے تا کہ پناہ گاہ کا انتظام کر لیں۔ فیوہرر نے حصار بویریا میں جانے کی تمام التجائیں ٹھکرا دیں اور برلن ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور اس نے کہا کہ میں اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ یہیں پر جان دوں گا۔ رائش چانسلری کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس پر بے شمار بم گرائے جا چکے تھے اور توپوں کے گولوں سے تاریک ہو گئی تھی اس کے نیچے زمین دوز کمروں میں ہٹلر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈٹ گیا اور جنگی کارفرما کا کردار ادا کرتا رہا۔ روزانہ کانفرنسیں ہوتیں، بڑے بڑے نقشوں کا گہرا مطالعہ کیا جاتا، فوجی دستوں کے خلاف حکم جاری ہوتے۔ بے وجود فضائی فوج سے کہا جاتا کہ دشمن پر شدید ضرب لگائی جائے۔

شروع میں ہٹلر کو یہ امید تھی کہ برلن کا محاصرہ کسی معجز نما طریق پر اٹھا لیا جائے گا لیکن آخر اسے یقین ہو گیا کہ انجام قریب ہے چنانچہ اس نے دو دستاویزات لکھوائیں، ایک اس کی ذاتی وصیت تھی اور ایک سیاسی وصیت۔ ذاتی وصیت نامے کے مطابق اس نے اپنی ہر چیز پارٹی کے حوالے کر دی، اگر پارٹی نہ رہے تو سب کچھ مملکت کے پاس جائے۔ اگر مملکت بھی برباد ہو جائے تو کہا کہ میری طرف سے کسی فیصلے کی ضرورت نہیں۔

سیاسی وصیت نامے کے دو حصے تھے۔ اس نے کہا: تیس سال سے قوم کی محبت اس سے وفاداری کے لئے میری محرک رہی اور میں نے وہ حد درجہ مشکل فیصلے کئے جن

سے فانی انسانوں کو بہت کم سابقہ پڑا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ 1939ء میں میں جنگ کا خواہاں تھا یہ جنگ صرف ان بین الاقوامی مدبروں کی خواہش اور انگیخت کی بناء پر ہوئی جو یا تو یہودی الاصل تھے یا یہودیوں کے مفاد کے لئے کام کر رہے تھے۔ میں برلن کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، میں خوشی سے جان دے رہا ہوں مجھے ان غیر معمولی اور بے اندازہ کارناموں سے پوری آگاہی ہے جو ہمارے سپاہیوں نے میدان ہائے جنگ میں، ہماری عورتوں نے گھروں کے اندر، ہمارے کسانوں نے کھیتوں میں، ہمارے کارکنوں نے مختلف مقامات پر انجام دیئے۔ بلکہ ان نوجوانوں کے کارناموں کا بھی علم ہے جو میرے نام سے موسوم ہیں۔ یہ سب چیزیں تاریخ میں یگانہ حیثیت کی حامل ہیں۔

اس وصیت نامے کے دوسرے حصے میں ہٹلر نے گوئرنگ اور ہملر کو پارٹی سے خارج کر کے تمام حقوق سے محروم کر دیا اور اپنا سیاسی جانشین ایک پروشیائی امیر البحر کارل ڈورنٹز کو مقرر کیا۔ اس نے بورمین، گوئبلز اور دوسروں سے جو اس کے ساتھ جانیں دے دینے پر آمادہ تھے درخواست کی کہ اپنے احساسات پر قوم کے مفاد کو ترجیح دیں اور بچ کر نکل جائیں تا کہ ایک نیشنل سوشلِ مملکت تعمیر کرنے میں مدد دے سکیں۔ آخر میں کہا کہ میں سب سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں کہ وہ نسلی قوانین کی پابندی کریں اور بین الاقوامی یہودیت کی بے پناہ مخالفت جاری رکھیں جو روئے زمین کی تمام قوموں میں زہر پھیلانے کی ذمہ دار ہیں۔

گوئبلز دونوں وصیت ناموں پر گواہ بن گیا اور اس نے لکھا کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ فیوہرر کا حکم ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ علاوہ بریں انسانیت اور وفاداری کے احساسات ہمیں اس موقع پر فیوہرر کو ترک کر دینے سے باز رکھتے ہیں جو انتہائی ضرورت کی ساعت ہے۔ اگر میں زندہ بچ جاؤں تو عمر بھر اپنے آپ کو ایک ذلیل غدار اور ایک عام بدقماش سمجھتا رہوں گا۔ میں اپنی زندگی فیوہرر کے قریب ختم کر دوں گا۔ کیوں کہ میں اگر اسے فیوہرر کی خدمت میں صرف نہ کر سکا تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

30 اپریل کو سوا تین بجے پہلے ہٹلر کی ایک محبوبہ براؤن نے زہر کھا کر خودکشی کی اور پھر ہٹلر نے اپنے منہ میں بندوق رکھ کر گولی چلا دی۔ اس طرح جو اپنے بے مثال سیاسی

کیریئر میں ناقابل تسخیر رہا، یورپ کی عظیم قوتوں کو نیچا دکھانے والا جسے ساڑھے چھ کروڑ سے زائد جرمنوں نے اپنا نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے فیوہرر کا خطاب دیا آخر اپنے انجام کو پہنچ گیا اور ہٹلر کو زندہ گرفتار کرنے کا روسی فوج کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

یکم مئی 1945ء کو ڈوینٹز نے ایک حکمنامہ جاری کیا جس کے ابتدائی الفاظ اس طرح تھے:

''جرمنی کی مسلح فوجو! میرے رفیقو! فیوہرر مر چکا ہے۔ اپنے نصب العین کی پابندی میں یورپ کی قوموں کو بالشوزم سے بچانے کے لئے اس نے اپنی جان دے دی اور بہادری کی موت قبول کی۔ وہ جرمنی کی تاریخ کا ایک بہت بڑا ہیرو تھا۔ ہم پر فخر احترام وقلق کے ساتھ اپنے پرچم سرنگوں کرتے ہیں۔''

یورپ کی دوسری عالمی جنگ کو ختم کرنے کے لئے شرائط حوالگی پر جرمن سفیروں نے 7 مئی 1945ء کو دو بج کر اکتالیس منٹ صبح کے وقت دستخط کئے۔ حوالگی کی دستاویز بالکل واضح اور سادہ تھی۔ اس میں لکھا تھا ''ہم دستخط کنندگان جرمن ہائی کمان کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنی تمام بری، بحری اور فضائی فوجیں جو اس وقت تک جرمنوں کے ضبط ونظم میں ہیں بلاشرط اتحادی افواج کے کمانڈر اعلیٰ اور ساتھ ہی روسی ہائی کمان کے حوالے کرتے ہیں۔''

اسی روز جرمن حکومت کے نئے مرکز فلینز برگ سے رسمی اعلان جاری کیا گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ مسلح فوجوں کے ہائی کمان نے آج ڈوینٹز کے حکم کے مطابق تمام فوجوں کی طرف سے غیر مشروط حوالگی کا اعلان کر دیا۔

حوالگی کی جو شرطیں طے ہوئی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مسلح جرمن فوجوں کے کمانڈر اس معاہدے کی توثیق کے لئے روسیوں کے صدر مقام برلن میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ حوالگی کی رسم ادا ہوئی۔ اس سے ایک طرف مغربی اتحادیوں اور روس کی یگانگی واضح ہو گئی اور دوسری طرف دنیا پر یہ آشکارا ہو گیا کہ جرمنوں نے محض مغربی اتحادیوں کے روبرو نہیں بلکہ روسیوں کے سامنے بھی ہتھیار ڈالے ہیں۔

اگلے روز آدھی رات کے وقت غیر مشروط حوالگی کی دستاویز کی توثیق برلن میں ہوئی، اس مرتبہ جرمن فوج کی طرف سے فیلڈ مارشل کائیٹل، بحریات کی طرف سے فرائیڈ برگ اور فضائی فوج کی طرف سے فان سٹمف نے دستخط کئے۔ ائیر مارشل ٹیڈر نے بھی اس دستاویز کی تصدیق کی۔ اس طرح پانچ سال آٹھ مہینے اور سات دن کی رزم و پیکار کے بعد دوسری عالمی جنگ یورپ میں اختتام کو پہنچ گئی اور 8 مئی 1945ء کو یوم فتح کے طور پر منایا گیا۔

پوٹس ڈیم معاہدہ (جرمنی اور اتحادی 1945ء)

اتحادیوں نے شکست خوردہ اقوام سے تعلقات کے نئے زاویئے تلاش کرنا شروع کر دیئے جس کا مظہر 17 جولائی سے 2 اگست 1945ء تک برلن میں پوٹس ڈیم کے مقام پر ہونے والی کانفرنس تھی۔ اس میں امریکی صدر ٹرومین، روس کے وزیر اعظم اسٹالن اور برطانوی وزیر اعظم ایٹیلی نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ پر امن سمجھوتے کے لئے ابتدائی اقدامات کرنے کی غرض سے وزرائے خارجہ کی سطح پر ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں تمام شکست خوردہ ممالک سے سمجھوتے کیے جائیں۔

مذکورہ کانفرنس کے لئے لین دین کا معاملہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والے معاہدوں کی طرح ہی طے کیا گیا تھا۔ درحقیقت یہ کانفرنسیں مال غنیمت بانٹنے اور مفتوح اقوام کو گدھوں کی طرح نوچنے کے لئے منعقد کی گئی تھیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اتحادیوں کی طویل گفت وشنید کے بعد اتفاق رائے سے محوری طاقتوں (جرمنی، اٹلی اور جاپان) کے ساتھ معاہدات ہوئے۔ اٹلی اور جرمنی کے ساتھ 10 فروری 1947ء کو پیرس میں معاہدوں پر دستخط ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد جرمنی کی حیثیت عالمی سیاست کی بساط پر ایک معمولی مہرے سے زیادہ نہیں تھی، جس سے اینگلو امریکن اور سوویت یونین کی ریاستیں کھیلتی رہیں۔ 1945ء میں مذکورہ کانفرنسوں میں اتحادیوں نے جرمنی سے تمہ معاہدے کے بنیادی نکات طے کر لئے تھے۔ معاہدے سے قبل نیورمبرگ کی عدالت میں جرمنی کے اعلیٰ عہدے داروں کے خلاف جنگی مقدمات بھی چلائے گئے۔ مگر اس بات سے جرمن خوف زدہ تھے کہ کہیں ان پر ایک مرتبہ پھر معاہدہ ورسائی کی طرز پر ایک نئی مصیبت نہ ٹھونس دی جائے۔ معاہدے کے تحت چار بڑی طاقتوں (امریکہ،

برطانیہ، سوویت یونین، فرانس) نے جرمنی کو چار زون میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ہر زون پر قابض طاقت کا اپنا انتظام قائم تھا۔ اسی طرح برلن کے بھی چار حصے کئے گئے۔ جنگ کے خاتمہ تک یہ شہر مجموعی طور پر بیس انتظامی اضلاع پر مشتمل تھا ان میں سے آٹھ اضلاع پر روسی افواج نے قبضہ کر لیا جسے بعد میں باقی اتحادیوں سے ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے روس نے مشرقی جرمنی کے حوالے کر دیا اسے مشرقی برلن کہہ کر مشرقی جرمنی کا صدر مقام قرار دے دیا۔

شہر برلن کے باقی بارہ اضلاع کی تقسیم اس طرح ہوئی، 6 اضلاع امریکی کنٹرول میں دے دیئے گئے، چار اضلاع پر برطانیہ قابض ہو گیا اور دو اضلاع فرانس کے حصے میں آئے۔ ان بارہ اضلاع کو مغربی برلن کہا جانے لگا۔ جرمنی کے مستقبل کے حوالے سے تین اہم فیصلے کئے گئے جن میں نازی ازم کا خاتمہ، جرمنی کو غیر مسلح کرنا اور وہاں جمہوری اصولوں کی آبیاری کرنا شامل تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو افراد کے حق خود ارادیت پر مبنی ہو۔ تاہم اتحادی ابھی جرمنی میں سیاسی جمہوریت کو تمام سطحوں پر متعارف کرانے کے حق میں نہیں تھے۔

معاہدے میں طے پایا جرمنی کی صنعت سے حاصل ہونے والی پیداوار کا کم از کم نصف سوویت یونین کو دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس صنعتی پیداوار میں سے باقی اتحادی اپنی ضروریات کے مطابق اشیاء حاصل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ پوسینیا، سلیسیا اور دیگر علاقہ جات مکمل طور پر بے حد ترقی یافتہ تھے، ان کے مستقبل کا فیصلہ کچھ اس طرح سے کیا گیا کہ یہاں کی 10 فیصد صنعتی پیداوار سوویت یونین اپنی مرضی سے لینے کا مجاز تھا۔ پندرہ فیصد پیداوار کا تبادلہ مشرقی جرمنی کی زرعی پیداوار کے ذریعے کیا جا سکتا تھا۔

مزید براں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو بھی یہ اختیار ہو گا کہ وہ اپنے حصے کے جرمنی سے جو قابل انتقال جائیداد چاہیں منتقل کر دیں۔ مگر مال غنیمت کی اس لوٹ مار میں سوویت یونین اور دیگر اتحادیوں کے درمیان عدم اتفاق رہا۔ چنانچہ سوویت یونین نے جنگی تاوان وصول کرنے کے لئے جرمنی کی جائیدادیں فروخت کرنا شروع کر دیں اور مشینری کو اپنی ریاست میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس پر دیگر اتحادیوں (امریکہ،

برطانیہ اور فرانس) کو اعتراض تھا۔ ان اختلافات نے اتنا طول پکڑا کہ تینوں اتحادیوں نے اپنے حصے کے جرمنی کو ملا کر اتحاد قائم کرلیا۔ یہ اتحاد مغربی جرمنی کہلایا۔1948ء میں تینوں نے اپنے استحقاق والے جرمنی میں ایک نئی کرنسی متعارف کرائی۔ مغربی حصے میں قانون ساز اسمبلی بنائی گئی اور دستور نافذ کیا گیا جو 1919ء کی وہیمر جمہوری پارٹی (پہلی جنگ عظیم کے بعد اور نازی پارٹی کے قائم ہونے سے قبل کے جرمنی میں حکومت کرنے والی جماعت) کے دستور کے خطوط پر بنایا گیا تھا۔

ادھر سوویت یونین نے اپنے زون میں ایک دستور نافذ کر دیا اس طرح جرمنی دو بلاکوں کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ مغربی حصہ جمہوریت یا سرمایا دارانہ نظام کی طرف گامزن ہو گیا اور مشرقی بلاک اشتمالیت کی راہ پر چل پڑا، نظریاتی سرحدیں جغرافیائی سرحدوں پر غالب آگئیں۔ دونوں طرف سے جرمنی کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ جرمنی کی تقسیم جو پہلے عارضی اور انتظامی تھی اب مستقل اور سیاسی ہوگئی۔ یہ سب کرامات وعنایات دوسری جنگ عظیم کے بعد ہونے والے معاہدہ امن کا نتیجہ تھیں۔ تاہم ایک عرصے بعد 10 نومبر 1989ء کو دیوار برلن گرا کر دونوں جرمنی یکجا ہو گئے۔

——————✡——————

معاہدہ پیرس (اٹلی اور اتحادی)

جنگ عظیم دوم کی ایک اور محوری طاقت اٹلی سے بھی 10 فروری 1947ء کو پیرس میں معاہدہ امن طے پایا یہ معاہدہ 90 دفعات اور 17 ضمیموں پر مشتمل تھا۔ معاہدے کے تحت اٹلی کے علاقوں کی بندر بانٹ فاتحین نے اس طرح کی کہ لٹل سینٹ برنارڈ کے اضلاع، مونٹ تھابر، چیرٹن، مونٹ سینس، ٹینڈا اور بریگا فرانس کو باعزت طریقے سے دے دیئے گئے۔ زارا، پیلا گوسا، لاگوسٹا اور ساحل ڈالمیشن کے جزائر یوگو سلاویہ کو دے دیئے گئے۔ اسٹری یان، وینیشیا، گلیا اور ٹرائسٹ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے تحت آزاد علاقے قرار دیئے گئے۔ لیبیا اور صومالی لینڈ ٹرسٹی شپ کے تحت کر دیئے گئے اور ان کے بارے میں آخری اختیار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سپرد کر دیا گیا۔ بالآخر لیبیا اور صومالی لینڈ کو ایک آزاد مقتدر علاقہ قرار دے دیا گیا۔ دوسری شرائط اس طرح تھیں:

(۱) افریقی نوآبادیات سے اٹلی کا اقتدار ختم کر دیا گیا معاہدے کے تحت البانیہ اور ایتھوپیا کی آزادی کو اٹلی نے تسلیم کر لیا۔ اٹلی کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ فرانس اور یوگوسلاویہ کے ساتھ اپنی سرحدوں سے افواج کا انخلاء کرے گا۔

(۲) اٹلی پر ایٹمی ہتھیاروں کے ضمن میں مکمل پابندی عائد رہے گی اور باقی ہتھیاروں کے علاوہ تین کلومیٹر سے زیادہ فاصلے مار کرنے والی بندوقیں رکھنے کی اجازت نہیں۔

(۳) اٹلی 200 سے زیادہ بھاری ٹینک بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کی بحریہ دو جنگی جہازوں تک محدود رہے گی اور اسے پچیس ہزار نفوس پر مشتمل بحری فوج (افسروں سمیت) رکھنے کی اجازت ہوگی۔ وہ پچیس ہزار نفوس پر مشتمل پیادہ

فوج رکھ سکتا ہے اس سے زیادہ پر پابندی رہے گی۔

(۴) اٹلی کی فضائیہ 200 لڑاکا طیاروں اور 150 مال بردار طیاروں تک محدود رہے گی۔

(۵) اٹلی کو تاوان جنگ کے طور پر سوویت یونین کو 100 ملین ڈالر اور البانیہ کو 5 ملین ڈالر ادا کرنے ہوں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ تاوان کی رقم سات سال میں ادا کی جائے گی، یہ مدت 1952ء سے شروع ہو گی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ معاہدہ امن کے تحت ہی اتحادیوں کی خواہشات کے مطابق اٹلی کا نیا آئین بھی مدوّن کیا گیا۔ زمینی حقائق گواہ ہیں کہ معاہدے کی دفعات کے ذریعے نہ صرف اٹلی کی نو آبادی برتری کا خاتمہ کیا گیا بلکہ اسے یورپ کی سیاست میں تیسرے درجے کی محتاج ریاست بھی بنا دیا گیا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ معاہدے کے بعد ہونے والے انتخابات میں منتخب ہونے والے صدر این اوڈی نے 1949ء میں اٹلی کو نیٹو سے منسلک کیا۔

------✡------

معاہدہ سان فرانسسکو (جاپان اور تحادی 1951ء)

جاپان نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لئے چین پر جو جنگ مسلط کر رکھی تھی امریکہ کی آنکھوں کا کانٹا بنی ہوئی تھی نیز یہ کہ امریکہ کو جاپان کی بحری اور فضائی قوت کا نشو ارتقا سخت ناپسند تھا۔ پچھلے بیس سال میں امریکہ اور جاپان کے درمیان اقتصادی جنگ میں شدت آ گئی تھی۔ 1938ء میں حکومت نے صنعت کاروں کو امریکی ہوائی جہاز جاپان کے ہاتھ فروخت کرنے کی ممانعت کر دی۔ حتیٰ کہ 1911ء کا تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور تجارت یومیہ تصفیہ کی بنیاد پر آ گئی۔ برطانوی دولت مشترکہ کی قوموں نے بھی اس کی پیروی کی۔ روز ویلٹ نے برآمد پر نظم وضبط کا قانون منظور کرایا اور جاپان کو مشینوں کے اوزار، کیمیائی چیزیں اور جنگی سامان دینے کی ممانعت کر دی۔

جرمنی ہٹلر کی قیادت میں اور اٹلی موسولینی کے جھنڈے تلے اپنی اپنی حدود مملکت جبر وقوت کے بل پر وسیع کرنے میں مصروف تھے کہ اسی زمانے میں جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا میں اپنے توسیعی عزائم کا آغاز کر دیا۔ یکم اگست 1940ء کو جاپان کے وزیراعظم شہزادہ فومیمارو کونوئی نے یہ اعلان کر دیا کہ جاپان عظیم تر جنوب مشرقی ایشیا کی تشکیل کا عزم رکھتا ہے۔ اس اعلان کا برلن اور روم میں خیر مقدم کیا گیا اور بالآخر 27 ستمبر 1940ء کو برلن میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے اس معاہدہ کے بعد دنیا میں یہ محوری محاذ قائم ہوا اور جنگ کے شعلے مشرق ومغرب دونوں طرف بلند ہونے لگے۔ یہ معاہدہ اس طرح تھا:

''جرمن اٹلی اور جاپان کی حکومتیں دائمی امن کے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہیں کہ دنیا کی ہر قوم کو اس کا اپنا مناسب مقام ملنا چاہئے۔ اس بنا پر ان حکومتوں نے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ بھی طے کیا ہے کہ وہ عظیم تر جنوب مشرقی ایشیا اور

نئے یورپی علاقوں کے قیام کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون واشتراک کریں گی۔تاکہ ان علاقوں میں ایک نیا نظام پیدا ہو جو ان علاقوں کے عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کا ضامن بنے۔ان تینوں حکومتوں کی مزید خواہش ہے کہ دنیا کی ان قوموں کے ساتھ بھی تعاون کیا جائے جو ملتے جلتے عزائم رکھتی ہوں اور جن کا مطمع نظر اپنی امنگوں کے مطابق عالمی امن کا قیام ہو۔جرمنی اٹلی اور جاپان کی حکومتیں معاہدہ کی حسب ذیل دفعات پر متفق الرائے ہیں:

- ☆ یورپ میں نئے نظام کے قیام کے لئے جرمنی اور اٹلی جو جدوجہد کر رہے ہیں جاپان اس کو درست تسلیم کرتا ہے اور اسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔
- ☆ جاپان جس عظیم تر جنوب مشرقی ایشیا کے لئے علم قیادت بلند کئے ہوئے ہے جرمنی اور اٹلی اس کو درست تسلیم کرتے اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔
- ☆ جرمنی اٹلی اور جاپان مذکورہ بالا بنیاد پر باہم تعاون کا عہد کرتے ہیں وہ مزید یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر تینوں حکومتوں میں سے کسی ایک پر کسی ایسی طاقت کی طرف سے حملہ کیا گیا جو اب تک یورپی جنگ میں شریک نہیں ہے یا چین اور جاپان کے درمیان تصادم ہو گیا تو حلیف ممالک سیاسی،اقتصادی اور فوجی امداد پہنچائیں گے۔
- ☆ مذکورہ بالا دفعات کو مشترک ٹیکنیکل کمیشن عملی جامہ پہنائیں گے اور ان کے ارکان تینوں حکومتیں بلا تاخیر مقرر کریں گی۔
- ☆ جرمنی اٹلی اور جاپان کی حکومتیں یہ عہد بھی کرتی ہیں کہ متذکرہ بالا شرائط سے وہ سیاسی تعلق کسی حال میں بھی متاثر نہیں ہو گا جو ان میں سے ہر ایک اور روس کے مابین اس وقت ہے۔
- ☆ موجودہ معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی اس کو نافذ العمل سمجھا جائے گا اور یہ نفاذ کی تاریخ سے دس سال کے لئے ہو گا۔معاہدہ کی معیاد ختم ہونے سے پہلے اگر حلیف حکومتوں میں سے کسی نے درخواست کی تو اس کی تجدید کے لئے گفت وشنید شروع کی جائے گی۔

☆ دستخط کنندگان کو اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے دستخط کرنے کا پورا پورا اختیار دیا گیا ہے اور وہ اپنی مخصوص مہروں کے ساتھ دستخط ثبت کرتے ہیں۔
دوسری طرف امریکہ، برطانیہ، چین اور ولندیزی شرق الہند طاقتوں نے جاپان کی ناکا بندی قائم کر لی۔ جس کے نتیجے میں بڑی سرگرمی کے ساتھ جنگی تیاریوں کا آغاز ہو گیا۔

بم برابر برستے رہے، اس سے کچھ عرصہ پہلے ایسی علامتیں نمایاں ہو گئی تھیں کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن شائد یہ حکومت کی خفیہ پالیسی کا حصہ تھا کہ جاپان کو پرل ہاربر پر بم برسانے کا موقع دیا جائے۔ چھ بج کر پینتالیس منٹ پر ایک امریکی تباہ کن جہاز معمول کے مطابق دیکھ بھال کے لئے مرکز کے باہر چکر لگا رہا تھا کہ اسے ایک جاپانی چھوٹی آبدوز نظر آئی جسے انہوں نے فوراً ڈبو دیا۔ اس جہاز کے آدمیوں میں سے کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ آبدوز کسی بڑی قوت کا ایک حصہ تھی۔
ستمبر 1941ء کے پہلے دو ہفتوں میں جاپان کے بڑے بڑے بحری افسر ٹوکیو کے بحری کالج میں جمع ہوئے تاکہ جزائر ہوائی پر حملے کی تدابیر کے متعلق گفتگو کر لیں۔
اسی دوران ٹوکیو نے کوشش کی کہ امریکی صدر روز ویلٹ بحرالکاہل سے کسی مقام پر ملاقات کے لئے آمادہ ہو جائے۔ جہاں جاپان اور امریکہ کے درمیان مشکلات کے متعلق بات چیت کر لی جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ 5 اکتوبر کو جاپان کا منصوبہ منتخب طیاروں کے پائلٹوں کو بتا دیا گیا۔ اسی روز متحدہ بیڑے کی طرف سے ایک حکم جاری ہوا جس میں حد درجہ خفیہ کاروائی کے لئے تیار رہنے کا ذکر تھا، دو روز بعد دوسرا حکم پہنچا کہ پرل ہاربر پر حملہ منظور ہے۔ دوسری طرف چرچل نے بھی ایک تقریر میں وعدہ کر لیا کہ اگر امریکہ کو جاپان سے جنگ پیش آئی تو ایک گھنٹے کے اندر اندر برطانیہ بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔

17 نومبر کو جنرل ٹوجو کا ایک خاص نمائندہ سان فرانسسکو سے ہوتا ہوا واشنگٹن پہنچا تاکہ جاپانی سفیر کو جو امریکہ میں مامور تھا، امن قائم رکھنے کے لئے آخری کوشش میں مدد دے سکے۔ اس روز ابتدائی گفتگو ہوئی اور جاپانی نمائندے نے سیکرٹری آف سٹیٹ

کے سامنے مطالبات کی ایک فہرست رکھی۔

(1) امریکہ کی طرف سے مالی و اقتصادی پابندی ختم کی جائے۔

(2) چین کو جو اقتصادی اور فوجی امداد دی جا رہی ہے اسے روک کر چین سے بے تعلقی کی پالیسی اختیار کی جائے۔

(3) مان چوکو کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔

(4) جاپان کو ولندیزی شرق الہند سے سامان لینے کی پوری آزادی ہو۔

(5) جاپان نے ''کلاں تر'' مشرقی ایشیا میں خوشحالی کا جو دائرہ تجویز کر رکھا ہے اسے تسلیم کر لیا جائے۔

25 نومبر کو حکومت امریکہ نے سخت جواب کے ساتھ اپنی طرف سے مطالبات پیش کر دیئے۔

(1) جاپان ہند چینی اور چین سے فوجیں ہٹالے۔

(2) چین کے علاقائی استقلال کی مشترکہ ضمانت دی جائے۔

(3) جاپان چین میں چیانگ کائی شک کی قومی حکومت کو تسلیم کر لے۔

(4) بحرالکاہل کی طاقتوں کے درمیان عدم جارحیت کا معاہدہ ہو جائے۔

(5) آئندہ کے لئے جاپان دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات میں قانون ونظم کے قواعد کا پابند رہے۔

(6) جاپان محوری طاقتوں سے اشتراک ختم کر دے۔

گویا جاپانیوں سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ اپنا رخ پیچھے کی طرف موڑ لیں۔ 3 دسمبر کو ایک خفیہ پیغام نشر ہوا ''مشرقی ہوائیں، بارش ہو رہی ہے'' اس کا مطلب یہ تھا کہ جمہوریہ امریکہ میں جاپانی سفارت خانے یا کونصل خانوں کے تمام کارندے اپنے تمام کاغذات تباہ کر ڈالیں۔ 5 دسمبر کو جاپانی بیڑہ تیزی کے ساتھ پرل ہاربر کی طرف بڑھا۔ حیرت زدہ امریکی اس اچانک حملے میں ہر ممکن طریقے سے مقابلہ کرتے رہے۔ ایک گھنٹے میں امریکہ کو اتنا بحری نقصان اٹھانا پڑا جتنا اس نے پوری پہلی عالمی جنگ میں بھی نہیں اٹھایا تھا۔

7 دسمبر کی شام کو روز ویلٹ نے کابینہ کا ایک اجلاس بلایا، اگلے روز کانگرس کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں سینٹ نے بغیر کسی بحث مباحثے کے اعلان جنگ منظور کر لیا۔ چرچل کو بھی کابینہ نے اختیار دے دیا کہ جاپان کے خلاف فوراً اعلان جنگ کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے یورپی ممالک نے بھی اس کی تائید کی البتہ روس ہٹلر کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس لئے اس نے جاپان کے خلاف فوری اعلان جنگ نہ کیا۔ دو روز بعد روز ویلٹ نے قوم سے خطاب کیا اور اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا کہ یہ جنگ صرف انہیں کو زندہ رکھنے کے لئے نہیں کی جا رہی بلکہ اس پر ان تمام روحانی اقوام کی بقاء موقوف ہے جنہیں اہل امریکہ مدت سے اپنائے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ جب ہم قوت سے کام لینے پر مجبور ہوئے ہیں تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ قوت خیر کے حق میں اور شر کے خلاف استعمال کی جائے گی۔ ''ہم اہل امریکہ تخریب کے نہیں بلکہ تعمیر کے عادی ہیں''۔

ایشاغ میں تقریر کرتے ہوئے ہٹلر نے بالشوازم، سرمایہ داری اور یہودیت کی مذمت کی اور کہا کہ امریکہ برطانوی سلطنت پر قبضہ کر لینے کا خواہاں ہے۔ عین اسی وقت اعلان ہو گیا کہ ہٹلر اور مسولینی اپنے اپنے ملکوں کو جاپان کا حلیف بناتے ہیں۔ محوری سلطنتوں کی تابع مملکتوں نے بھی جاپان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر پینتالیس قومیں جو دنیا کی نصف آبادی کی نمائندہ تھیں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر جنگ میں شریک ہو گئیں۔

امریکہ میں پرل ہاربر پر حملے کی وجوہات پر بحث مباحثے شروع ہو گئے۔ روز ویلٹ کے مخالفین کا یہ کہنا تھا کہ جب روز ویلٹ نے علیحدگی پسندوں کی قوت زیادہ دیکھی تو اس نے ایسی چال چلی جس کے نتیجے میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ اس کے ایک اور مخالف کا کہنا تھا کہ وہ قوم کو براہ راست جنگ میں نہیں لے جا سکتا تھا اس نے جھوٹ بول کر اپنا مقصد پورا کر لیا۔ ایک اور مورخ جارج مارجن سٹرن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روز ویلٹ اور اس کے مشیروں پر جو جرم ثابت ہے وہ یہ نہیں کہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہے، وہ یہ ہے کہ انہیں پورا کرنے سے عمداً انکار کرتے

رہے۔ انہوں نے جان بوجھ کر جمہوریہ امریکہ کو جنگ میں دھکیلا اور جاپان کے ساتھ تصادم کے لئے راہ ہموار کی۔ مورخین کے ایک اور گروہ کے سرکردہ رکن ایلمر بارنس نے صاف صاف کہہ دیا کہ روز ویلٹ جانتے تھے کہ جاپان کی طرف سے صلح کی جو شرطیں پیش ہوئی تھیں وہ معقول تھیں اور خلوص پر مبنی تھیں بہ ایں ہمہ انہوں نے شرطیں ٹھکرا کر اور جاپانیوں کو پرل ہاربر پر حملے کے لئے مشتعل کیا۔

پرل ہاربر پر جاپانیوں کی ان فتوحات سے جو نئے اڈے مل گئے ان سے کام لے کر جاپانیوں نے دشمن کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ وہ عموماً زبردست قوت کے ساتھ لڑائی کے اہم مقامات پر نمودار ہوتے، جاپانی فوج کو داخلے اور پھیلاؤ کے حیلے معلوم تھے۔ وہ حوالگی کے بجائے موت کو ترجیح دیتے۔ چاول کے معمولی سے راشن پر گزارا کر لیتے۔ ان کے جسموں پر ایسی تصویریں بنا دی گئی تھیں کہ دور سے یا اوپر سے درختوں کے پتے معلوم ہوتے۔

وہ عام طور پر جانوروں کی آوازیں نکالتے یہی ان کے سگنل تھے۔ جنگل میں گھس جاتے تو کوئی ان کا سراغ نہ لگا سکتا تھا۔ وہ درختوں سے چمٹ کر گھنٹوں بے حس و حرکت کھڑے رہتے اور پھر اچانک مخالفوں پر گولی چلا دیتے یا دستی بم گرا دیتے۔ وہ ربر کا لباس پہن کر دشمن کی صفوں کے عقب میں چلے جاتے اور ایسے مقامات پر نمودار ہو تے جہاں کسی کو ان کا خواب و خیال بھی نہ ہوتا، وہ غیر محتاط فوجوں میں افراتفری مچا دیتے۔ برطانیہ اور امریکہ دونوں نے ابتداء میں جاپانیوں کی جنگی صلاحیت کا ناقص اندازہ لگایا، وہ چین میں جاپانیوں کی ظاہری ناکامیوں سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

جنوری 1942ء کے پہلے ہفتے میں امریکی اور فلپینی فوجیں لوزن سے پسپائی اختیار کرتی ہوئی بتان کی طرف بڑھیں۔ اس دوران نقل و حرکت میں انہیں کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بتان پہنچ کر جاپانی کمانڈار نے میک آرتھر کو پیغام بھیجا کہ مزید خون ریزی غیر ضروری ہے فوجوں کو بچانے کے لئے مشورہ دیا جاتا ہے کہ حوالگی قبول کر لیجئے۔ امریکیوں نے اس کے جواب میں آتشبازی تیز تر کر دی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ مدافعین کے لئے رسد بھی پہنچنا ناممکن ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمیوں نے کتے

،سؤر ، بندر، خچر اور سانپ کھانا شروع کر دیئے یا پھر جنگل میں بعض درختوں کی جڑوں سے پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔

اس وقت اتحادیوں کو اپنے قابل سالار میک آرتھر کی فکر تھی، اس قابل سالار کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ہتھیار ڈال دے یا آئندہ جنگ کے لئے اسے محفوظ کر لیا جائے۔ آخر میک آرتھر کو اس بات کو راضی کر لیا گیا کہ وہ فوج کو جاپانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود وہاں سے نکل آئے کیوں کہ اس کی مشرق بعید کے دوسرے حصوں میں زیادہ ضرورت تھی۔ میک آرتھر نے جنرل وین رائٹ کو فوج کا کمانڈار مقرر کیا جس نے 9 اپریل کو ہتھیار ڈال دیئے۔

امریکی اور برطانوی قوت کے تین اہم مراکز منیلا، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں بھی برطانوی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد جاپانیوں نے برطانوی برما کی طرف پیش قدمی کی جو بدھوں کے مندروں میں بجنے والی گھنٹیوں ،قلیوں اور بیش قیمت جواہرات کی سرزمین تھی۔ اور دوسری عالمی جنگ' میں بے حد اہمیت کی حامل تھی جاپانیوں نے انگریزی فوجوں کو برما سے باہر دھکیل دیا اور برما میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کر لی۔

پرل ہاربر پر حملے کے مہینوں بعد ایک خبر سنائی دی کہ امریکیوں نے ٹوکیو پر بم برسائے ہیں۔ یہ ایک معمولی سا جملہ تھا لیکن اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آنے والے وقت میں کیا ہونے جا رہا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ڈولٹل زمانہ امن میں طیاروں کے ذریعے عجیب و غریب کرشمے دکھاتا تھا اس نے بالادست افسروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ مجھے ٹوکیو پر فضائی حملے کی اجازت دی جائے۔ اس نے خفیہ خفیہ تیاری بھی کر لی۔ زمین پر سفید خط کھینچ دیئے جاتے اور پائلٹ بار بار تھوڑے فاصلے سے اڑنے کی مشقیں کرتے۔ پائلٹوں کے ساتھ سوار ہونے والے افراد نقشوں تصویروں اور سایوں کا مطالعہ کرتے رہتے تاکہ انہیں ٹوکیو پہنچتے ہی اپنے نشانوں کا جلد سے جلد ہی اندازہ ہو جائے۔

ابتدائی منصوبہ یہ تھا کہ جب ٹوکیو چار سو میل دور رہ جائے تو طیارے اڑیں، رات ہی کو حملہ ہو اور علی الصبح چین کے اڈوں پر پہنچ جائیں۔ یہ طیارے 18 اپریل 1942ء کی صبح روانہ ہوئے۔ انہوں نے اچانک بے خبری میں جاپانیوں کو جا لیا۔ ٹوکیو

پہنچتے ہی طیارے درختوں کی سطح پر آ گئے اور تمام نشانوں پر تاک تاک کر نشانے لگائے۔ جاپانی طیارے قریب کے تربیتی مرکز سے اٹھے اور حملہ آوروں کو روکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس کارنامے کے سب سے خطرناک حصے کا تعلق جاپان سے باہر نکلنا تھا۔ تمام طیارے محفوظ واپس تو آ گئے لیکن طوفان میں گھر گئے۔ محفوظ پٹرول ختم ہو گیا مخالف ہوائیں تیز تھیں اوپر تاریکی تھی علاقہ سراسر اجنبی تھا لہٰذا اکثر آدمیوں کے لئے طیاروں سے کود پڑنا ناگزیر ہو گیا۔ آٹھ آدمی جاپان کے علاقے میں گرے اور گرفتار کر لئے گئے اور باقی تمام چین پہنچ گئے۔

پرل ہاربر پر حملے کے بعد دو سال میں جاپان وسیع علاقے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس وسیع علاقے کے بے خرشہ مالک بن جانے کے بعد جاپانیوں نے اپنے اہم جنگی مقامات کے گرد ایسے استحکامات کر لئے تھے جنہیں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ زیادہ تر مشرقی ایشیائی حلقۂ خوشحالی کے اندر وزیر اعظم ٹوجو نے جابجا قومی حکومتیں قائم کر دی تھیں، جو بظاہر آزاد تھیں لیکن حقیقتاً جاپانیوں کے زیر اثر کام کر رہی تھیں۔ یہ کٹھ پتلیوں کی سی حکومتیں اتحادیوں کے خلاف جاپانیوں کو امداد دینے کا وعدہ کر چکی تھیں۔

اتحادیوں کے لئے لازمی تھا کہ جاپان کے اس دفاعی حلقے میں داخلے کا راستہ پیدا کیا جائے۔ یہ کام لمبے اور کثیر المصارف تری و خشکی کے جوابی حملوں کے ذریعے سے انجام پا سکتا تھا۔ اس کی ذمہ داری امریکہ نے قبول کی۔ بحرالکاہل میں امریکہ کے جو کماندار دو سال سے محدود وسائل سے دفاعی جنگ میں مصروف تھے، کبھی کبھی جارحانہ حملے بھی کر لیتے تھے تاکہ انہیں رفتہ رفتہ بڑے حملے کے لئے مرکز مل جائیں۔ فیصلہ یہ تھا کہ پہلے جاپانی حلقے کا بیرونی حصار توڑا جائے، پھر سلطنت کے قلب کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

جنگ کا پورا نقشہ واشنگٹن میں تیار کر لیا گیا اور جنرل میک آرتھر کو جنوبی و مغربی بحرالکاہل کے دائرے میں کماندار اعلیٰ بنایا گیا۔ امیر البحر نمٹز کو بحرالکاہل کے وسیع تر دائرے میں بیڑے کی کمان سونپی گئی۔ جنوبی و مشرقی ایشیا (چین، برما اور ہندوستان) کی کمان مونٹ بیٹن کو سونپ دی گئی۔ جاپانیوں نے بعض مرکزوں کی حفاظت کے اعلیٰ

انتظامات کر لئے تھے ۔ اتحادیوں کا فیصلہ تھا کہ ان پر طیاروں سے بم گرائے جائیں لیکن حملہ نہ کیا جائے ۔ صرف چند مقامات چن لئے گئے تھے جنہیں لے لینے کے بعد جاپان کی ناکا بندی بخوبی ہو سکے اور کم سے کم جانی نقصان اٹھانا پڑے۔

جنوبی و مغربی بحرالکاہل میں جاپانیوں کا کلیدی مرکز ربال نیو برٹن آئی لینڈ میں تھا۔ اس کی حفاظت متعدد چھوٹے چھوٹے مرکزوں کے ذریعے سے ہو رہی تھی۔ امریکیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ربال پر براہ راست حملہ نہیں کریں گے بلکہ اسے ہوائی حملوں سے بیکار بنا دیں گے۔ پھر اسے بیچ میں چھوڑتے ہوئے دوگونہ حملہ کرتے ہوئے جزائر سالومن اور نیوگنی سے آگے نکل جائیں گے۔ فوجیں دشمن کے کمزور مقامات پر حملہ کریں گی اور جاپان کے طاقتور گروہوں کو مختلف گوشوں میں رکھیں گی۔ طیارے ربال کو تباہ کرتے رہیں گے اس طرح جاپانی فوج کا خطرہ ختم ہو جائے گا۔

یہ زبردست پروگرام بڑی بصیرت اور قوت سے پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ اتحادیوں نے جنوبی ، مغربی اور شمالی بحرالکاہل پر حملوں کے لئے دروازے کھول دیئے تھے۔ یہاں جارحانہ اقدام کا مدعا یہ تھا کہ جاپانی سلطنت کے بیرونی حلقوں پر زبردست بری ، بحری اور فضائی حملے کئے جائیں ۔ اتحادیوں کا اولین مقصد جزائر گلبرٹ سے ماکن اور تراوا تھے۔ امریکیوں نے جلوئٹ دوبجے اور اجالین پر حملہ کیا ، ان جزیروں پر سخت آتشگیر مادے کے پندرہ ہزار ٹن گولے گرائے گئے۔ جگہ جگہ بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے ، پھر فوجیں اس جزیرے پر پہلی مرتبہ اتریں ساتھ ہی مہلک ٹینک پہنچے۔ ان جزیروں پر بربادی پھیلا دی گئی کوئی عمارت باقی نہ بچی ، جزیرہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ مگر اس بربادی کے باوجود جاپانیوں کی طرف سے کلدار توپیں اور بندوقیں چلتی رہیں۔ الغرض جاپانی سلطنت کے بیرونی حلقے میں رخنے ڈال دیئے گئے۔

ٹوکیو کے اخباروں میں جاپانیوں کی بہادری ، عظمت و شان اور فتح و ظفر مندی کی کہانیاں جلی حروف میں چھاپی جا رہی تھیں ، لیکن عوام سمجھتے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگر لڑائی میں فتح حاصل ہو رہی ہے تو تباہی و خوفزدگی کیوں ؟ ابتری اور افراتفری کس لئے ؟ سفید فام شیاطین اڑ اڑ کر آتے ہیں اور جاپان کے شہروں کو راکھ بنا کر چلے جاتے

ہیں۔ 1945ء کے اوائل میں جاپان جنگی مساعی برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔اتحادیوں کی ناکا بندی سے تیل،کوئلے ،لوہے ،بکسائٹ اور تمام ضروری جنسوں کی درآمدرک گئی تھی۔نقل وحمل کا وہ پورا جال ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا جو بحرالکاہل پر پھیلا دیا گیا تھا۔جو تجارتی جہاز جاپان جارہے تھے وہ جنوبی بحیرہ چین میں ڈبو دیئے گئے تھے۔سنگا پور انڈونیشیا سے ٹوکیو تک کی شاہراہ کا ایک قدیم مرکز تھا،وہ بھی اب بیکار ہو گیا تھا۔

جاپان کے پاس ساٹھ لاکھ فوج تھی اور اس میں سے زیادہ تر ملک کے اندر تھے۔لیکن بحرالکاہل میں بھی بڑی فوج جگہ جگہ بیکار پڑی تھی اور اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک برسر جنگ قوم نے خودکشی کو سرکاری طور پر ایک فوجی حربے کی صورت میں اختیار کیا اور اپنے جنگجوؤں سے کہا کہ ”لڑائی میں جاؤ تو اس یقین کے ساتھ جاؤ کہ تمہیں مرنا پڑے گا“ مگر یہ حربہ بھی جاپان کو نہیں بچا سکتا تھا۔اس وقت اوکی ناوا پر حملہ ہونے والا تھا کہ جاپان کے وزیراعظم کوئیسو نے شکست سامنے دیکھ کر پوری فوج کو انتباہ کیا ”دس کروڑ ہموطنو! دشمن ہمارے دروازے پر کھڑا ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ کا یہ نازک ترین لمحہ ہے“۔

کوئیسو کی وزارت 5 اپریل 1945ء کو مستعفی ہوگئی۔عین اسی وقت ماسکو نے جاپان کے ساتھ وہ معاہدہ ختم کر دیا جو دس سال کے لئے جارحانہ اقدام نہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔کوئیسو کے جانشینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بیڑے کے باقی تمام اجزاء کو اوکی ناوا پر امریکی حملے کے مقابلے کے لئے بھیج دیں گے۔

جاپانی بڑی بہادری کے ساتھ جنگ میں شریک تھے خاص طور پر جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں نے امریکی افواج کو کافی نقصان پہنچایا۔عین ممکن تھا کہ جاپانی اپنی بہادری کی داستانیں رقم کرتے ہوئے جنگ کا پانسہ پلٹ دیتے اور جنگ مزید طوالت اختیار کر جاتی ۔اوکی ناوا کو جاپان کے جزیروں پر حملے کے لئے آخری مرکز بنا لیا گیا اور نومبر 1945ء کا وقت مقرر کرلیا گیا لیکن اس خونریز حملے کی نوبت ہی نہ آئی اور ایک اور فیصلہ کرلیا گیا۔

24 جولائی 1945ء

بنام جنرل کارل سپائز کمانڈار عام فضائیہ امریکہ

(1) بیسویں فضائی فوج اپنا خاص بم (ایٹم بم) 3 اگست 1945ء کے بعد موسم درست ہونے پر مندرجہ ذیل نشانوں میں سے کسی ایک پر جگہ پھینکے گی، ہیروشیما، گلوزا، نائیگاتا اور ناگا ساکی۔ جو طیارہ یہ بم لے کر جائے گا اس کے ساتھ ایک اور طیارہ ہوگا جو بم پھٹنے کے اثرات کی تفصیلات مرتب کرے گا اور اس طیارے میں محکمہ جنگ کے فوجی اور سول سائنسدان شامل ہوں گے۔ مگر مشاہدہ کرنے والے طیارے بم پھینکنے کی جگہ سے کئی میل دور رہیں گے۔

(2) مزید بم اس وقت حوالے کئے جائیں گے جب عملہ انہیں تیار کرے گا۔

دستخط ہارڈی جنرل جی۔ ایس، ای

عالم انسانیت کی طویل تاریخ میں حد درجہ افسوس ناک اہمیت کے حامل، بے حد خفیہ اور غیر معمولی کارنامے کے لئے سرگرمی شروع ہوگئی۔ ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹمی بموں کے ناقابل یقین نقصان نے جاپان کو شکست تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ عالم انسانیت اس واقعے سے اس قدر متاثر ہوا کہ عالمی جنگ کا انجام بھی ثانوی حیثیت کی خبر بن کر رہ گیا۔

امریکی صدر ٹرومین نے جنگ کے سیکرٹری ہنری سٹمسن کو ایٹمی بم کے پورے پروگرام کا ذمہ دار بنایا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عام نقصان کے باوجود جاپانیوں کو حوالگی پر مجبور کرنے کے لئے ایک دہشت انگیز حربہ استعمال کرنا ضروری ہوگا اور ایٹم بم ہی یہ کام انجام دے سکتا تھا۔ سائنسدانوں کی جس کمیٹی نے یہ بم بنایا تھا اس نے سفارش کی کہ اسے فوراً استعمال کیا جائے اور ایسے نشانے پر استعمال کیا جائے جہاں اس کی تباہ کاری زیادہ واضح ہو۔ یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ جاپانیوں کو آگاہ کرنے کے لئے کسی بے آباد جزیرے پر بم کی قوت کا مظاہرہ کیا جائے۔

سائنسدانوں نے یہ تجویز رد کر دی اور کہا کہ اس سے جنگ ختم نہیں ہوگی، لہٰذا اسے براہ راست نشانے پر استعمال کیا جائے۔ بم استعمال کرنے کا آخری فیصلہ صدر ٹرومین پر چھوڑ دیا گیا۔ صدر کے انسانیت دشمن مشیروں نے اس کے استعمال کا مشورہ دیا

اور پھر ٹرومین نے چرچل سے مشورہ طلب کیا تو اس نے کہا ''میں جنگ کو جلد ختم کرنے کے لئے اس کے بے تکلف استعمال کا حامی ہوں'' چنانچہ ایٹم بم کے استعمال کی وحشیانہ اور انسانیت سوز کاروائی کا فیصلہ کرلیا گیا۔

ہیروشیما میں سب کچھ طبعی حالت پر جاری تھا۔شہر کی آبادی تین لاکھ پینتالیس ہزار تھی۔پیر کا دن ،صبح کا وقت اور اگست 1945ء کی چھٹی تاریخ تھی ،جب ٹو بی۔29 پرواز کرتے ہوئے شہر پر پہنچے تو ہوائی حملے کا اعلان ہوا،جیسا کہ معمول تھا۔لوگ بھاگے دوڑے کام پر جارہے تھے،حملے کا اعلان ہوتے ہی وہ فضائی پناہ گاہوں کی طرف دوڑے۔پھر حملے کے خاتمے کا اعلان ہوگیا تو وہ باہر نکلے ،عین اس وقت اینولا گے میں سے ایک سیاہی مائل چیز زمین کی طرف گری۔یکا یک آنکھیں چندیا دینے والی روشنی نمودار ہوئی جو سورج سے بھی زیادہ تیز تھی اور یہ روشنی پورے شہر پر چھا گئی۔ایک لمحے کے لئے موت کی سی خاموشی طاری رہی،پھر شہر کے وسط میں ایک ایسا دھماکہ ہوا جس سے زمین لرز گئی۔اس کے دائرے میں جو چیز آئی ملبے اور خاک کا ڈھیر بن گئی۔پائلٹ ٹبٹس نے فوری اثر کی کیفیت یوں بیان کی:

> ''ہم بم پھینکتے ہی چکر لگا کر مڑے تاکہ دھماکے کی لہروں سے نکل جائیں ،جب یہ لہریں ہمارے طیارے تک پہنچیں طیارہ اس طرح ہلا جیسے ٹین کی چھت ہلتی ہے۔ہم دھوئیں کے بادل سے تقریباً ایک میل دور تھے لیکن اسے کھولتا ہوا دیکھ رہے تھے اس میں سے کئی مختلف رنگ پیدا ہوئے ۔۔۔نارنجی نیلا اور بادامی ۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تارکول کا پیپا کھول رہا ہے۔ہم شہر کو بالکل نہ دیکھ سکے کیوں کہ گردوغبار کی ایک دبیز تہہ اوپر چھا گئی جو حصہ تباہ ہوا وہ گردوغبار کے ایک طوفان کی آغوش میں تھا۔چند لمحوں میں شہر تباہ ہوگیا اس کے مرکز میں ہر جاندار شے اس طرح جل گئی کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔''

اسی پر بس نہیں تین روز کے بعد ایک اور بم جاپان پر پھینکا گیا یہ اتنا طاقتور

تھا کہ پہلا بم اس کے مقابلے میں ناقابل توجہ تھا۔ یہ بم جزیرہ کیوشو کے شہر اور ریلوے کے آخری مرکز ناگاساکی پر پھینکا گیا۔ جس کی آبادی اڑھائی لاکھ تھی۔ بہ اعتبار آبادی یہ ہیروشیما سے کم تھا لیکن بحرالکاہل میں جاپان کی فوجی اور بحری کاروائیوں کے لئے رسد کی بڑی بندرگاہ تھی یہاں جنگی اور تجارتی جہاز بھی بنتے تھے اور مرمت ہوتے تھے۔ اس دھماکے نے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی بھی چیز اس وقت کو نہیں روک سکتی تھی جو امریکہ کی کارگاہوں میں تیار ہوئی تھی۔ اگر جنگ جاری رہی تو جاپان کو روئے زمین سے محو کر دیا جائے گا۔

چنانچہ 2 ستمبر 1945ء کو اتوار کے دن کو حوالگی کی رسم ایک امریکی جہاز مسوری پر عمل میں آئی جو خلیج ٹوکیو میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گویا ایک بہت بڑی رسم کے لئے سٹیج تیار ہو چکا تھا۔ جاپانی وفد کے نو ارکان تین رسمی لباس اور اونچی ہیٹوں میں اور چھ وردی میں جہاز پر پہنچائے گئے، موروشجا مٹسو وزیر خارجہ جاپان وفد میں سب سے آگے تھا۔ انہیں بالائی عرشے کی ایک میز پر پہنچا دیا گیا جس پر حوالگی کی دستاویز کی دو نقلیں موجود تھیں۔ ایک سنہری حروف میں تھی اور دوسری سیاہ حروف میں۔ شجا مٹسو نے دونوں دستاویزات پر دستخط کئے، پھر جنرل امیزو جو شہنشاہ جاپان کا ذاتی نمائندہ تھا، نے دستخط کئے۔ یہ ہو چکا تو جنرل میک آرتھر نے اپنے دو ساتھیوں سے درخواست کی کہ میرے ہمراہ چلیں اور دستخط کر دیئے۔

جنرل میک آرتھر نے دستخط کے لئے پانچ قلم استعمال کئے، پہلے دو چاندی کے تھے۔ پھر اتحادی قوموں کے نمائندوں نے دستاویزوں پر مزید دستخط کئے جس کے بعد جنرل میک آرتھر نے کاروائی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ یہ رسم ادا ہو چکی تو چار سو چھتیس اڑن قلعوں نے ٹوکیو پر پرواز کی تاکہ جاپانیوں پر امریکی فضائی قوت کا مزید مظاہرہ ہو جائے۔ عین اسی وقت بیالیس جہازوں کا ایک قافلہ خلیج ٹوکیو میں داخل ہوا اور رات ہونے سے پیشتر تیرہ ہزار فوج اتار دی تاکہ پہلے سے اتری ہوئی بیس ہزار فوج میں اضافہ ہو جائے۔ وہائٹ ہاؤس سے صدر ٹرومین نے ریڈیو کے ذریعے اہل امریکہ کو بلا شرط ہتھیار ڈال دینے کی خبر سے آگاہ کیا اور 2 ستمبر 1945ء کا دن یوم فتح قرار پایا۔

دو روز بعد شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے شنتو کے معبد میں عبادت کر چکنے کے بعد شاہی محل کے بیرونی حصے سے اپنی قوم کو ہدایت کی کہ جو شرطیں قوم مان چکی ہے انہیں پورا کر کے دنیا کا اعتماد حاصل کیا جائے اور تمام جاپانی جنگی کمان داروں کے نام فرمان جاری کیا کہ جنگ روک دی جائے اور ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔ 8 ستمبر کو امریکی پرچم ٹوکیو پر لہرا دیا گیا۔

جاپان کے شکست نامہ کا متن اس طرح ہے:

☆ ''ہم شہنشاہ جاپان، جاپانی حکومت اور جاپان کے امپیریل جنرل ہیڈ کوارٹر کے با اختیار نمائندے 26 جولائی 1945ء کو پوٹسڈم کے مقام سے جاری کردہ امریکہ، چین اور برطانیہ کے اس مشترک اعلامیہ کی شرائط تسلیم کرتے ہیں جس سے روس نے بھی بعد میں اپنی وابستگی کا اعلان کر دیا اور اب یہ اعلامیہ اتحادی طاقتوں کے اعلامیہ کے نام سے موسوم ہے۔

☆ ہم جاپانی افواج اور جاپانی عوام کو حکم دیتے ہیں کہ وہ فوراً اپنی تمام اشتعال انگیز کاروائیاں ختم کر دیں۔ بحری جہازوں، طیاروں، فوجی اور غیر فوجی جائیدادوں کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھیں اور ان احکامات کی پابندی کریں جو اتحادیوں کے سپریم کمانڈر یا حکومت جاپان کی طرف سے جاری کیے جائیں۔

☆ ہم جاپان کے امپیریل جنرل ہیڈ کوارٹر کو حکم دیتے ہیں کہ وہ تمام جاپانی افواج اور جاپان کی ماتحتی میں لڑنے والی افواج کے کمانڈروں کو بلا تاخیر ہتھیار ڈالنے کے احکام جاری کریں۔

☆ ہم سول حکام اور بحر و بر کی افواج کے حکام کو حکم دیتے ہیں کہ اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر کی طرف سے یا اس کی نیابت میں جو احکامات دیئے جائیں ان کی اطاعت کی جائے اور انہیں نافذ کر کے شکست کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

☆ ہم تمام حکام کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی جگہ برقرار رہ کر اپنے غیر فوجی فرائض بدستور انجام دیتے رہیں تاوقتیکہ انہیں اتحادی سپریم کمانڈر یا اس کے

نائب خاص حکم کے ذریعے عہدہ سے سبکدوش کر دیں۔

☆ ہم شہنشاہ جاپان، حکومت جاپان یا ان کے جانشینوں کی طرف سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم پوسٹڈم کی شرائط پر نیک نیتی سے عمل کریں گے اور پوسٹڈم کے اعلامیہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں اتحادی سپریم کمانڈر یا اس کے نامزد کردہ نمائندوں کی مرضی کے مطابق احکام جاری کریں گے اور عملی اقدامات کریں گے۔

☆ ہم حکومت جاپان اور جاپان کے امپریل جنرل ہیڈ کوارٹرز کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اتحادیوں کے جنگی قیدیوں اور زیر حراست شہریوں کو فوراً رہا کر کے ان کے تحفظ اور نگہداشت کے انتظامات کریں اور انہیں جہاں پہنچانے کی ہدایت کی جائے انہیں پہنچائیں۔

شہنشاہ جاپان اور جاپان حکومت کے حقوق حاکمیت اتحادی سپریم کمانڈر کے تابع ہوں گے۔ جو شکست کی شرائط کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی کے مطابق اقدامات کرے گا۔

دستخط کنندگان:

(1) مامارو شیلے متسو (شہنشاہ اور حکومت جاپان کی طرف سے)

(2) یوشی جیرو یومیزو (جاپانی امپریل جنرل ہیڈ کوارٹر کی طرف سے)

اس معاہدے پر 2 ستمبر 1945ء کو مذکورہ بالا جاپانی نمائندوں نے دستخط کئے اور امریکہ، برطانیہ، چین اور روس کے حسب ذیل نمائندوں نے اسے قبول کر کے دستخط کئے۔

(1) ڈگلس میکا تھر (اتحادی سپریم کمانڈر)

(2) سی ڈبلیونمٹز (امریکی نمائندہ)

(3) ہسو یونگ چانگ (چینی نمائندہ)

(4) بروس فریسر (برطانوی نمائندہ)

(5) لیفٹیننٹ جنرل کے ڈیریو یانکو (روسی نمائندہ)

جاپان سے معاہدہ امن 8 ستمبر 1951ء کو ہوا۔ جاپان کے ساتھ معاہدہ امن میں تاخیر کا سبب وہ نظریاتی کشمکش قرار دی جا سکتی ہے جو سوویت یونین اور امریکہ کے

درمیان شروع ہو چکی تھی۔ سوویت یونین جاپان کے مقبوضات میں اپنا حصہ چاہتا تھا اس سلسلے میں امریکہ کا موقف نفی میں تھا کیوں کہ سوویت یونین نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں تاخیر کی تھی، بلکہ سوویت افواج نے جاپان کے ہتھیار ڈالنے سے صرف دو روز قبل جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ اسی لئے امریکہ کا کہنا تھا کہ مراعات کے لئے سوویت یونین کو دور ہی رہنا چاہئے۔

تاخیر کی ایک وجہ جنگ کوریا بھی قرار دی جا سکتی ہے کیوں کہ یہ معاہدہ اس دوران ہوا جب جنگ کوریا جاری تھی۔ جاپان کی شکست بنیادی طور پر امریکہ کے خانے میں لکھی گئی تھی اگرچہ جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشاورتی کمشن قائم کیا جا چکا تھا، جس کا کام مستقبل میں جاپان سے ہونے والے معاہدہ امن کی شرائط اور جاپان کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود تھی کہ امریکی جنرل میک آرتھر (جو دوسری جنگ عظیم میں بحرالکاہل میں اتحادی فوج کی کمان کر رہا تھا) جاپان کے حوالے سے حقیقی کرتا دھرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جاپان میں سوویت یونین افواج موجود نہیں تھیں بلکہ وہ صرف جاپانی مقبوضہ علاقے شمالی کوریا میں موجود تھیں۔

الغرض عالمی طاقتوں کے نظریاتی اختلافات اور جنگ کوریا کے اٹھتے شعلوں کے سائے میں امریکی حکومت نے اتحادیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سان فرانسسکو میں اکیاون ممالک کی کانفرنس بلائی۔ ان ممالک میں ارجنٹائن، آسٹریا، بلجئم، بولیویا، برما، کیوبا، ڈومینکن ریپبلک، اکواڈور، مصر، ایل سلواڈور، ایتھوپیا، فرانس، یونان، گوئٹے مالا، ہیٹی، ہنڈراس، انڈونیشیا، ایران، عراق، بھارت، لاؤس، لبنان، لائبیریا، لکسمبرگ، میکسیکو، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، نکاراگوا، ناروے، پاکستان، پانامہ، پیرو، جمہوریہ فلپائن، سعودی عرب، شام، ترکی، یونین آف ساؤتھ افریقہ، برطانیہ، امریکہ، یوراگوئے، وینزویلا، ویت نام اور جاپان شامل تھے۔ سوویت یونین کی شمولیت نہ ہونے کی وجہ سے اشتراکی بلاک نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ اس کی عدم توثیق کرنے والے چار ممالک میں بھارت سرفہرست تھا۔ کانفرنس 4 تا 8 ستمبر 1951ء تک جاری

رہی۔ کانفرنس میں کل 27 دفعات اور 7 ابواب پر مبنی معاہدہ امن مسودہ پیش کیا گیا۔

یہ کانفرنس صرف مسودے کے اجراء اور معاہدے کی توثیق کے لئے بلائی گ[illegible] تھی، معاہدے کی شرائط پہلے سے طے شدہ تھیں۔ یہ شرائط کس نے طے کی تھیں اس بارے کسی شریک ملک نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

معاہدے کی دفعات کے مطابق جاپان کو کوریا کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ جاپان کوئل پورٹ، پورٹ ہملٹن اور ڈیگلیف کے کوریائی جزائر سے دستبردار ہوا، اس کے علاوہ وہ فارموسا، پیکاڈورز، کورائلزائر (1905ء کی جنگ روس اور جاپان کے بعد سے جاپانی قبضے میں رہنے والا علاقہ) اور سخالین کی بندرگاہ سے بھی دستبردار ہوا۔ اینٹارکٹک کا علاقہ اسپراٹلی اور پاراسیل کے جزائر اقوام متحدہ کے ابتدائی نظام کے تحت دے دیئے گئے اور بحرالکاہل کے علاقوں سے بھی جاپان نے اپنے حقوق ختم کئے۔

جاپان نے غیر جانبدار عناصر اور جنگی قیدیوں کی سہولت کے لئے اپنی تمام غیر ملکی جائیدادوں سے دستبرداری اختیار کر کے انہیں بین الاقوامی ریڈ کراس کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ جاپان کی صنعت کے مرکز زیتیسو پر پابندی عائد کر دی گئی (یہ علاقہ صنعت اور اسلحہ کے حوالے سے پوری دنیا میں ایک اہم نام تھا) معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ جاپان مہلک ہتھیار نہیں بنائے گا اور بڑی فوج بھی تیار نہیں کرے گا بلکہ محدود فوج رکھے گا۔

معاہدے کے تحت ایک جنگی ٹریبونل کے ذریعے زمانہ جنگ میں اعلیٰ سرکاری اور فوجی عہدوں پر فائز لوگوں میں سے بعض کو سزائے موت سنائی گئی اور اکثر پر سیاست سے دور رہنے کی پابندی لگائی گئی۔ جاپان کا اقتصادی، سیاسی، معاشرتی حوالوں سے ترقی کا کام کلی طور پر امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی معاہدے کی رو سے معاہدے کے فوراً بعد امریکہ نے جاپان کے ساتھ امن و سلامتی کا ایک معاہدہ کیا جو اب تک برقرار ہے۔ اسی معاہدے کے تحت امریکہ نے جاپان میں فوجیں رکھنے کے حق کو قانونی طور پر تسلیم کرایا۔

اس معاہدے کے تحت جاپان نے یہ بھی عہد کیا کہ امریکی اجازت کے بغیر کسی

اور طاقت کو جاپان عسکری اور فوجی نوعیت کی تنصیبات کی اجازت نہیں دے گا اور صرف امریکہ کو جاپان میں اپنے فوجی رکھنے اور اڈے قائم کرنے کا حق ہوگا۔اس طرح جاپان امریکہ کا طفیلی ملک بن کر رہ گیا۔معاہدے پر توثیق کرنے والے تمام ممالک کے نمائندوں نے دستخط کئے جاپان کی طرف سے اس کے وزیراعظم یوشیدا شی گیرو نے دستخط کیے اور معاہدے کی اصل دستاویز امریکہ کے حوالے کی گئی۔اس کی مصدقہ نقول تمام ممالک کو دی گئیں۔

اقوام متحدہ کا قیام

دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی طاقتوں نے دنیا کو جنگوں اور تباہی سے بچانے، بین الاقوامی تنازعات کو بات چیت سے حل کرنے اور دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لئے اس ادارے کا قیام عمل میں لانے کے بارے میں سوچا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی تباہ کاریوں اور خصوصاً دو عالم گیر جنگوں میں ہونے والی ہلاکتوں اور اربوں روپے کی املاک کی تباہی کے بعد اقوام عالم نے ایک تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا جس کا نام ''اقوام متحدہ'' رکھا گیا۔

سان فرانسسکو میں ہونے والی کانفرنس میں اس کے منشور پر دستخط کر کے اسے تسلیم کر لیا گیا۔ اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن اقوام متحدہ میں تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی بنیاد پر تسلیم کیا جائے۔ ریاستوں کے درمیان اختلافات کو ختم کر کے امن وسلامتی اور بھائی چارے کی فضا کو سازگار بنایا جائے۔ قوموں کے درمیان اسلحہ کی دوڑ کو ختم کر کے بھوک اور بیماری کے خلاف جنگ اور اقتصادی ترقی اور انسانی حقوق و آزادی کو اجاگر کر کے انسانیت کی فلاح و بہبود کی جائے۔

اقوام متحدہ کی تشکیل کئی مراحل سے گزرنے کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس ضمن میں سب سے پہلا قدم 12 جون 1941ء کا اعلان لندن ہے جس میں برطانیہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کئی جلاوطن حکومتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ موثر طریقہ سے امن بحال کرنے کی صحیح بنیادیں دنیا کے آزاد افراد کے باہمی تعاون کی خواہش پر ہیں جس سے حملوں کے خطرات سے نجات مل جائے گی اور سب کو معاشی اور سماجی تحفظ حاصل رہے گا۔ اس اعلان کے دستخط کنندگان نے یہ تسلیم کیا کہ جنگ اور امن کے زمانہ میں باہمی تعاون، بھائی چارہ اور مل

جل کر اجتماعی طریقوں سے کام کیا جائے تاکہ اعلان لندن کے ذریعہ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

اقوام متحدہ کی تشکیل کے سفر کی جانب دوسری کاوش منشور اوقیانوس کی ہے جس پر 14 اگست 1941ء کو امریکہ کے صدر روز ویلٹ اور برطانیہ کے چرچل نے دستخط کیئے اس اعلان میں کہا گیا کہ دونوں حکومتیں حملہ آوری کی مذمت کرتی ہیں اور اس پر یقین رکھتی ہیں کہ عوام کو اپنی پسندیدہ طرز حکومت اپنانے کا پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ نیز ان کی خواہش یہ ہے کہ تمام اقوام معاشی میدان میں ان سے تعاون کریں۔ منشور میں اس توقع کا بھی اظہار کیا گیا کہ نازیوں کی مکمل تباہی کے بعد تمام ریاستوں کو اپنی سرحدوں کے اندر امن امان بحال کرنے اور محنت کش طبقہ کا معیار بلند کرنے کا موقع ملے گا۔

اس کے بعد یکم جنوری 1942ء کو 26 ریاستوں کے نمائندوں کی جانب سے واشنگٹن میں اعلان اقوام متحدہ کیا گیا، اس میں منشور اوقیانوس میں طے کردہ اصولوں کے تحت یہ عہد کیا گیا کہ دشمن کے خلاف اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لایا جائے گا۔

پھر اس کے بعد 30 اکتوبر 1943ء کو برطانیہ، امریکہ اور روس کے نمائندے ماسکو میں جمع ہوئے اور باہمی طور پر اعلان کیا گیا جس میں عام بین الاقوامی تنظیم کے قیام کی ضرورت پر زور دیا گیا تاکہ اعلان کے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جائے جس کی بنیاد امن سے محبت کرنے والی ریاستوں کی مساوات اور اقتدار اعلیٰ کے اصول پر ہونی چاہیئے۔ مختلف اقوام بغیر کسی رقبہ اور حیثیت کی تمیز کے اس ادارہ کی رکن بن سکیں۔ اس کے دو ماہ بعد امریکہ کے صدر روز ویلٹ، برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل اور روس کے وزیر اعظم سٹالن نے تہران کے اجلاس 1943ء میں شرکت کی اور یہ اعلان کیا گیا کہ انہیں یقین ہے کہ وہ امن بحال کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ڈمبارٹن اوکس کانفرنس اقوام متحدہ کے قیام میں بڑی اہمیت کی حامل ہے یہ کانفرنس دسمبر 1944ء کو برطانیہ، امریکہ اور روس کے نمائندوں کے درمیان ہوئی۔ واشنگٹن کی عمارت جو ڈمبارٹن اوکس کے نام سے مشہور ہے اس میں منعقدہ

کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مشہور اوقیانوس، ماسکو اور تہران کے اعلانات پر عمل درآمد کیا جائے اور عملی اقدامات اٹھائے جائیں۔ طویل بحث کے بعد اقوام متحدہ کا عکس ظہور پذیر ہوا اس کانفرنس میں عالمی امن کی حفاظت کی خاطر یہ طے کیا گیا کہ سلامتی کونسل کو تشکیل دیا جائے اور اس میں پانچ بڑی طاقتوں کو مستقل نمائندگی ملنی چاہئے لیکن کونسل میں رائے شماری کی بابت کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔

فروری 1945ء میں سوویت یونین میں یالٹا کے مقام پر ایک اہم کانفرنس ہوئی جس میں برطانیہ، امریکہ اور روس کے سربراہان کے علاوہ وزرائے خارجہ اور فوج کے سربراہان نے شرکت کی۔ اس میں عالمی تنظیم کے تصوراتی خاکے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ 25 جون 1945ء کو ایک کانفرنس بلائی جائے۔ یہ کانفرنس 25 اپریل سے 26 جون 1945ء تک جاری رہی، جس میں 51 ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس میں اقوام متحدہ کا منشور اور بین الاقوامی عدالت انصاف کے قوانین مرتب کیے گئے جنہیں اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ مندوبین کی جانب سے اقوام متحدہ کے چارٹر کی توثیق کے بعد 24 اکتوبر 1945ء کو اقوام متحدہ کے قیام اور لیگ آف نیشنز کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

اقوام متحدہ کے منشور اور اغراض و مقاصد کی توثیق ابتداء میں اکیاون ممالک نے کی۔ اراکین کے محدود ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم میں جن ملکوں نے محوری (جرمنی، اٹلی اور جاپان) طاقتوں کا ساتھ دیا تھا ان کی فوری شرکت ممکن نہ تھی۔ براعظم امریکہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے علاوہ میکسیکو اور جنوبی امریکہ کی چند ریاستیں، ڈومینکن ریپبلک وغیرہ تھیں۔ جہاں تک افریقہ کا تعلق ہے تو اس وقت اس براعظم میں آزاد ریاستوں کی تعداد محض چار تھی۔ (مصر، لائبیریا، ایتھوپیا، اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت) باقی علاقے فرانس، بیلجیم اور برطانیہ کے غلام تھے۔ ایشیا میں ہندوستان اور فلپائن بالترتیب برطانیہ اور امریکہ کے زیر نگیں تھے، جہاں اسوقت نیم خودمختار حکومتیں قائم تھیں۔

اس کے بعد جو ممالک غیر ملکی ... سے آزادی حاصل کرتے گئے وہ اقوام

متحدہ کے رکن بنتے گئے۔اس طرح اب تک رکن ممالک کی تعداد 191 تک پہنچ چکی ہے۔سوئٹزرلینڈ اور تے مور رکنیت حاصل کرنے والی آخری ریاستیں تھیں جنہوں نے ستمبر 2002ء میں رکنیت حاصل کی۔اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 7 اقوام متحدہ کے اداروں سے متعلق ہے جس کے مطابق اقوام متحدہ کے چھ بنیادی ادارے ہیں۔

(۱) جنرل اسمبلی (۲) سلامتی کونسل (۳) اقتصادی وسماجی کونسل

(۴) امانتی کونسل (۵) بین الاقوامی عدالت انصاف (۶) سیکرٹری ایٹ

اقوام متحدہ کا کردار

جہاں تک اقوام متحدہ کے عالم گیر کردار کا تعلق ہے تو یہ ادارہ اپنے پر کشش منشور و دیگر لوازمات کے باوجود عالمی طاقتوں کے لئے ایک ڈھال سے کم نہیں۔ اس ادارے کا سب سے اہم مقصد انسانیت کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانا اور اس کی ترقی وخوشحالی کو فروغ دینا ہے۔کسی بھی ادارے کی افادیت کو اس کے مقاصد اور اس کی کامیابیوں کی کسوٹی ہی پر جانچا جاتا ہے۔اقوام متحدہ نے گذشتہ ساٹھ برسوں میں قیام امن کے سلسلے میں جو کوششیں کیں ہیں وہ بلا شبہ ایک اور عالمی یا ایٹمی جنگ کو ٹالنے کے لئے تو مفید ثابت ہوئی ہیں لیکن بڑے بڑے علاقائی تنازعات کو طے کرانے اور چھوٹی قوموں کو حق خودارادی کو بحال کرانے میں اسے خاطر خواہ کامیابیاں حاصل نہیں ہوئیں۔نتیجتاً علاقائی جنگوں کے چھڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔

سوویت یونین کی تحلیل اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ نے اقوام متحدہ کے ادارے پر اپنا مزید سیاسی ،معاشی اور نفسیاتی اثر بڑھاتے ہوئے اسے زیادہ متحرک کر دیا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ عملی طور پر اس کی کمان امریکہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو بے جا نہ ہوگا۔موجودہ حالات کے تناظر میں یونائیٹڈ نیشنز اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے فیصلوں میں فرق تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے کیوں کہ نیویارک میں اقوام متحدہ

کے ہیڈکوارٹر کی موجودگی کے علاوہ اپنے استعماری کردار کی وجہ سے امریکہ نے عالمی ادارے کو داشتہ آید بکار جیسا ادارہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اس کی قرار دادوں کی آڑ لے کر اپنے دشمنوں پر چڑھ دوڑتا ہے۔ اب امریکی تھنک ٹینک یہ طے کر چکا ہے کہ ہر بین الاقوامی تنازعہ کو اپنے مفادات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے امریکہ کو براہ راست ملوث کرنے کی بجائے اقوام متحدہ کو علامتی طور پر سامنے رکھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں امریکہ بین الاقوامی معاملات میں اقوام متحدہ کو امریکی خارجہ پالیسی اور دفاعی پالیسی کو عملی شکل دینے کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

اقوام متحدہ کی نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں تو اس کی کارکردگی کو اس کے قیام کے اغراض ومقاصد سے ہم آہنگ قرار دینے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ نے بہت سے بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طور پر حل کرانے میں قابل قدر اور قابل ذکر کامیابی حاصل کی ہے لیکن بہت سے ایسے معاملات تھے جنہوں نے شکوک وشبہات پیدا کئے اور بہت سے ایسے مسائل و تنازعات ہیں جو ہنوز سرد خانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ کی قرار دادوں میں موجود ہونے کے باوجود مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں کشیدگی کا باعث بنے ہوئے ہیں، لیکن اقوام متحدہ کی حیثیت خاموش تماشائی سے زیادہ نہیں۔

دوسری طرف اقوام متحدہ کی قراز دادوں پر فوری عمل کی بڑی مثالیں افغانستان پر امریکی چڑھائی اور اس سے قبل عراق کے خلاف عائد اقتصادی پابندیوں سے دی جا سکتی ہیں۔ تقریباً ایک عشرہ قبل پرتگال نے انڈونیشیا سے مشرقی تیمور کی آزادی کی قرارداد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کی تھی اور صرف چند سالوں کے بعد یہ قرار داد جب اقوام متحدہ میں منظور کر لی گئی تو کچھ ہی عرصے بعد ریفرنڈم کے ذریعے مشرقی تیمور کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا یہ ادارہ صرف اہل مغرب اور ان کے حواریوں کی دادرسی کے لئے بنایا گیا تھا؟ کیا دوسرے خطوں

کے مسائل اس زمرے میں نہیں آتے؟ ستم تو یہ ہے کہ یہ سب کارگزاریاں اقوام متحدہ کی چھتری تلے ہوئی ہیں۔ جنگ کوریا ہو یا جنگ ویت نام اقوام متحدہ نے ہمیشہ زور آور کو دفاعی اور اخلاقی امداد فراہم کی۔ برطانیہ کوسوں دور جزیرہ فاک لینڈ اور جبرالٹر میں گھس کر حکم رانی کر سکتا ہے لیکن اگر خلیج کی جنگ میں عراق کویت میں داخل ہو جاتا ہے تو اقوام متحدہ اس کے خلاف پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔

یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد امریکہ کا باقاعدہ شرائط پر مبنی عراق سے کوئی امن معاہدہ نہیں ہوا بلکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی 2 مارچ 1991ء کی قرار داد نمبر 686 جو سلامتی کونسل کے 2978ویں اجلاس میں پیش کی گئی تھی کے مطابق بہ ظاہر تمام شرائط ناگوار یا ناقابل عمل نہیں تھیں لیکن اس کی پہلی شرط کہ عراق سلامتی کونسل کی تمام قرار دادوں کا پابند ہوگا ایسا مبہم فیصلہ تھا جس کی بنیاد پر امریکہ اور اس کے حواری عراق پر سخت سے سخت پابندیاں عائد کرواتے چلے گئے۔ اس کے بعد پھر عالمی رائے عامہ اقوام متحدہ وسلامتی کونسل کی مخالفت کے بعد بھی امریکہ ایک مرتبہ پھر عراق پر جھوٹے الزام لگا کر چڑھ دوڑا اور بے گناہ شہریوں کے قتل عام اور ان کی تذلیل کا مرتکب ہوا اس دوران کوفی عنان نے جس مجرمانہ خاموشی کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ افغانستان پر ہونے والی جارحیت نے بھی تیسری دنیا کے ملکوں کو مایوس کیا۔ اس ادارے کا نام اقوام متحدہ ہے لیکن اس ادارے میں اقوام کی حیثیت ان ہاریوں کی سی ہے جن پر گنتی کے چند وڈیروں کی بادشاہی مسلط ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی ہوس زر اور ہوس زمین نے دنیا کی اکثریت کو بھیانک غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہتر مستقبل کے نام پر انسان انتہائی ذلت آمیز زندگی اپنانے پر مجبور ہے۔ کروڑوں انسان علم کی دولت سے محروم ہیں، اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کے مطابق 113 ملین بچے کبھی سکول گئے ہی نہیں اور مزید 150 ملین بچے بنیادی تعلیم میں مہارت حاصل کرنے سے قبل ہی اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔

آج دنیا کی چھ ارب آبادی میں سے سوا ارب افراد بے روزگار ہیں،

غذائی قلت، افلاس، بیماری اور بھوک سے ہر روز بیالیس ہزار انسان دم توڑ رہے ہیں۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عالمی فلاح و بہبود کے ادارے کی موجودگی کے باوجود آج کے ترقی یافتہ دور میں جہاں ایک ملک کھربوں روپے کا اسلحہ ایک ماہ میں تیار کرتا ہے، جہاں استعمال سے زائد گندم ضائع کر دی جاتی ہے، وہیں دوسری طرف کئی ممالک میں لاکھوں ذی روح پیٹ کی آگ بجھانے کی کش مکش میں دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔

عالمی مالیاتی اداروں نے پوری دنیا کے غریب ممالک کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) اور ورلڈ بینک غریب ممالک کو صرف قرضے نہیں دیتے بلکہ ''مفید'' مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔ اس وقت تقریباً 150 ممالک کی معیشت پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کے مطابق تمام انسان یکساں ہیں اور اس بات کے حق دار ہیں کہ انہیں بلا امتیاز تمام انسانی مساوی حقوق ملیں لیکن اقوام متحدہ کی موجودگی کے باوجود حقوق کی پامالی، انسانوں کے سفاکانہ قتل اور اجتماعی قبروں میں ان کی تدفین کی بے شمار داستانیں بکھری پڑی ہیں۔

بہر کیف یہ عالمی ادارہ نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بنیادی سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل سے نمٹنے میں ناکام رہا ہے۔ عسکری ماہرین کے مطابق 1945ء سے اب تک دنیا میں سو سے زائد خوفناک جنگیں ہو چکی ہیں جن میں مجموعی طور پر نو کروڑ کے قریب لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اس وقت بھی دنیا کے 68 ممالک میں جنگیں اور سرحدی جھڑپیں جاری ہیں، 46 بڑے تنازعات پر ہر سال ایک سو ملین ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ کاش یہ وسائل جو ہتھیاروں اور جنگوں پر صرف ہو رہے ہیں دنیا کے معاشی مسائل کے حل کے لئے بروئے کار لائے جائیں۔ اے کاش۔۔۔۔

------☆------

امریکہ اور روس کے درمیان معاہدے

نیٹو اور وارسا پیکٹ (1949ء)

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اپنی تمام مقبوضات سے ہاتھ دھو چکنے کے بعد اپنی ہی سرزمین تک محدود ہو کر رہ گیا اور عالمی سیاست کا محور و مرکز امریکہ اور سوویت یونین کے گرد بن گئے۔ دنیا دو واضح بلاکوں میں تقسیم ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ سامراجی نظام امریکہ کی قیادت میں پھلنے پھولنے لگا اور سوویت یونین کی سربراہی میں کیمونزم اس نظام کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے لگا۔ نظریات کی جنگ نے عالمی طاقتوں کو اپنے دفاع پر توجہ دینے پر مجبور کیا امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کھنچاؤ اور تناؤ کی ایسی فضا بنی جس کے اندر وہ ایک دوسرے سے متعلق شک و شبہ میں مبتلا رہتے۔ اس دوران ہر حربہ استعمال کیا جاتا سوائے جنگ کے، اس کیفیت نے آگے چل کر فرہنگ سیاسیات میں ایک نئی اصطلاح ''سرد جنگ'' کو وجود بخشا۔

امریکی سی آئی اے کا خیال تھا کہ سوویت یونین کو ایٹمی طاقت بننے میں ابھی وقت لگے گا اس کا انہوں نے اندازہ لگایا کہ سوویت یونین 1951ء سے پہلے ایٹم بم تیار نہیں کر سکے گا لیکن سی آئی اے کی رپورٹوں کے برخلاف سوویت یونین نے 1949ء میں ہی ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی اور ایٹم بم تیار کر لیا۔ اس پر نیشنل سیکورٹی کونسل کا اجلاس ہنگامی بنیادوں پر بلایا گیا اس اجلاس کی دستاویز تیار کی گئی جو NSC68 کے نام سے مشہور ہوئی جس کی رو سے یہ طے پایا کہ امریکہ اب (Containment of Communisim) کیمونزم کا گھیراؤ صرف معاشی اور سیاسی تدابیر سے ہی نہیں کرے گا بلکہ اس کے لئے ملٹری تدابیر بھی اختیار کی جائیں گی۔

سوویت یونین کے خلاف جو پہلی فوجی حکمت عملی اختیار کی گئی وہ نیٹو، شمالی

اوقیانوس کا ایک دفاعی ادارہ ،ایک دفاعی معاہدہ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (North Atlantic Treaty Organization) یا نیٹو قیام تھا۔ نیٹو کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کے اجتماعی تحفظ کے حصول کو ممکن بنانا تھا۔ اجتماعی تحفظ سوویت یونین کیمونزم کے خطرے کے پیش نظر اور زیادہ اہم ہو گیا تھا۔اس سے پہلے امریکی سینٹ میں (Vandenbery Resolution 1948) منظور ہو چکی تھی جس میں اس رائے کا اظہار کیا گیا تھا کہ ریاست امریکہ کو امن کے فروغ کے لئے کچھ ایسے آئینی اقدامات اٹھانے چاہئیں جو علاقائی اور دوسرے اجتماعی انتظامات پر مشتمل ہوں اور جن کا مقصد ایک دوسرے کو موثر امداد باہمی فراہم کرنا ہو اور اس امداد باہمی کے نتیجے میں قومی تحفظ حاصل کرنا ہو۔اس قرارداد کو درحقیقت نیٹو کی ابتداء میں پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔

یہ معاہدہ 4 اپریل 1949ء کو امریکہ،کینیڈا، برطانیہ،فرانس،نیدر لینڈ،بیلجئم ،لکسمبرگ،اٹلی،ناروے،ڈنمارک ،آئس لینڈ اور پرتگال کے مابین ہوا۔یونان اور ترکی 1951ء میں اور مغربی جرمنی 1955ء میں اس میں شامل ہوا۔امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں نے آپس میں دو باتوں پر اتفاق کیا:

(1) حلیف ممالک تمام تنازعات کو پرامن طور پر حل کریں گے۔

(2) مستقل اور موثر امداد باہمی کی بنیاد پر وہ اپنے اندر مسلح حملوں سے نمٹنے کے لئے صلاحیت حاصل کریں گے۔

(3) یورپ یا شمالی امریکہ میں کسی بھی رکن کے اوپر کوئی مسلح جارحیت تمام ارکان پر جارحیت تصور کی جائے گی اور ایسی صورت حال میں ارکان ممکنہ طور پر متاثر رکن کی مدد کریں گے اور اس ممکنہ امداد میں مسلح مدد بھی شامل ہو گی۔

اس طرح ان تین خصوصی مقاصد کے ساتھ نیٹو کا آغاز ہوا۔اس کی ایک کونسل قائم کی گئی جو ارکان ریاستوں کے وزرائے خارجہ،دفاع اور مالیات پر مشتمل تھی۔1951ء کے آغاز میں اس نے اپنے فوجی ہیڈ کوارٹر پیرس کے نزدیک "Shape" کے نام سے قائم کیا گیا اور جنرل آئزن ہاور کو نیٹو کا سپریم کمانڈر مقرر کیا گیا۔

شیپ کا مقصد یہ تھا کہ مغربی یورپ میں ایک دفاعی قوت قائم کی جائے جو اگرچہ سوویت یونین کی مجموعی فوجی طاقت کے برابر نہ ہو تو بھی اتنی مضبوط ضرور ہو کہ سوویت یونین کو حملہ کرنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچنا پڑے۔فرض کیا اگر حملہ ہو بھی جاتا ہے تو اس وقت تک روسی فوجوں کو روکا جائے جب تک کہ امریکی فضائیہ روسی طاقت کے ٹھکانوں کو تباہ وبرباد نہ کردے۔چنانچہ اس طرح یورپ کے لئے امریکی امداد معاشی سطح سے ہٹ کر فوجی سطح پر شروع ہوئی اور اکتوبر 1949ء سے 1953ء کے آخر تک امریکہ نے اپنے یورپی اتحادیوں کو چھ بلین ڈالر کی فوجی امداد دی اور اس کے علاوہ آسٹریا اور مغربی جرمنی میں اپنی فوجی ڈویژن کی تعداد میں مزید اضافہ کیا۔نیٹو کی افواج دراصل یورپ میں آہنی پردے (سوویت یونین اور اس کی حلیف ریاستیں) پر کڑی نگاہ رکھنے کی ذمہ دار تھیں۔

ناٹو کا قیام ایک ایسا دفاعی معاہدہ تھا جس نے روس اور اس کے اتحادیوں کو مشتعل کر دیا۔کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس سے یورپ کی امن و امان کی صورت حال بگڑ سکتی تھی اور روس سے جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔اٹلی اور فرانس کے بائیں بازو کے حلقوں نے بھی اس کے قیام کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

اس کے جواب میں مغربی ممالک کے حملوں کی روک تھام کے لئے 14 مئی 1955ء کو مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ ،مشرقی جرمنی ،ہنگری، رومانیہ، پولینڈ اور روس کے درمیان اس پر دستخط ہوئے۔دستخط کنندگان نے عالمی مسائل پر طاقت کے عدم استعمال پر اتفاق کیا اور اس مقصد کے لئے ایک مشترکہ فوج بھی قائم کی گئی۔اس سلسلے میں مشہور کیا گیا کہ معاہدات پیرس کے تحت مغربی جرمنی کی دوبارہ اسلحہ بندی کے نتیجے میں اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔یہ معاہدہ ان ممالک کے درمیان بیس سال کے عرصہ کے لئے باہمی مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں طے پایا تھا لیکن اگر مشرق ومغرب کی اجتماعی حفاظت کا کوئی نظام بروئے کار آجائے تو اسے کالعدم بھی کیا جا سکتا تھا۔اس کا صدر دفتر ماسکو میں تھا۔

نیٹو کے قیام کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اصل

وجہ سوویت یونین ہی تھا لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1991ء میں سوویت یونین کے بکھر جانے اور کیمونزم کا خطرہ ختم ہونے اور عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کی فتح کے بعد نیٹو کو بھی ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن دنیا نے دیکھا کہ بجائے ختم ہونے کے اس کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ 1985ء میں سپین کو شامل کیا گیا اور سوویت یونین کے ٹکڑے ہونے کے بعد 1999ء کو چیک ری پبلک، ہنگری اور پولینڈ کو شامل کر کے اس کو مزید وسعت دی گئی۔

اپریل 2004ء میں بیک وقت سات سابقہ روسی کیمونسٹ ریاستوں ایسٹونیا، لٹونیا، سمتوانیا، سلواکیہ، سلوانیہ، رومانیہ اور بلغاریہ کو نیٹو میں شامل کر کے عالمی سطح پر کئی سوالات پیدا کر دیئے گئے۔ ماہرین سیاسیات کے نزدیک سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نیٹو میں توسیع کا متمدد دراصل امریکہ کی جانب سے ایک اور سرد جنگ شروع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ سرد جنگ امریکہ کس کے خلاف شروع کر رہا ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ قرائن وشواہد اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس جنگ کا خمیازہ لامحالہ چین کو ہی بھگتنا پڑ سکتا ہے، اگرچہ یہ جنگ ماضی کی طرح نظریاتی نہیں ہوگی لیکن کیوں کہ چین بڑی تیزی کے ساتھ آزاد منڈی کی طرف آ رہا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے ملک کو بیرونی سرمایہ کاری کے لئے کھول کر سرمایہ دارانہ نظام کی ایک حد تک حمایت کا ثبوت دے چکا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ سرد جنگ نظریات سے زیادہ اپنے اندر معاشی پہلو لئے ہوئے ہے۔

نیٹو میں توسیع کا مقصد عالمی وسائل پر بزور طاقت قبضہ کرنا ہے اگرچہ امریکہ اب تک اپنے ہی زور بازو پر یہ سب کچھ کر رہا ہے مگر مستقبل قریب میں اگر امریکہ کو عالمی وسائل اور خام مال پر قبضے کی جنگ کو وسعت دینی پڑی تو نیٹو کی افواج بھی میدان عمل میں کود سکتی ہیں۔ سات سابقہ سوویت ریاستوں کو نیٹو میں شامل کرنے کا مقصد روس کا محاصرہ کر کے اس کے خام مال تک یورپ کی رسائی کو آسان بنانا اور ساتھ ہی ساتھ ایران کے تیل کے ذخائر سے استفادہ کرنا ہے۔

اس سلسلے میں امریکہ کی جنگی تیاریاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں امریکہ کے دفاعی

بجٹ میں بیس فیصد اضافہ کیا گیا ہے اور اس سال 2005ء میں یہ بجٹ 400 ارب ڈالر سے بھی تجاوز کر جائے گا۔ چین نے اب تک نیٹو کی طرز پر ایسا کوئی اتحاد نہیں بنایا اور نہ ہی وہ مستقبل میں کسی ایسے اتحاد کی داغ بیل ڈال کر امریکہ کو چین کے خلاف کاروائی کا کوئی بہانہ ہاتھ آنے دے گا۔ اس کے باوجود چین کی عالمی سیاست پر بڑی گہری نظر ہے اور وہ اپنا ایک ایک قدم پھونک کر رکھ رہا ہے۔ سیاسی شطرنج کی چالیں وہ اس طرح چل رہا ہے کہ سامنے والے کو شکست بھی ہو جائے اور اس کے مہرے بھی سلامت رہیں۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ اپنی دفاعی ضرورتوں سے غافل ہے۔

زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے چین اور روس ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر بڑی تیزی کے ساتھ قریب آ رہے ہیں اپریل 1996ء میں روس، چین اور وسطی ایشیا کی تین ریاستوں قازقستان، کرغیرستان اور تاجکستان نے مل کر ایک علاقائی فوجی معاہدہ کیا ہے جس کا مقصد سرحدوں کے اندر اور باہر کسی بھی قسم کی بنیاد پرستی کو روکنا ہے یہ معاہدہ بعد ازاں ''شنگھائی فائیو'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس اتحاد میں ازبکستان کی حالیہ شمولیت کے بعد اس کا نام ''شنگھائی تعاون تنظیم'' رکھا گیا۔

نومبر 1997ء میں چین کے صدر جیانگ ژی من نے ماسکو کا دورہ کیا اور دونوں طرف سے مشترکہ اعلامیہ (ماسکو ڈیکلریشن) جاری ہوا جس کا مقصد یک قطبی نظام کے خاتمے اور کثیر قطبی نظام کی حمایت، امریکہ کی بالا دستی کی مخالفت، نیٹو میں توسیع کو روکنا اور تجارت کو فروغ دینا شامل ہیں۔

جون 1999ء میں سرحدی حد بندی سے متعلق سات سال سے جاری مذاکرات کے بعد حتمی منصوبے پر اتفاق رائے ہوا جس پر دسمبر 1999ء میں بورس یلسن نے چین کے دورے کے دوران دستخط کئے تھے۔ یہ وہ پیش رفت ہے جو امریکی خطرے کو بھانپتے ہوئے روس چین تعلقات میں دیکھنے کو آئی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیٹو میں حالیہ اضافہ دراصل چین روس کو زیر دام رکھنے کے لئے ہے اگرچہ روس اپنی معاشی ابتری کے باعث خود یورپ کا دست نگر بن کر رہ گیا ہے مگر بہر حال، وہ اب بھی خطرناک ترین ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نیٹو میں شامل ممالک جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے صرف یورپ اور شمالی امریکہ کے دو ممالک شامل کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ براعظم ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ ایسے خطے ہیں جو امریکی مفادات کی بھینٹ چڑھ سکتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر اب بھی امریکی استحصال کا شکار ہیں۔تیسری دنیا کے ممالک نیٹو کے مقابلے میں اس لیڈر شپ کے منتظر ہیں جو انہیں ''وارسا پیکٹ'' کی طرز کے کسی معاہدے سے منسلک کر کے دنیا میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھ سکے۔

☆

کیوبا کا بحران (1962ء)

اکتوبر 1962ء میں کیوبا کی طرف سے روس کو اڈے مہیا کرنے کے مسئلے پر دو سپر طاقتوں کے درمیان سرد جنگ میں شدت پیدا ہونے سے دنیا تیسری عالمی جنگ کے خطرے سے دوچار ہو گئی۔ امریکہ کو شکایت تھی کہ روس نے کیوبا میں میزائلوں اور راکٹوں کے اڈے قائم کئے ہیں جن کی وجہ سے کسی بھی وقت امریکہ کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ امریکی حکومت نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ کیوبا تک مزید ایٹمی اسلحہ نہ پہنچنے دیا جائے اور اس طرح کے جو ہتھیار کیوبا پہنچ چکے ہیں انہیں وہاں سے ہٹا دیا جائے یا تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ امریکہ نے کیوبا کی بحری ناکہ بندی کرنے کا اعلان کر دیا جس کے بعد روس نے بھی اپنے پچیس اسلحہ بردار جہاز کیوبا بھیج دیئے۔ روس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کیوبا کو اپنی اسلحہ بندی کا پورا اختیار ہے اس نے اپنے دفاع کے لئے روسی اسلحہ مانگا ہے اور روس امریکہ کی بحری ناکہ بندی کے باوجود کیوبا تک اسلحہ پہنچائے گا اور اگر کھلے سمندر میں آزادانہ جہاز رانی کے حق کو غصب کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے گا۔ اس کے جواب میں امریکہ کے صدر کینیڈی نے بھی روسی جہازوں کو روکنے کے لئے امریکی بحری بیڑے کو تیار رہنے کا حکم دے دیا اور امریکی وزیر دفاع کو اس سلسلہ میں کاروائی کے لئے وسیع اختیارات دے دیئے۔

روس نے اعلان کیا کہ اگر کسی روسی جہاز کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔ مشرقی جرمنی میں ساری رات روسی فوجوں کی نقل و حرکت جاری رہی۔ امریکی بحریہ بھی حرکت میں تھی اور روسی جہازوں کا راستہ روکنے کے لئے چھ سو میل علاقے میں پھیل گئی۔ امریکی سمندری بیڑے نے ایک اعلان کے ذریعے تمام

تجارتی جہازوں کو بھی خبردار کیا کہ بحری ناکہ بندی کے فیصلے پر عمل درآمد کے دوران بعض سمندری علاقے کسی بھی وقت خطرناک علاقے بن سکتے ہیں۔

امریکہ کے 39 ریڈیو سٹیشن سارا دن یہ اعلان نشر کرتے رہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں امریکی بحری بیڑہ روسی جہازوں کے مقابلہ میں طاقت کا پہلا مظاہرہ کرے گا۔اس طرح دنیا پر تیسری عالمی جنگ کے خطرات منڈلانے لگے اور خوف و ہراس کی فضا پیدا ہوگئی۔روس کے وزیراعظم نے مشہور فلسفی مسٹر برٹرینڈرسل کے ایک تار کے جواب میں کہا کہ ہم کیوبا کے مسئلے پر سربراہوں کی کانفرنس کو مفید سمجھتے ہیں ،روس کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھائے گا۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کو حوصلے سے کام لینا چاہئے اور بحری قذاقوں کی سی دھمکیاں نہیں دینا چاہئے۔

امریکہ نے سلامتی کونسل میں روس کو خبردار کیا کہ وہ کیوبا کے معاملہ میں امریکی رویہ کے متعلق غلط اندازہ نہ لگائے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اب تک عالمی امن کے لئے ایسا سنگین خطرہ کبھی پیدا نہیں ہوا جس سے اب ہم دوچار ہیں۔امریکی نمائندے ایڈلائی سٹیونسن نے کہا کہ امریکہ کے صبر اور تحمل کا دور اس وقت ختم ہوگیا تھا جب وزیر اعظم کاسترو نے کیوبا کو دور مار میزائل کے اڈہ کی حیثیت سے روس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس صورت کو تبدیل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جائے گا جو ہمارے بس میں ہے۔ایڈلائی نے مزید کہا کہ امن کی جانب صرف ایک راستہ جاتا ہے اور وہ راستہ امریکی قرارداد ہے جو سلامتی کونسل میں پیش کی گئی ہے۔روسی نمائندے نے اپنی تقریر میں کہا کہ کیوبا کی بحری ناکہ بندی بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی اور ایک نہایت اشتعال انگیز کاروائی ہے۔

دنیا کے چالیس ملکوں کی طرف سے جنگ کو روکنے کی اپیل کی گئی۔اقوام متحدہ قائم مقام سیکرٹری جنرل مسٹر اوتھان نے بھی اپنی تجاویز کے ساتھ دونوں سپر طاقتوں سے جنگ نہ کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ وہ کیوبا کے معاملے کو ٹھنڈے دل سے حل کرنے کی کوشش کریں۔مسٹر خروشچیف نے عالمی امن کے مفاد میں مسٹر اوتھان کی امن تجاویز کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔جبکہ کینیڈی نے مسٹر اوتھان کی اپیل مسترد کر دی اور کہا کہ

اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ روس کیوبا کو اسلحہ کی سپلائی بند کر دے گا۔ روس کی طرف سے عملی اقدام کرتے ہوئے کیوبا جانے والے روسی جہازوں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ اس طرح تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹل گیا اور دنیا نے تشویش اور اضطراب کے اڑتالیس گھنٹے گزارنے کے بعد سکھ کا سانس لیا۔

------✡------

سالٹ ٹو معاہدہ (1979ء)

رونالڈ ریگن نے اشتراکیت کے خلاف انتہائی غیر لچک دار موقف اپنایا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ نظریاتی امور میں امریکہ اصولوں پر سودے بازی نہیں کرے گا۔ ریگن کی خوش نصیبی یہ تھی کہ انہیں میخائل گورباچوف جیسا ہم منصب ملا جو دنیا کو کشیدگی اور سرد جنگ سے ہر حال میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور جس کی خواہش تھی کہ بین الاقوامی تعلقات میں پیدا ہونے والا کھنچاؤ ختم ہو اور ترقی کی راہ ہموار ہو۔ میخائل گورباچوف نے سابق سوویت یونین کے آخری صدر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے دنیا پر واضح کر دیا کہ وہ اپنے معاشرے کے تمام نقائص اور ناکامی کو تسلیم کرتے ہیں اور انہیں دور کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ گورباچوف کی حقیقت پسندی نے ریگن کے ساتھ مل کر معاملات کو بہت عمدگی سے اس مقام تک پہنچایا جہاں انہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ سرد جنگ کے خاتمے میں ریگن کے کردار کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دو عالمی جنگوں کے بعد دنیا کی رائے عامہ جنگ کے خلاف ہو چکی ہے، خاص طور پر دوسری عالمی جنگ (1939ء تا 1945ء) میں جس وسیع پیمانے پر انسانی جانوں کا اتلاف ہوا اسے دیکھتے ہوئے بہت سے ممالک جنگ کی ہولناکیوں سے خوف زدہ ہو گئے۔ خاص طور پر جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم استعمال کئے تو چشم زدن میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بن گئے، لاکھوں عمر بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ اس ہولناک تباہی کے بعد دنیا خاص طور پر ایٹمی جنگ کے خلاف ہو گئی۔ شروع شروع میں دنیا میں ایٹمی طاقتیں صرف چند ایک ہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ایٹمی کلب میں اور ممالک بھی شامل ہوتے گئے۔ اس طرح دنیا ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہو گئی، چنانچہ جنگ کے خطرہ کو روکنے کے لئے روس اور امریکہ جو دنیا کی سپر پاورز شمار ہوتی تھیں ایک دوسرے سے ملاقات پر تیار ہو گئیں۔

امریکہ کے صدر جمی کارٹر اور روس کے سربراہ مسٹر برزنیف نے آسٹریا میں امریکی سفارت خانے میں ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت کی اور امریکہ کی موجودہ سربراہ کانفرنس کے دوران یہ دونوں لیڈروں کی واحد غیر سرکاری ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے بعد روسی سفارتخانے میں دونوں ملکوں کے وفود کا مشترکہ اجلاس ہوا جو تقریباً آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ دونوں وفود کے درمیان ہتھیاروں کے کنٹرول کی بات چیت کافی آگے بڑھی مگر دوسرے مسائل پر اختلافات کم نہ ہو سکے۔ مسٹر کارٹر نے روسی سربراہ کو خبردار کیا کہ وہ تعاون یا تصادم میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کریں۔ امریکہ اور روس کے سربراہوں نے 18 جون 1979ء کو مہلک ہتھیاروں کو محدود کرنے کے دوسرے سمجھوتے (سالٹ 2) پر دستخط کیے، جو 1985ء تک نافذ رہے گا۔ یہ دونوں ملکوں کے درمیان پہلا سمجھوتہ تھا جس میں ہتھیاروں کی تیاری منجمد کرنے کی بجائے ان کی تعداد کم کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی۔

اس سمجھوتے میں کہا گیا کہ دونوں طاقتیں ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد 1981ء کے آخر تک دو ہزار دو سو پچاس تک محدود کر دیں گے۔ اس سے قبل دونوں کو دو ہزار چار سو ایٹمی ہتھیار رکھنے کی اجازت تھی۔ سمجھوتے پر دستخط کرنے کی تاریخی تقریب آسٹریا کے تاریخی شاہی محل کے بال روم میں ہوئی اور اس پر امریکہ کے صدر جمی کارٹر اور روس کے سربراہ مسٹر برزنیف نے دستخط کیے جس کے بعد دونوں بغلگیر ہوئے اور ایک دوسرے کے گال پر بوسہ دیا۔ اس موقع پر دونوں ملکوں کے وفدوں کے ارکان اور سینکڑوں اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔

دونوں لیڈروں نے اس سمجھوتے کو اسلحہ کی دوڑ ختم کرنے اور مکمل تخفیف اسلحہ کی طرف ایک اہم قدم قرار دیا۔ مہلک ہتھیاروں کو محدود کرنے کا نیا سمجھوتہ دونوں ملکوں کے سربراہوں کی چار روزہ بات چیت کے بعد طے پایا۔ اس بات چیت میں دوسرے عالمی مسائل، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ہند چینی کی صورت حال پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔ سمجھوتے پر دستخطوں کے بعد مسٹر برزنیف نے کہا کہ سمجھوتہ دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر بنانے اور دنیا بھر کی فضا کو خوشگوار بنانے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سمجھوتے

پر دستخط کر کے ہم انسان کے مقدس ترین حق یعنی زندہ رہنے کے حق کا تحفظ کر رہے ہیں۔ مسٹر برزنیف نے اس سمجھوتے کو اپنی خارجہ پالیسی کا اہم مقصد قرار دیا۔

تحدید اسلحہ معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے امریکی صدر جمی کارٹر نے کہا کہ جوہری اسلحے کے پھیلاؤ کو روکنے کی سمت یہ پہلا قدم ہے انہوں نے کہا میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس طرح ہم نے انسانیت کو ایٹمی اسلحے کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر لیا ہے تاہم اس سلسلے میں دونوں بڑی طاقتوں نے جو پیش رفت کی ہے وہ اطمینان بخش ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور ضروریات کو سمجھنے لگے ہیں اور وہ جمود جو کافی عرصے سے چلا آ رہا تھا آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا میں امریکہ کی سلامتی کا ذمہ دار ہوں اور کوئی ایسا اقدام نہیں کروں گا جو امریکی مفادات کے خلاف ہو۔ امریکی صدر کارٹر نے اسے امن کی فتح قرار دیا اور کہا اگرچہ اس معاہدے سے فوجی طاقت بڑھانے اور ایک دوسرے کے خلاف تیار کرنے کی ضرورت کا احساس ختم نہیں ہوگا تاہم اس سے نئی اہم پابندیاں ضرور لگائی جائیں گی۔

روس کے صدر برزنیف نے نئے سمجھوتے کا خیر مقدم کیا اور انہوں نے کہا امریکہ اور روس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے اجتناب کریں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اور روس نے مل کر جوہری جنگ کو روکنے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے بعد دونوں بڑی طاقتوں کے تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایٹمی اسلحے کو محدود کرنے کے سلسلے میں یہ سمجھوتہ کرنے میں مزید کئی سال لگیں گے اور ہم بتدریج ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔

جنیوا کانفرنس (1985ء)

دنیا کی دو بڑی طاقتیں اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے انداز مکمل اور بھرپور عالمی غلبہ کے لئے کوشاں تھیں لیکن دونوں کے پاس ہمہ گیر تباہی و بربادی کے لئے ایٹمی اسلحہ کے اتنے انبار جمع ہو گئے کہ وہ آپس میں جنگ کے تصور کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ باقی دنیا کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس طرح تقسیم کر لیں کہ دنیا میں براہ راست تصادم اور کھلی جنگ کی نوبت نہ آئے اور ان کے حلقہ ہائے اثر میں محدود پیمانہ پر جو جنگیں ہوتی ہیں اور جن کی تباہی کی زد میں دوسرے چھوٹے اور کمزور ممالک آئیں اور وہ ایسی حدود کے اندر رہیں کہ خود ان کے براہ راست ملوث ہونے کی نوبت نہ آئے۔ روس اور امریکہ کے درمیان تخفیف اسلحہ کی جو بات چیت ہوتی رہی ہے اس کا مقصد بھی آپس میں براہ راست تصادم کی روک تھام ہے۔ لیکن ان کے مفادات چوں کہ خود غرضانہ اور توسیع پسندانہ ہوتے تھے اس لئے بعض اوقات معاملات اس قدر الجھ جاتے کہ ان میں بھی ٹکراؤ کا امکان پیدا ہو جاتا جس سے بچنے کے لئے وہ سربراہی مذاکرات کا اہتمام کر لیتے اور اسے امن عالم کے تحفظ کی مساعی سے تعبیر کرتے۔ چنانچہ امریکہ اور روس کے درمیان دو روزہ سربراہی مذاکرات 19 نومبر 1985ء کو جنیوا میں ہوئے۔

جنیوا روانہ ہونے سے پہلے کئی مواقع پر صدر ریگن نے روسی سربراہ سے مذاکرات میں افغانستان کے مسئلہ پر بات چیت کا برملا ذکر کیا تھا انہوں نے اقوام متحدہ کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر صدر ضیاء الحق سے صدر ریگن کی جو ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد انہوں نے بتایا تھا کہ صدر ریگن نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جنیوا میں افغانستان کا سوال بھی اٹھائیں گے لیکن جنیوا مذاکرات کے بعد جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیے میں اس اہم مسئلہ کا کوئی ذکر نہ تھا۔ روس سے جنیوا میں سربراہی مذاکرات کے لئے امریکہ کی آمادگی اس اعتبار سے روس کی کامیابی تھی کہ اس نے امن و صلح کے نام پر عالمی سطح پر جو

پراپیگنڈا کی جنگ شروع کر رکھی تھی اس میں اسے امریکہ پر فوقیت حاصل تھی۔ روس مغربی جمہوری ملکوں میں امن کانفرنسوں اور یورپ کے دفاع کے لئے امریکی میزائلوں کے نصب کرنے کے خلاف مظاہروں اور جلوسوں کا سلسلہ کم وبیش معمول بن چکا تھا۔ ایٹمی اور دوسرے مہلک ہتھیاروں کی تیاری میں روس کسی اعتبار سے امریکہ سے پیچھے نہیں تھا لیکن ان مظاہروں اور جلوسوں سے مغربی یورپ کے ملکوں کے عام لوگوں کو یہی تاثر ملتا تھا کہ جنگ اور جارحیت کی تیاری میں صرف امریکہ ہی مصروف ہے۔

سابق صدر کارٹر کے مقابلے میں صدر ریگن نے دفاع معاملات میں روس سے پیچھے نہ رہنے کا جو اہتمام کیا تھا اس سے اگرچہ دونوں سپر طاقتوں کے درمیان براہ راست تصادم کے امکانات کم ہو گئے تھے لیکن مغربی ملک ایٹمی جنگ میں تباہی سے جس حد تک خوفزدہ تھے اور ان کے عوام اس خوف کا جس طرح برملا اظہار کرتے تھے اس کی وجہ سے امن وصلح کے تحفظ کی خاطر ابلاغ کی جنگ میں روس کو بہرحال فوقیت حاصل تھی۔

مذاکرات کے بعد جاری ہونے والے مشترکہ بیان میں "کھلے دل سے مفید بات چیت" کا ذکر تو کیا گیا لیکن ساتھ ہی اس امر کی نشان دہی بھی کر دی گئی کہ نازک مسائل پر سنگین اختلافات برقرار رہے ہیں، لہٰذا ان سربراہی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنے پر اتفاق کیا گیا ہے۔ روسی سربراہ گورباچوف آئندہ سال امریکہ کا دورہ کریں گے اور صدر ریگن **1987**ء کو روس کا جوابی دورہ کریں گے۔ اس دوران میں جنیوا میں دونوں سپر طاقتوں کے درمیان تخفیف اسلحہ کے لئے بات چیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ اعلامیہ امریکہ اور روس کے درمیان سربراہی ملاقات جو چھ سال بعد ہوئی، کا تھا۔ اس کے علاوہ کیا کیا معاملات زیر بحث آئے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کیوں کہ کانفرنس میں یہ بھی طے ہوا کہ عالمی ابلاغ کے نمائندوں کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ البتہ مشترکہ اعلامیہ میں اعلان کیا گیا کہ:

"ایٹمی جنگ کبھی جیتی نہیں جا سکتی اور یہ کبھی لڑنی بھی نہیں چاہئے"

دونوں ممالک نے خلاء میں اسلحہ کی دوڑ روکنے اور زمین پر ایٹمی ہتھیاروں میں کمی کے متعلق مذاکرات تیز کرنے پر بھی اتفاق کیا۔ گورباچوف نے مشترکہ بیان جاری

...کرنے کی تقریب میں دو بار اپنے مختصر ریمارکس میں اس پر اصرار کیا کہ ''خلاء کو غیر فوجی بنانے کا مسئلہ بدستور مرکزی اہمیت کا حامل ہے ہمیں حقیقت پسند ہونا چاہئے۔'' ریگن اور گورباچوف کے خطاب کے بعد وزرائے خارجہ نے متعدد باہمی معاہدوں پر دستخط کئے۔
21 نومبر کو صدر ریگن ''نیٹو'' کے جرنیلوں کو بریف کرنے کے لئے یورپ روانہ ہو گئے اور مسٹر گورباچوف نے جنیوا میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔
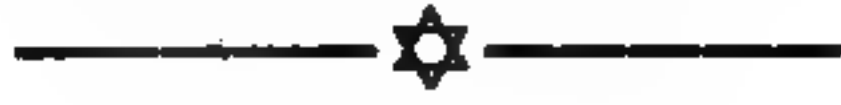
معاہدہ جنیوا برائے تخفیف ایٹمی اسلحہ (1987ء)

یہ معاہدہ جسے انٹرمیڈیٹ نیوکلیر فورس (INF) کہتے ہیں طویل مذاکرات کے بعد 8 دسمبر 1987ء کو امریکہ اور روس کے مابین جنیوا کے مقام پر طے پایا۔ مذاکرات کا آغاز یکم دسمبر 1981ء کو ہوا، 1982ء میں روس واک آوٹ کر گیا۔ اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ 1985ء میں پھر جنیوا میں شروع ہوا۔ اس نامکمل گفتگو کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے 20 اکتوبر 1986ء کو آئس لینڈ کے دارالحکومت رکیاوک میں امریکہ کے صدر مسٹر ریگن اور روس کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر گورباچوف کے مابین چوٹی کانفرنس شروع ہوئی جو اسٹار وار کے مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کی بنا پر ناکام ہوگئی لیکن اس کے باوجود بھی بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ 8 دسمبر 1987ء کو دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے جو ایک عرصہ سے کھٹائی میں پڑا تھا۔

معاہدے کے بعض نکات اس طرح تھے:

- ☆ معاہدے کی یادداشت سمیت مستقبل کی مفاہمت کے لئے دونوں فریق اپنے درمیانے اور کم فاصلے پر مار کرنے والے میزائل ختم کر دیں گے اور بعد ازاں ایسا نظام نہیں رکھیں گے اور اس معاہدے کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں گے۔
- ☆ دونوں فریق درمیانے فاصلے پر مار کرنے والے میزائل ضائع کر دیں گے اور ان سے متعلقہ وہ تمام تنصیبات اور اس کی تمام قسمیں جن کا مفاہمت کی یادداشت میں ذکر کیا گیا ہے معاہدہ ہونے کے تین سال کے اندر اور نہ بعد میں ایسے میزائل لانچر یا دوسری تنصیبات اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔
- ☆ دونوں فریق نصب شدہ اور غیر نصب شدہ میزائل اور ان سے متعلق تنصیبات

مقررہ مدت کے شروع ہونے کے بعد ضائع کر دیں گے اور اس دوران مدت یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

☆ دونوں فریق کم فاصلے پر مار کرنے والے میزائل اور لانچر جو مفاہمت کی یاد داشت میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کے متعلق تمام تنصیبات معاہدہ ہونے کے 18 ماہ کے اندر یا بعد میں اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔

☆ دونوں فریق معاہدہ ہونے کے 90 دن کے اندر کم فاصلے پر مار کرنے والے نصب شدہ میزائل اور ان سے متعلق تنصیبات ہٹا لیں گے اور معاہدہ ہونے کے بارہ ماہ کے اندر میزائل ضائع کرنے کا عمل مکمل کر لیں گے۔

معاہدے پر دستخطوں کے بعد دنیا بھر کے ممالک کے سربراہوں نے اسے سراہا۔ لندن کی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹجی اسٹڈیز نے یورپ میں میزائلوں کی موجودگی کے بارے میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار جاری کیے:

امریکہ:

پرشنگ میزائل نمبر 11	108
کروز میزائل	256
پرشنگ 16	72
کل میزان	436

روس:

ایس ایس نمبر 20 میزائل	441
ایس ایس نمبر 4 میزائل	112
ایس ایس نمبر 12 میزائل	130
ایس ایس نمبر 30 میزائل	20
کل میزان	703

روس کے ایس ایس 20 میں تین وار ہیڈ یا تین نیوکلیائی بم ہوتے ہیں جبکہ امریکہ کے میزائل میں صرف ایک وار ہیڈ ہوتا ہے۔ روس کے میزائلوں کے وار ہیڈ کی

مجموعی تعداد 580 بتائی گئی تھی جبکہ امریکہ کے میزائلوں میں صرف 436 وار ہیڈز تھے۔ دونوں بڑی طاقتوں کے ذخیرے میں تقریباً 48000 وار ہیڈز موجود تھے جن میں امریکہ کا حصہ 26000 وار ہیڈز تھا اور جن کی تباہی کی صلاحیت 4741 ملین ٹی این ٹی کے برابر تھی۔ جبکہ روس کے پاس 7225 ملین ٹی این ٹی کے برابر تھی۔

امریکہ نے یہ میزائل مغربی جرمنی، برطانیہ، اٹلی اور بلجیم میں لگا رکھے تھے۔ یہ میزائل درمیانی فاصلہ تک مار کرنے والے تھے اور 500 کلومیٹر سے 5000 کلومیٹر تک کے فاصلوں پر مقررہ نشانوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دونوں سربراہوں نے مذاکرات کے دوران مسئلہ افغانستان پر بھی تبادلہ خیال کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس مسئلے کا حل بھی کریں گے۔ روس نے یہ میزائل مشرقی جرمنی میں نصب کئے ہوئے تھے ان میزائلوں کا حدف بھی 500 سے 5000 کلومیٹر تک کے فاصلے کے لئے تھا۔ روس اور امریکہ نے تخفیف اسلحہ کے متعلق مزید بات چیت جاری رکھنے کا عزم کیا۔

ماسکو امن کانفرنس (1988ء)

29 مئی 1988ء کو امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن سوویت یونین کی حکمران جماعت کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری میخائل گورباچوف سے ملنے کے لئے پہلی مرتبہ ماسکو پہنچے۔ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان یوں تو چوتھی سربراہی ملاقات تھی لیکن صدر ریگن میخائل گورباچوف سے ملنے کے لئے پہلی مرتبہ ماسکو آئے۔ اس ملاقات کے لئے عرصے سے تیاریاں ہو رہی تھیں اور ساری دنیا کی نظریں ان دو بڑوں پر لگی ہوئی تھیں ۔ اس ملاقات کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ صدر ریگن جنوری 1989ء کو اپنے عہدے سے فارغ ہو رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وائٹ ہاؤس چھوڑنے سے پہلے پہلے کوئی کارنامہ انجام دے جائیں۔

سربراہی ملاقات کے دوسرے روز دونوں سربراہوں نے اعلان کیا کہ انہیں امید ہے کہ وہ ایٹمی اسلحہ میں اس قدر تخفیف پر تیار ہو جائیں گے جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی ۔ یہ ان کے باہمی مذاکرات کا تیسرا راؤنڈ تھا، اسی روز دونوں ممالک کے درمیان دو چھوٹے چھوٹے سمجھوتوں پر بھی دستخط ہوئے۔ تاہم سٹریٹیجک میزائلوں کے سمجھوتے پر مذاکرات آگے نہیں بڑھ سکے لانکہ دونوں ملکوں کے ماہرین گزشتہ دسمبر سے اس حوالے سے کام کر رہے تھے۔ تاہم صدر ریگن نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آئندہ جنوری تک اس معاہدے کی تفصیلات طے کر لی جائیں تو وہ اپنے عہدہ صدارت کی معیاد کے خاتمے سے پہلے ایک اور سربراہی ملاقات میں اس پر دستخط کر دیں گے۔ پہلے معاہدے میں میزائلوں کے بارے میں پیشگی نوٹس دیئے جانے پر اتفاق رائے ہوا۔ دوسرے معاہدے میں طے پایا کہ دونوں ممالک میں جو ثقافتی معاہدہ موجود ہے اس کی معیاد ختم ہونے پر اس کی توسیع کر دی جائے گی۔ ان معاہدوں پر امریکہ کی طرف سے سیکرٹری آف اسٹیٹ جارج شلز نے اور روس کی طرف سے اس کے وزیر خارجہ

ایڈورڈ شیورڈ نے دستخط کئے۔ دستخطوں کی یہ تقریب سینٹ کیتھرائن ہال میں منعقد ہوئی اور اس موقع پر دونوں سربراہ بھی موجود تھے۔

دسمبر 1987ء میں جارج شلز اور ایڈورڈ شیورڈ فاترے نے اس بات پر بھی باہمی رضامندی ظاہر کی تھی کہ دونوں ممالک ایٹمی تجربات پر پابندی لگا دیں اور دونوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ملک میں جا کر اس بات کی تصدیق کر سکیں کہ آیا اس پابندی پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اب اس سربراہی ملاقات کے موقع پر یہ باہمی رضامندی باقاعدہ معاہدے کے طور پر تحریر میں لائی گئی اور دونوں ممالک کے نمائندوں نے اس پر دستخط بھی کر دیئے، جس کی رو سے ایٹمی تحقیقات میں دونوں ممالک تعاون کریں گے اور جائنٹ ریڈیو نیوی کیشن سسٹم قائم کریں گے۔

دونوں سربراہوں نے باہمی ملاقاتوں میں مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر غور کیا اور اس طرح اس میں ایران، عراق جنگ بھی زیر بحث آئی۔ علاوہ ازیں مسئلہ فلسطین، جنوبی افریقہ اور کمپوچیا کے مسائل پر بھی گفت شنید ہوئی۔ اس ملاقات میں انسانی حقوق کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا بلکہ اس پر تھوڑی سی تلخی بھی ہو گئی۔ دراصل روس میں کمیونسٹ نظام حکومت کے مخالف تو شروع ہی سے موجود رہے ہیں لیکن روسی نظام اس قدر سخت اور مستبدانہ ہے کہ یہ مخالفین کھلم کھلا اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ جب سے روس کے اس وقت کے سربراہ میخائل گورباچوف نے گلاس فاسٹ نامی اپنی پالیسی کا اعلان کیا تھا روسی نظام میں ذرا سی آزادروی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ روس کی تاریخ میں پہلی بار کیمونزم کے سیاسی مخالفوں نے ایک ماہ قبل اپنا اجلاس منعقد کیا جنہیں روسی حکومت میں ''منحرفین'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، حالانکہ یہ لوگ قطعاً منحرفین نہیں تھے کیوں کہ یہ شروع ہی سے کیمونسٹ نظام کو نہیں مانتے تھے۔ اگرچہ گلاس فاسٹ کی پالیسی کے نفاذ سے تھوڑی سی آزادی حاصل ہوئی لیکن ان ''منحرفین'' کو اپنا اجلاس کرنے کی اجازت نہ ملی اور پولیس ان کے تعاقب میں رہی۔ یہاں تک کہ کسی عمارت میں اپنا اجلاس کرنے کے بجائے یہ لوگ ایک چلتی بس میں سوار ہوتے اور وہیں اپنا اجلاس منعقد کر لیتے۔ اب متذکرہ بالا سربراہ کانفرنس کے موقع پر یہ منحرفین کسی نہ کسی طرح امریکی سفارت خانے

تک پہنچ گئے اور انہوں نے صدر ریگن سے ملاقات کر لی۔انہوں نے صدر ریگن پر زور دیا کہ وہ انسانی حقوق کے حصول میں ان کی مدد کریں۔ میخائل گورباچوف نے اس بات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور وہ صدر ریگن کی اس حرکت پر بڑے جز بز ہوئے۔ صدر ریگن نے گورباچوف سے کہا کہ وہ روسیوں کو مذہبی آزادی عطا کر دیں اور مذہب پر جو پابندی عائد ہے اسے ختم کر دیں۔

جب روسی منحرفین نے صدر ریگن سے ملاقات کی تو صدر ریگن نے ان سے کہا کہ:

> ''میں یہاں اس لئے آیا ہوں تا کہ میں آپ کے کاز کو مدد پہنچا سکوں میں تو ڈپلومیٹک چینل سے ہی انسانی حقوق کی بات کر سکتا ہوں جب کہ آپ اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر انسانی حقوق کا علم بلند کئے ہوئے ہیں۔آپ نے اپنی نوکریوں کی پرواہ نہ کی ،اپنے گھروں کی قربانی دی بلکہ آپ نے اپنی جانوں کو بھی داؤ پر لگا دیا۔''

انہوں نے کہا کہ امریکہ کی نظر میں انسانی حقوق کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور ہم روس سے تعلقات استوار کرنے میں انسانی حقوق کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

صدر ریگن کی انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کی بات کو میخائل گورباچوف نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ایک ڈنر کے موقع پر انہوں نے کہا کہ روس امریکہ سے تعاون بڑھانے کے لئے تیار ہے لیکن یہ تعاون ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت کئے بغیر بڑھنا چاہئے۔انہوں نے کہا کہ ہم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کوئی ہم پر اپنے نظریات ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ہماری اپنی عادات ہیں ،اپنا طرز زندگی ہے، اپنے نظریات ہیں ہم کسی کو اپنے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ماسکو میں 29 مئی سے 2 جون تک ہونے والے مذاکرات میں سابقہ واشنگٹن سربراہی مذاکرات میں طے کئے جانے والے درمیانی مار کے میزائلوں کی تحدید کے معاہدے کی دستاویز پر دستخط کر کے اس معاہدے کو موثر بنا دیا گیا۔ملاقات کے چوتھے دور کے ختم ہونے کے بعد دونوں سربراہوں نے اس تاریخی معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے دونوں عالمی طاقتیں میڈیم ایٹمی میزائل ختم کرنے پر رضا مند ہو گئیں۔ان

ایٹمی میزائلوں کی مار پانچ سو کلومیٹر سے لے کر پانچ ہزار کلومیٹر تک تھی۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد مسٹر ریگن نے اعلان کیا کہ یہ عالمی امن کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے انہوں نے کہا کہ ہم اس پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ عالمی امن کی طرف ہمارا سفر جاری رہے گا۔ اس معاہدے پر دستخطوں کے بعد دونوں سربراہ گلے ملے اور انہوں نے معاہدے پر دستخط کرنے والے پینوں کا تبادلہ کیا۔ دستخطوں کی یہ تقریب روسی ٹیلیویژن پر براہ راست دکھائی گئی اور اس موقع پر دونوں ممالک کے وفود بھی موجود تھے۔

تقریب کے موقع پر مسٹر گورباچوف نے امریکہ پر زور دیا کہ وہ باہمی تجارت کو بھی فروغ دینے کی کوشش کریں، اس وقت یہ تجارت ایک ارب آٹھ کروڑ ڈالر سالانہ تک محدود تھی۔ امریکہ نے 1974ء میں جیکسن وینک ترمیم کے تحت یہ فیصلہ کیا تھا کہ روس کے ساتھ باہمی تجارت کو وہاں انسانی حقوق کی صورت حال سے مشروط رکھا جائے گا۔ لہٰذا اس ترمیم کے تحت روس کو ترجیحی سلوک کی حقدار مملکت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روس کا مطالبہ تھا کہ یہ ترمیم واپس لی جائے اور روس امریکہ تجارت میں اضافہ کیا جائے۔

اس سربراہی ملاقات میں روس نے بڑی کوشش کی کہ امریکہ اپنا سٹار وار پروگرام ختم کر دے لیکن امریکہ روس کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ہوا۔

(سی ٹی بی ٹی) کا معاہدہ (1996ء)

امریکہ سمیت پانچ بڑی ایٹمی قوتیں آنے والی نسلوں کو تباہی سے بچانے کی خاطر آئندہ کے لئے ایٹمی تجربات پر پابندی کے معاہدے پر متفق ہوگئیں۔ انہوں نے اس بین الاقوامی معاہدے پر 24 ستمبر 1996ء کو دستخط کئے۔ اس پروٹوکول کی چند شقوں کے مطابق:

☆ متعلقہ ملک کی حکومت معائنے کے لئے آنے والے انسپکٹروں اور ان کے معاونین کے داخلے کے لئے ان مقامات کی نشاندہی کرے گی جہاں سے باآسانی اور بحفاظت وہ ٹیمیں اپنے ساز و سامان کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے متعلقہ مقام تک پہنچ سکیں۔ معائنہ ٹیم جہاز میں آئے گی، اس جہاز کے علاوہ جانچ پڑتال کے حساس ترین آلات، ویڈیو کا سامان، ذاتی سامان اور شخصیات کو ویانا کنونشن برائے سفارتی تعلقات کے تحت مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔ اس کے آنے جانے میں معائنہ کی سرگرمیوں کے دوران اور تحقیقی اور تجزیاتی نتائج ساتھ لے جانے تک کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

☆ معائنہ ٹیم متعلقہ جگہ پر ایک ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے میں کام کر سکے گی اور 60 سے 70 دن تک اسے کام کرنے کی اجازت ہوگی۔

☆ معائنہ ٹیم کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ انسپکشن کے دوران متعلقہ سیکرٹریٹ کے ساتھ ایسے ''کوڈ'' استعمال کر سکے جس سے اس ملک کے ماہرین کو علم نہ ہو سکے جس کا معائنہ ہو رہا ہو۔

☆ معائنے کے متعلقہ علاقے کا مکمل نقشہ اور حدود اربعہ معائنہ ٹیم کو مہیا کرنا ضروری ہوگا۔

☆ سی ٹی بی ٹی پروٹوکول میں درج شرائط کے مطابق ممبر ممالک میں زلزلہ پیمائی

کے مراکز اور ان معاون مراکز کا بین الاقوامی نیٹ ورک قائم کیا جائے گا۔یہ مراکز انٹرنیشنل ڈیٹا سنٹر کو اعداد و شمار مہیا کرتے رہیں گے۔

☆ سی ٹی بی ٹی ممبر ممالک میں فضا کے ذریعے بھی ریڈیو آئسوٹوپ یا ریڈیو نیو کلائیڈز کے ذریعے بھی پیمائش کی جائے گی۔

☆ ممبر ممالک کے نیوکلیئر پروگرام کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے ہائیڈروفون سٹیشن اور ٹی فیز سٹیشن بھی کام کریں گے۔

☆ معائنہ ٹیم میں شامل ماہرین کو اس ملک کا ملٹی پل انٹری اور ایگزٹ یا ٹرانزٹ ویزا حاصل کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ دیگر دستاویزات بھی حاصل کرسکیں گے۔

☆ متعلقہ ملک معائنہ ٹیم اور ان کے حساس سازو سامان کی نقل و حمل کے تحفظ اور سیکریسی کی ضمانت دے گا۔

1996ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں سی ٹی بی ٹی پر قرارداد پیش کی گئی تو اس کے حق میں **158** ووٹ ڈالے گئے جبکہ بھارت نے اس کی مخالفت کی۔قرارداد کے بعد ابتدائی طور پر اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں سے **150** نے دستخط کردیئے لیکن ان میں سے صرف **17** ممالک نے اس کی توثیق کی۔معاہدہ کی توثیق کرنے والے ممالک میں جمہوریہ چین ،جاپان ،آسٹریلیا،فرانس، آسٹریا، برازیل، فجی ،منگولیا، مائیکرونیشیا، پیرو، قطر، سلواکیا، تاجکستان، سپین، ترکمانستان، ازبکستان، آئرلینڈ شامل ہیں۔

کوریا امن معاہدہ (شمالی و جنوبی کوریا 1950ء)

شمالی کوریا کی فوجوں نے 38 درجے میں متوازی لائن کو عبور کرتے ہوئے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا، پیانگ ینگ ریڈیو پر اعلان جنگ نشر کیا گیا۔ گھنٹوں کے اندر اندر شمالی کوریا کی فوج جنوبی کوریا کی سرحدی فوج کو بارڈر کے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ کیمونسٹوں کو سیول کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ اس حملے سے حیران تھا اور اس کا الزام سوویت یونین کو دے رہا تھا۔

شمالی کوریا کا مقصد ایک وسیع پیمانے کی جنگ چھیڑنا تھا۔ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کر لیا۔ سیکورٹی کونسل کی قراردادوں میں شمالی کوریا پر امن توڑنے کا الزام لگایا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ کیمونسٹ اپنی فوج فوری طور پر علاقے سے نکال لیں۔ سوویت یونین اپنے ویٹو کا استعمال نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ ابھی تک اقوام متحدہ کا بائیکاٹ کیے ہوئے ہے۔ ایک ماہ کے اندر اندر شمالی کوریا نے جنوبی کوریا کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جنوبی کوریا والے بے یارو مددگار اور غیر منظم تھے۔ امریکی فوج نے شمالی تائی جون پر جرأت مندانہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا لیکن انہیں بالآخر کم دریا کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ امریکہ اور اقوام متحدہ کی زیادہ تر فوج ملک کے جنوبی حصے کی طرف پسپا ہوئی جو ساحل سمندر کے ساتھ مضبوط دفاعی حصار تھا۔ شمالی کوریا نے جنگ میں امریکہ پر جارحیت کا الزام عائد کیا جبکہ چرچل نے تیسری جنگ کے خطرے کا اظہار کیا۔

کیمونسٹوں کے نئے خطرے کے پیش نظر صدر ٹرومین نے نیم حرکت پذیری کی تجویز پیش کی۔ امریکی محکمہ دفاع نے فوری طور پر بیس ہزار افراد کوریا اور جاپان بھیجنے کا حکم دیا۔ صدر نے کانگرس سے دس بلین ڈالر کی امداد مانگی تاکہ فوجوں کو مسلح کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ کیمونسٹ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام پر ٹیکس عائد کرنے کا

فیصلہ کیا۔ پہلے امریکی دستے سیئول کے قبضے سے قبل جنوبی کوریا نہ پہنچ سکے، بلکہ ان کا مشن صوبائی دارالحکومت تائی جون کا دفاع تھا جو سیئول سے نوے میل جنوب میں واقع تھا۔ امریکہ سیئون اور تائی جون کے درمیان شمالی کوریا سے زمینی جنگ میں الجھ کر رہ گیا۔

امریکہ کی چار بٹالین تین کیمونسٹ ڈویژنوں کے آگے ڈھیر ہو گئیں اور امریکہ کی چار انچ قطر کی ٹینک شکن ہاؤازرز کیمونسٹوں کے مضبوط ٹینکوں پر ضرب نہ لگا سکیں۔ امریکی فضائیہ نے شمالی کوریا کی پشت کی لائنوں میں افراتفری مچاتے ہوئے ان کے ذرائع آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اسی دوران برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے اقوام متحدہ کی کمانڈ میں جنوبی کوریا میں اپنی فوجیں بھیجنے کا اعلان کر دیا۔ جنرل میک آرتھر نے اس ارادے کا عزم کیا کہ وہ اس وقت تک اس علاقے سے نہیں جائیں گے جب تک کہ آئینی حکومت دوبارہ بحال نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی فوج نے سمندر کی طرف سے انچون (دارالحکومت سیئول کا بندرگاہی شہر) پر لینڈنگ کر کے نہ صرف کیمونسٹوں کو حیران کر دیا بلکہ جنگ کا پانسہ بھی پلٹ کر رکھ دیا۔

جنوبی کوریا کے میرین انچون کے ساحل پر اترے جبکہ امریکی دستے جزیرہ والمی پر اترے جو کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔ یہ حملہ جنرل میک آرتھر کا ایک بہت بڑا جوا تھا جوں ہی اس کے دستے انچون سے یلغار کرتے ہوئے سیئول کی طرف بڑھے اسے کامیابی نظر آنے لگی۔ اس اپریشن میں کوئی امریکی ہلاک نہیں ہوا لیکن فوجی ذرائع کے مطابق یہ انتہائی خطرناک اور مشکل لینڈنگ تھی۔ انہیں کیچڑ اور بارودی سرنگوں کو عبور کرنا پڑا اور عمودی چٹانوں پر چڑھنے کے لئے المونیم کی بنی ہوئی خاص سیڑھیاں استعمال کرنا پڑیں۔ خاص بات یہ تھی کہ انہیں شمالی کوریا کی طرف سے بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

امریکی فوج نے دو دنوں کے مسلسل فضائی اور بحری حملوں سے دشمن کے بہت سے ٹھکانے تباہ کر دیئے۔ اس کاروائی میں شمالی کوریا میں پیانگ یانگ تک بمباری کی گئی۔ اقوام متحدہ کی فوج نے سیئول کے سو میل جنوب میں کن سن کے مقام پر بھی لینڈنگ کر کے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ امریکہ اور جنوبی کوریا کے دستے کیمونسٹوں کے پیچھے بھی اترے جس سے اقوام متحدہ کی افواج کو جنوب مشرق سے نکل کر آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

جنوبی کوریا کے دستے چین کی سرحد کے قریب پہنچ چکے تھے چھٹے ڈویژن کو اس وقت کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جب وہ شمالی کوریا کے پہاڑوں سے یلغار کرتا ہوا مانچوریا کی سرحد پر پہنچ گیا اور دریائے یالو کے ساتھ ساتھ گشتی دستے روانہ کئے۔

چین سے ماؤزے تنگ نے بھی اعلان کیا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر شمالی کوریا کو ختم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس وقت تک تیس ہزار دستے جنگ میں حصہ لینے کے لئے بھیج چکے تھے۔ ادھر کمیونسٹوں کے ہتھیار پھینکنے سے انکار کے بعد میک آرتھر نے شمالی کوریا پر حملے کی منظوری دے دی۔ میک آرتھر کے ترجمان نے ان رپورٹوں کی تردید کی کہ اقوام متحدہ کی افواج اور چینی سرحد کے درمیان کوئی بفر زون قائم کیا جائے گا۔ امریکی افواج شمالی کوریا کی فوج کے اوچھے ہتھکنڈوں سے سخت خائف تھی اڑسٹھ امریکی فوجیوں کی لاشیں شمالی کوریا کے علاقے سن چون کی ایک ریلوے سرنگ سے برآمد ہوئیں جو تمام جنگی قیدی تھے اور انہیں مشین گن کے برسٹ مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اب کوریا کی جنگ میں چین بھی شامل ہو چکا تھا۔ چینی اور امریکی فوجیں براہ راست تصادم کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ چین نے ملک کے شمال مغربی حصے پر دو ڈویژن فوج جنگ میں جھونک دی۔ مزید پانچ ڈویژن دریائے یالو کے دوسرے کنارے مانچوریا میں جمع تھی۔ تقریباً تین لاکھ کمیونسٹ لڑاکا فوج حرکت کرنے کے لئے حکم کی منتظر تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے جنرل میک آرتھر نے چینی حکومت پر سخت تنقید کی۔ چینی فوجوں نے مغربی محاذ پر مسلسل حملے جاری رکھے۔ یہاں اقوام متحدہ کی فوجوں کے ساتھ چینی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ اقوام متحدہ کی فوجوں نے بھاری توپ خانے اور فضائیہ کی مدد سے ''اوسان'' اور کم یانگ جنگ سے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ وسطی کوریا میں جہاں سخت اور دست بدست جنگ جاری تھی اقوام متحدہ کی فوجیں وان جو سے نکل گئیں جہاں وہ گھیراؤ کرتی ہوئیں کمیونسٹ فوجوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ کمیونسٹ فوج نے یکم جنوری **1951**ء کو **38** عرض بلد کی لائن پر ایک بڑے محاذ پر اپنے حملے کا آغاز کیا اور انہوں نے سیئول کے شمال اور شمال مشرق میں کئی مقامات پر اقوام متحدہ کے دفاع میں شگاف ڈالے تھے۔ امریکی

بمباروں کی مسلسل بمباری کے باوجود کیمونسٹ ڈویژن جنوبی کوریا کے مغربی اور وسطی محاذوں میں سرایت کر گئے۔ جبکہ اقوام متحدہ کی فوج کو ایک نئی دفاعی لائن بنانے کی کوشش میں جنوب کی سمت پسپا ہونا پڑا۔ حملے کے چار دن بعد جنوبی کوریا کا دارالحکومت سیئول کیمونسٹ حملہ آوروں کے قبضے میں آ گیا۔

امریکی صدر روز ویلنٹ نے اس شکست کا ذمہ دار میک آرتھر کو ٹھہراتے ہوئے اسے مشرق بعید کی کمانڈ سے سبکدوش کر دیا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ امریکی حکومت اور اقوام متحدہ کی پالیسیوں پر پوری دلجمعی سے عمل نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ یہ اپنی جگہ حقیقت تھی کہ میک نے چند روز قبل صدر کی خارجہ پالیسی پر تنقید کی تھی، جنرل کا کہنا تھا کہ امریکہ یورپ کے بجائے ایشیا پر زیادہ توجہ دے رہا ہے اور چیانگ کائی شک کی فارموسا میں مقیم فوج کو چین کی سرزمین پر دوسرا محاذ کھولنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میک آرتھر کی سبکدوشی اسی تنقید کا نتیجہ تھا۔ صدر نے فوری طور پر جنرل میتھیو رج وے کو اس کی جگہ نامزد کر دیا۔ حالانکہ جنرل میک آرتھر کے پاس کوریا کی جنگ میں بہت سے ٹائیٹل تھے اور واپس بلائے جانے پر وہ ان سب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

28 نومبر کو اقوام متحدہ اور کیمونسٹ نمائندے 38 درجے عرض بلد کی جنگ بندی لائن کے قیام پر متفق ہو گئے جو شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کو علیحدہ کرتی تھی۔ سمجھوتے کے اعلان کے فوری بعد جنگ بند ہو گئی۔ سمجھوتے میں یہ طے پایا کہ تمام متنازعہ معاملات باہمی مذاکرات سے حل کئے جائیں گے اور دونوں ممالک ایک دوسرے کے جنگی قیدی واپس کر دیں گے۔

سیٹو اور سینٹو معاہدے (1954ء)

1949-1950ء پاکستان کی قومی تاریخ کے اس اعتبار سے نہایت اہم سال ہیں کہ انہیں کے دوران پاکستان نے دنیا کی بڑی طاقتوں سے اپنے تعلقات کی نوعیتیں متعین کیں۔ 1949ء میں حکومت روس کی طرف سے اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو دعوت نامہ موصول ہوا اور سرکاری طور پر یہ دعوت نامہ اسی سال جون میں قبول کر لیا گیا۔ اس وقت روس اور پاکستان کے تعلقات کے درمیان کوئی ناخوشگواری نہیں تھی۔ 1949ء میں ہی روسی مصنفین کے ایک وفد نے پاکستان کا دورہ کیا، اس وفد کے ارکان نے واپس جا کر پاکستان کے متعلق جو کچھ لکھا اس کا انداز ہمدردانہ نہ تھا۔ لیاقت علی خان کے دورہ روس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ امریکی صدر ٹرومین نے بھی پاکستان کے وزیر اعظم کو اپنے ملک کے دورہ کی دعوت دی۔ یہ دعوت نامہ مئی 1950ء میں قبول کر لیا گیا۔

لیاقت علی خان کو دعوت ناموں کی موصولی کی ترتیب کے مطابق پہلے روس اور پھر امریکہ کا دورہ کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے دورہ امریکہ کو مقدم گردانا اور اس واضح ترجیحی سلوک نے پاکستان اور روس کے تعلقات میں سرد مہری کا آغاز کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سرد مہری بڑھتی گئی اور پاکستان امریکہ کا دفاعی حلیف بن جانے کے بعد یہ سرد مہری کشیدگی میں بدل گئی اور ہم دنیا کے دو طاقتور بلاکوں میں سے ایک کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئے۔ امریکہ سے اقتصادی معاہدات کی ابتداء اگرچہ 1951ء میں ہوئی اور ان معاہدات نے بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

دفاعی معاہدات نے پاکستان کو ایک بلاک کا بستہ فتراک اور دوسرے بلاک کا مستقل مغضوب و معتوب بنا دیا۔

کیمونزم ایک بین الاقوامی سامراج تھا اور کیمونسٹ ممالک امریکہ اور یورپی ممالک ایک دوسرے کے سخت حریف تھے۔ ان دونوں کے درمیان سرد جنگ جاری تھی جو نظریات کی جنگ کم اور اقتدار کی جنگ زیادہ تھی۔ امریکہ کی اپنی مصلحتیں تھیں اور روس کی اپنی ترجیحات تھیں، ان دونوں کی مصلحتیں اور ترجیحات آپس میں ٹکراتے تھے تو پوری دنیا متاثر ہوتی تھی، خصوصاً وہ مشرقی ملک جو نو آزاد تھے اور جن کے سیاسی اور قومی مزاج میں توانائی کی کمی یا فقدان تھا۔ 1950ء میں کوریا میں جو جنگ ہوئی وہ واضح طور پر امریکہ اور روس کی جنگ تھی اس جنگ میں روس کی شہہ پر چین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ میں امریکہ کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اگر انہوں نے فوراً پیش بندی کے لئے اقدامات نہ کئے تو معاملات اس حد تک بگڑ جائیں گے کہ ان کا سنبھالنا ان کے بس میں نہیں رہے گا۔ ان کے اس احساس کو 1953ء 1954ء میں ہند چینی میں اور 1954ء میں لاؤس میں کیمونسٹوں کے ہاتھوں فرانسیسیوں کی شکست سے اور زیادہ تقویت ملی۔ چنانچہ اس وقت امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر نے اپنے ایک بیان کے ذریعہ جنوب مشرقی ایشیا میں کیمونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اثرات پر تشویش کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ اس علاقہ کو کیمونسٹوں کے چنگل سے آزاد رکھنے کے لئے مشترکہ دفاع کی ضرورت ہے۔ اس مشترکہ دفاع میں متعدد مشرق کے نو آزاد ملکوں کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی

جون 1954ء میں امریکہ کے صدر آئزن ہاور اور برطانوی وزیر اعظم کی ملاقاتوں اور پھر 2 جولائی 1954ء کے معاہدہ جنیوا کے بعد ستمبر 1954ء میں منیلا میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا کے تحفظ کے لئے ایک تنظیم کی

تشکیل تھا۔اس کانفرنس میں امریکہ،فرانس ،نیوزی لینڈ،پاکستان ،تھائی لینڈ، آسٹریلیا،
فلپائن نے شرکت کی۔امریکہ نے اس تنظیم کو کیمونسٹ خطرہ کے انسداد کا ادارہ بنانے پر
سارا زور صرف کیا مگر پاکستان جیسے ممالک کے لئے دفاع کا صرف یہ نقطہ چنداں سود مند
نہیں تھا۔چنانچہ پاکستان کی طرف سے کانفرنس میں اس پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی اور
واضح کیا گیا کہ معاہدہ میں صرف کیمونسٹ حملہ یا جارحیت کے انسداد کی ضمانت نہ دی
جائے بلکہ اس قسم کی کوئی دفعہ رکھی جائے کہ معاہدہ کے ممبر ممالک میں کسی رکن پر حملہ
کیا جائے اور اس کا دفاع تمام رکن ممالک کی مشترک ذمہ داری ہوگی۔مگر امریکہ نے
یہاں بھی صرف اپنا مفاد پیش نظر رکھا اور پاکستان کا یہ مطالبہ صدا بصحرا ثابت ہوااور
امریکہ نے محض اس لئے گریز کیا کہ اس طرح بھارت کی جارحیت کی صورت میں امریکہ
کو پاکستان کی فوجی مدد کرنا پڑتی بہر حال اس معاہدہ پر 8 ستمبر 1954ء کو دستخط ہو گئے۔

سیٹو معاہدہ پر دستخط ہونے کی دیر تھی کہ کیمونسٹ ممالک کی طرف سے اس پر
شدید نقطہ چینی کی گئی پنڈت نہرو نے معاہدہ کو اقوام متحدہ کے چارٹر کی روح کے منافی
قرار دیا۔روس نے اس کو سامراج کے ہتھکنڈے سے تعبیر کیا۔

مشترکہ دفاع کا امریکی منصوبہ ابھی تک نامکمل تھا جنوب مشرقی ایشیا میں تو
امریکہ کی خواہش کے مطابق کیمونسٹ جارحیت کے خلاف دفاعی خطہ قائم ہو گیا لیکن
مشرق وسطیٰ کا علاقہ ابھی امریکی نقطہ نگاہ سے غیر محفوظ تھا اور یہاں غیر مستحکم حکومتوں اور
تیل کے ذخائر میں کیمونسٹوں کے لئے بڑی کشش تھی امریکہ نے سیٹو کا معاہدہ کرانے
میں کامیابی کے بعد مشرق وسطیٰ کا رخ کیا۔یہ علاقہ جغرافیائی اعتبار سے مسلمان ممالک پر
مشتمل ہے۔چنانچہ پہلے کوشش کی گئی کہ متعدد ہم خیال مسلم ممالک اس علاقہ میں کسی
دفاعی معاہدہ کی طرح ڈالیں۔سینٹو جس کا نام معاہدہ بغداد تھا اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔

سینٹو یعنی مشرق وسطیٰ کا نظام دفاع یا معاہدہ دفاع جس کی ابتداء میثاق بغداد

سے ہوئی پہلے ترکی اور عراق نے 24 فروری 1955ء کو دستخط کیے، معاہدہ کی بنیاد عراقی وزیر اعظم نوری السعید کی تحریک پر بغداد میں پڑی۔ معاہدہ میں دوسرے ملکوں کی رکنیت کے دروازے کھلے رکھے گئے چنانچہ اس اعلان کے بعد 14 اپریل کو برطانیہ، 23 ستمبر کو پاکستان اور 3 نومبر کو ایران اس میں شامل ہوئے۔ امریکہ اس معاہدہ میں شریک نہیں ہوا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ شریک ہوا تو عرب ممالک اس معاہدہ سے بدظن ہو جائیں گے۔ چنانچہ اپریل 1956ء کو حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ اس معاہدے کی صرف دو کمیٹیوں (اقتصادی کمیٹی، مخالف تخریب کمیٹی) میں شامل ہوگئی۔ مئی 1961ء میں امریکہ نے سائنٹیفک کونسل کی رکنیت بھی قبول کر لی۔

امریکہ اس میں شریک ہوتا یا نہ ہوتا اس سے کیا فرق پڑتا معاہدہ تو بہر حال امریکی مفادات کے تابع تھا۔ اس معاہدہ میں بھی کمیونسٹ ممالک کی تخریبی سرگرمیوں کے خلاف فوجی کاروائی کی دفعات رکھی گئی تھیں۔ معاہدہ میں ایسی کوئی دفعہ نہیں تھی کہ اگر ممبر ملکوں میں سے کسی ملک پر کوئی غیر کمیونسٹ حملہ ہو تو ممبر ملک اس کے دفاع میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اس طرح یہ معاہدہ بھی امریکہ کا ضمیمہ بن کر رہ گیا۔ 1959ء میں عراق میں شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد 5 مارچ 1959ء کو ترکی، ایران، پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہم معاہدہ پر انقرہ میں دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کا نام معاہدہ دفاع کے بجائے سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (CENTO) رکھا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ باہمی جھگڑوں کا فیصلہ گفت وشنید سے کیا جائے۔ 21 اگست 1959ء کو اس معاہدے کی معیاد پانچ سال مقرر کی گئی پھر اس میں مزید توسیع ہوتی گئی۔ اس دوران اس کے ترقیاتی منصوبے کے تحت ترکی ایران اور پاکستان نے سڑکوں ریلوے وغیرہ کی تعمیر کا انتظام کیا، حفظان صحت، توسیع تجارت اور دوسرے فلاحی کاموں کو بھی تقویت ملی۔ پھر بڑی سلطنتوں کی سیاست میں تغیر وتبدل اور خاص طور پر جب 1979ء میں

ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد نئی ایرانی حکومت نے سینٹو سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ایرانی حکومت نے اپنے اعلان میں کہا کہ ایران کی انقلابی اسلامی حکومت سینٹو کو اصولی طور پر سعد آباد پیکٹ سے مختلف نہیں سمجھتی اور یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ سعد آباد پیکٹ نے عملاً یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا مقصد سامراجی طاقتوں کے مفادات کے تحفظ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں جس کے تحت ایران کے عوام کا استحصال کیا گیا اور پیکٹ میں شامل ملکوں کے عوام کے مفادات کو قربان کر ڈالا گیا تھا۔

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ سعد آباد پیکٹ پر دستخط کرنے والے ممالک پر جب نازک وقت آیا تو اس پیکٹ کے تحت ان کی قومی سلامتی کے تحفظ کے لئے کچھ نہ کیا گیا یہی صورت حال سینٹو کی بھی ہے جس کے مقاصد سعد آباد پیکٹ سے مختلف نہیں سینٹو تنظیم نے بھی عملاً ثابت کر دیا ہے کہ اسے رکن ممالک سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اس کا بنیادی مقصد بڑی طاقتوں کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت دینا ہے اسی وجہ سے ایران کی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ایسے معاہدہ کا پابند رہنا ضروری نہیں جو رکن ممالک کے مفادات اور ان کی قومی سلامتی کو کوئی تحفظ فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس سینٹو اس علاقے کے عوام کے قومی مفادات کے لئے انتہائی نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ ہمارے ہمدرد ملک پاکستان نے بھی انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے اور دونوں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس تنظیم نے پاکستان کو درپیش مشکلات اور بحرانوں کو حل کرنے میں سرے سے کوئی مدد نہ کی بلکہ اس نے عالمی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔

ایران کی سینٹو سے علیحدگی کے اعلان کے اگلے روز پاکستان نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پاکستان نے اپنے سرکاری اعلان میں کہا کہ حکومت پاکستان تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی حالات اور اس خطہ میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں عرصہ سے اپنی سینٹو کی رکنیت پر غور کرتی رہی ہے اور اپنے برادر اسلامی ممالک سے مشورہ

کرنے کے بعد پاکستان نے اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سینٹو سے نکل جائے۔
اس کے فوراً بعد 15 مارچ 1979ء کو ترکی نے بھی اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا اور اس طرح یہ معاہدہ خود بخود ختم ہو گیا۔ معاہدے سے علیحدگی اختیار کرنے سے پہلے پاکستان، ایران اور ترکی نے آپس میں باہمی مشاورت کی اور تینوں اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں سینٹو تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے۔

معاہدہ امن ویتنام (ویتنام و امریکہ 1973ء)

دنیا کے بڑے بڑے مسائل میں ''ویٹ نام'' کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ خطہ سیاسی سرگرمیوں کا اکھاڑہ، مدبرین کی نگاہوں کا مرکز اور تاریخ کے طلباء کی دلچسپی کا خطہ تھا۔ یہاں مغربی جمہوریت اور مشرقی اشتراکیت کی جنگ ہو رہی تھی جو نظریاتی بھی تھی اور عملی بھی۔ اس خطہ کی تاریخ تو بہت پرانی ہے مگر اس کا سیاسی وجود عالمی مسائل پر اس سے پہلے کبھی اتنا اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد لڑی جانے والی جنگوں میں ویت نام کی جنگ طویل ترین لڑائی تھی۔ جس میں لاکھوں ویتنامی عوام نے اپنے جذبۂ حریت اور قربانی سے امریکہ اور اس کی پٹھو حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ویت نام کی اس جنگ نے عالمی سطح پر امریکہ کا وقار خاک میں ملا دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان نے فرانس کو شرمناک شکستیں دے کر ہند چینی سے مار بھگایا۔ جنگ کے خاتمے پر جب امریکہ کی طرف سے ایٹم بم چلانے کے نتیجے میں جاپان نے شکست تسلیم کر لی تو فرانس نے افسوسناک ڈھٹائی سے کام لے کر ویتنام پر اپنا غاصبانہ قبضہ دوبارہ جما لیا۔ لیکن اسے چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکا اور شمالی ویتنام کے انقلابی لیڈر ڈاکٹر ہوچی منہ کی زیر قیادت عوام نے اس شان کے ساتھ فرانسیسی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ امریکہ سے پوری فوجی امداد حاصل کرنے کے باوجود بھی فرانس کے لئے حریت پسندوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو گیا۔ فرانس مقتولان و مجروحان کی شکل میں اپنے اڑھائی لاکھ سے زیادہ سپاہیوں کی بھینٹ دے کر ہند چینی سے بھاگنے پر مجبور ہوا۔

فرانس نے کل اسی برس اس علاقہ پر حکومت کی اور تقریباً اتنا ہی عرصہ برطانیہ نے برما پر کی تھی۔ آخر کار 1874ء میں بڑے بڑے زمینداروں نے اپنے نوجوان شہنشاہ ''باضگی'' کی زیر کمان حکومت فرانس کے خلاف تحریک شروع کر دی جس کو دس

سال تک نہیں کچلا جا سکا۔ اس طرح مرکزی ویت نام میں مشہور سپہ سالار ''ہمانگ ہوتھان'' نے بیس سال تک حکومت فرانس کے خلاف محاذ قائم رکھا۔ جس کو بڑی مشکل سے کچلا جا سکا۔ 1917ء میں شمالی ویت نام میں باغیانہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ ویت نام کی تاریخ میں 11 فروری 1930ء جنگ آزادی کا دن سمجھا جاتا ہے۔ اس دن پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر حکومت فرانس کے خلاف بغاوت اور جنگ آزادی کا اعلان کیا گیا۔

1945ء میں جاپانی حملوں کی وجہ سے اور فرانس کی زوال پذیر طاقت کی بنا پر ویٹ نام کی ایک آزاد حکومت 1945ء میں قائم ہو گئی اور ''ہادانی'' اس کے پہلے شہنشاہ تسلیم کیے گئے۔ زوال جاپان کے بعد ویٹ نام کی ایک قومی جماعت ویٹ منہ لیگ نے بہت زور پکڑا اور اس کے صدر ہوچی منہ نے حکومت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس وقت تک فرانس کو اپنی مصیبتوں سے نجات نہیں ملی تھی۔ ستمبر 1945ء میں عوام کے مطالبہ پر نئے انتخابات کرائے گئے اور حکومت ہوچی منہ کے حوالے کر دی گئی مگر فرانس اس سے مطمئن نہیں تھا اس کے فوجی دستوں نے 23 دسمبر 1945ء میں ویٹ نام میں دوبارہ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر ہوچی منہ نے پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔ فرانس کو مجبور ہو کر ویٹ نام سے ایک معاہدہ کرنا پڑا یہ معاہدہ 20 مارچ 1946ء کو ہوا جس کے بعد ویٹ نام ایک آزاد ریاست بن گئی۔ اس معاہدہ کو ابتدائی معاہدہ کہا گیا تھا۔

فرانس نے اس معاہدہ کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے برابر اپنی جارحانہ کاروائیاں جاری رکھیں اور کئی محاذوں پر جنگی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی بڑے پیمانے پر ایک جنگ ناگزیر نظر آ رہی تھی۔ فرانسیسی ٹرکوں پر ہنوئی کی گلیوں میں اعلان کیا جا رہا تھا کہ شہری اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ فرانسیسیوں نے دھمکی دی کہ گھروں کی تلاشی لی جائے گی اور مسلح شہریوں کو موقع پر ہلاک کر دیا جائے گا۔ جس گھر سے فرانسیسی فوجی پر گولی چلائی گئی اسے تباہ کر دیا جائے گا۔ جس کے بعد ویٹ نام کی انقلابی جماعت کے صدر اور ہوچی منہ اور دوسرے افسران فرار ہو گئے اور انہوں نے اپنے تمام لوگوں کو مسلح ہونے کا حکم دے دیا۔ لیکن مجبوراً 14 ستمبر 1947 کو ایک معاہدہ کرنا پڑا، اس کے بعد بھی فرانسیسی حکام برابر تیاریوں میں مصروف رہے اس کے متعلق 6 اپریل 1946ء کے کمانڈر انچیف

کا وہ حکمنامہ موجود ہے جو اس نے اپنی فوجوں کو خفیہ طور پر گوٹو اور علاقہ تنگ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔

الغرض 1946ء سے 1964ء تک کا زمانہ ایک جانب فرانس اور دوسری طرف کیمونسٹوں اور قوم پرستوں کے درمیان جنگ کا زمانہ تھا۔اب صورت حال یہ تھی کہ ایک ملک ہونے کے باوجود دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں ایک کی قیادت شاہ باؤ دائی کے ہاتھ تھی تو دوسری کی قیادت انتہا پسند نیشلسٹ اور کیمونسٹ لیڈر ہوچی منہ کر رہے تھے۔امریکہ اور برطانیہ نے فوری طور پر شاہ باؤ دائی کے ویت نام کو تسلیم کر لیا۔نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا بھی اس کی پیروی کرنے کو تیار تھے۔ہوچی منہ کی حکومت کو بھی روس نے تسلیم کر لیا، پولینڈ، چیکوسلواکیا، بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ، البانیہ اور شمالی کوریا نے بھی ہوچی منہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

ہوچی منہ کے پاس ملک تو تھا لیکن دارالحکومت نہیں تھا اور وہ فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انڈر گراؤنڈ روپوش ہو چکا تھا۔جنوری کے اختتام پر فرانس کی نیشنل اسمبلی نے ایک سمجھوتے کی منظوری دی جس کے تحت ویت نام لاؤس اور کمبوڈیا کو فرانسیسی یونین کی ریاستوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تھا۔جس کے بعد انقلابیوں نے فرانسیسی فوجوں کو ناکوں چنے چبوانے شروع کر دیئے اور فرانسیسی فوجوں نے کیمونسٹوں کے غیض وغضب کا شکار ہو کر گوریلوں کے خلاف کاروائی کے لئے امریکہ سے مدد کی اپیلیں کرنی شروع کر دیں۔یہ کیمونسٹ گوریلے اس امریکی اسلحہ سے لیس تھے جو ماؤزے تنگ کی فوجوں نے پسپا ہوتی ہوئی نیشلسٹ فوجوں سے چھینا تھا اور ان کی تربیت چینی کمانڈروں نے کی تھی۔

یہ گوریلے فرانسیسیوں کے تعاقب میں تھے لیکن انہیں شدید فضائی بمباری کر کے منتشر کر دیا گیا لیکن جب تک فرانسیسی ڈونگ کھی پر دوبارہ قابض ہوئے اس وقت تک ان کا بھاری جانی نقصان ہو چکا تھا۔امریکہ کے نزدیک شمالی علاقہ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی کا شکار تھا اور اس علاقے کو روس کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اس کی فوجی اور اقتصادی امداد ضروری تھی۔دوسری طرف ویٹ نام میں چین کے راستے

روسی اسلحہ برابر پہنچ رہا تھا۔ فرانس کو بالآخر مئی 1954ء کو ڈین بین پھو کے مقام پر قطعی شکست ہوئی اس اثناء میں باؤ دائی نے سائیگان کو اپنا دارالحکومت قرار دے کر ویٹ نام کی مملکت قائم کر لی۔

اس طویل جنگ کے بعد بالآخر فرانس نے اپنی شکست سے مجبور ہو کر جنیوا میں 21 جولائی 1954ء کو ویٹ منہ کے ساتھ صلح نامے کی دستاویزات پر دستخط کر دیئے۔ جس کے تحت ویٹ نام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کے شمالی حصے پر کیمونسٹوں کا کنٹرول تھا جب کہ جنوبی ویٹ نام پر فرانس کی عملداری میں شاہ دائی کی حکومت قائم تھی۔ سمجھوتے کے مطابق یہ عبوری حکومتی انتظام تھا۔ دس ماہ کے بعد ایک ریفرنڈم کے ذریعے سے ملک دوبارہ یکجا ہو جائے گا۔ 26 اکتوبر 1955ء کو جنوبی ویٹ نام کی جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جس کا صدر نگوڈین ڈیم تھا۔

جنگ بندی کے معاہدے کے قریباً دو سال بعد کیمونسٹ ویٹ کانگ نے شمالی ویٹ نام کی مدد سے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ ابتداء میں امریکہ جنوبی ویٹ نام کو گوریلا سرگرمیوں کے لئے صرف امداد دیتا رہا لیکن اس امداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔

4 اگست کو امریکہ نے شمالی ویٹ نام پر الزام عائد کیا کہ اس نے خلیج ٹانکن میں امریکی جہازوں پر بلا اشتعال فائرنگ کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ چین نے الزام مسترد کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نے من گھڑت سانحہ عذر تراشا ہے جس میں امریکہ کے دو تباہ کن جہازوں اور شمالی ویٹ نام کی متعدد تارپیڈو کشتیوں نے حصہ لیا۔ امریکہ کے جنگی جہاز جس جگہ موجود تھے وہاں شمالی ویٹ نام کا ایک بھی جنگی جہاز موجود نہ تھا۔ حقائق نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نام نہاد سانحہ سفید جھوٹ ہے اور امریکی سامراج نے ہند چینی میں جنگ پھیلانے کے لئے عذر تراشا ہے اور حقیقت بھی تھی۔

5 اگست 1964ء کو امریکی دھمکیوں سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کے لئے سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں امریکہ نے روس کی یہ تجویز قبول کر لی کہ شمالی ویٹ نام کو سلامتی کونسل میں آ کر اپنا موقف بیان کرنے کی دعوت دی جائے۔ جس وقت سلامتی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت اقوام متحدہ کے باہر سینکڑوں لوگ امریکی جارحیت

کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے۔

6 اگست 1964ء کو سینٹ اور ایوان نمائندگان نے متفقہ طور پر امریکی صدر جانسن کو شمالی ویٹ نام کے کمیونسٹوں پر کھلے حملوں کی اتھارٹی دے دی۔ صدر جانسن نے اپیل کی تھی کہ شمالی ویٹ نام کی کشتیوں نے خلیج ٹونکن میں امریکی جہازوں پر بلا اشتعال حملے کئے ہیں۔ صدر جانسن نے امریکی ٹیلیوژن پر اعلان کیا کہ انہوں نے پی ٹی کشتیوں اور کیمونسٹوں کی ساحلی تنصیبات پر ہوائی حملے کا حکم دے دیا ہے۔

کانگرس کے ارکان نے ویٹ نام میں امریکی فوج کے کردار پر تشویش کا اظہار کیا ان کا خیال تھا کہ امریکی افواج کو ایک ایسی جنگ میں دھکیلا جا رہا ہے جس سے بچا جا سکتا ہے۔ چین نے امریکی حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے اس ماہ کے شروع میں شمالی ویٹ نام کے ساحلی شہروں میں بم برسائے اور امریکہ نے شمالی ویٹ نام کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکائے ہیں۔ امریکہ کے ساتویں بیڑے کے مزید اٹھائیس جنگی جہاز شمالی ویٹ نام کی طرف روانہ ہو گئے۔ امریکہ نے اپنے جیٹ لڑاکا طیاروں کے دو سکواڈرن اور تمیس ٹینک تھائی لینڈ بھی روانہ کر دیئے۔ اس طرح امریکہ نے اس جنگ میں سرگرمی کے ساتھ عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ دوسری طرف روس اور چین ویٹ کانگ اور شمالی ویٹ نام کی پشت پر تھے۔

امریکی وزیر دفاع مسٹر میکنا مارا نے ٹیلی ویژن پر اعلان کیا کہ شمالی ویٹ نام کے خلاف حملے بڑے کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی اور چارہ کار نہ ہوا تو ہم شمالی ویٹ نام کے شہروں پر بھی حملے کریں گے۔ چین نے شمالی ویٹ نام پر امریکی حملے کو چین پر حملہ قرار دیا اور کہا کہ امریکہ کو اس اشتعال انگیزی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ چین نے امریکی حکومت کو خبردار کیا کہ شمالی ویٹ نام پر امریکی حملہ جنگ کے کنارے پہنچ گیا ہے۔ امریکہ اپنی مسلح اشتعال انگیزیاں فوراً بند کرے ورنہ ان سے جو خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اس کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوگی۔ چینی عوام شمالی ویٹ نام کی امداد کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ امریکہ کے اس اقدام سے جمہوریہ ویٹ نام کو جارحیت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے کاروائی کا حق

ہے۔شمالی ویٹ نام سوشلسٹ برادری کا رکن ہے اور اس کے خلاف جارحیت کے ارتکاب پر کوئی سوشلسٹ ملک ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتا۔شمالی ویٹ نام پر امریکی حملوں سے ہند چینی میں جنگ پھیلانے کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔

امریکی حملوں کے بعد شمالی ویٹ نام کی حکومت نے خبردار کیا کہ امریکہ کا یہ اقدام جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔شمالی ویٹ نام کے باشندے امریکی جارحانہ کارروائیوں کو ناکام بنا دیں گے۔جنوبی ویٹ نام کی حکومت نے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔اعلان میں کہا گیا کہ ملک مارشل لاء کے تحت دے دیا گیا ہے قومی سلامتی کے متعلق مقدمات فوجی عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے جو مجرموں کو سزائے موت دے سکیں گی۔

13 ستمبر 1964ء کو جنوبی ویٹ نام کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔اس سے پہلے 25 اگست کو انہیں طلباء کے زبردست مظاہروں اور بودھوں اور عیسائیوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات کے باعث اقتدار سے محروم ہونا پڑا تھا لیکن 27 اگست کو جب حکمران فوجی ٹولی توڑ دی گئی اور اُن کی جگہ تین جرنیلوں پر مشتمل حکومت قائم کی گئی جن میں جنرل کھان بھی شامل تھے جو دوبارہ وزیر اعظم بن گئے۔

میجر جنرل کھان جنوری 1964ء میں کسی خونی انقلاب کے بغیر برسر اقتدار آئے تھے لیکن آٹھ مہینوں کے دوران انہیں وزیر اعظم اور صدر کے عہدہ سے الگ کرنے کی متعدد کوششیں ہوئیں۔ اگست میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے باعث ان کی مقبولیت میں کافی کمی واقع ہو گئی۔جب ملک میں تین جرنیلوں پر مشتمل حکومت قائم ہوئی تو جنرل کھان کی باقی دو جنرلوں سے نبھ نہ سکی تو اپنی جگہ ایک قائم مقام وزیر اعظم مقرر کر کے خود علاج کرانے کی غرض سے بیرون ملک چلے گئے۔حال ہی میں جنرل کھان کو ملک کا وزیر دفاع مقرر کیا گیا تھا لیکن میجر جنرل مہنہ نے ان کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔یہ اختلافات جنرل کھان کی حکومت کے خاتمے کا سبب بنے۔

7 فروری 1965ء کو جنوبی ویٹ نام میں امریکی اڈوں پر شمالی ویٹ نام کے حملوں کے بعد امریکہ نے فضائی جنگ کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔31 ستمبر 1965ء کو جنوبی

ویٹ نام کے چیف آف نگویان دان تھیو کو صدر منتخب کر لیا گیا۔ 23 دسمبر کو امریکی فوجیوں کو کرسمس کی مبارک باد دینے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے صدر جانسن نے ویٹ نام کا دورہ کیا۔ ویٹ نام کا مسئلہ اب ان کے لئے وبال جان بنا ہوا تھا اس لئے انہوں نے جنوبی ویٹ نام کے صدر تھیو سے درخواست کی کہ انہیں شمالی ویٹ نام کے نمائندوں سے مذاکرات کرنے چاہئیں لیکن صدر تھیو نے یہ کہہ کر درخواست کو رد کر دیا کہ وہ نیشنل بریشن فرنٹ یا کسی اور کو تسلیم نہیں کرتے۔

1968ء کے آغاز پر کیمونسٹوں نے پورے جنوبی ویٹ نام پر تیزی سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ جس کے بعد تھکے ہارے جانسن نے شمالی ویٹ نام پر تقریباً نوے فیصد حملے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب ان کے رخصت ہونے کے دن تھے۔ چنانچہ 6 نومبر 196ہ ء کو رچرڈ نکسن امریکہ کے نئے صدر منتخب ہو گئے جس کے بعد ہزاروں مظاہرین نے نیویارک میں احتجاجی مظاہرہ کیا کیوں کہ اب تک اس جنگ میں 33.641 امریکی فوجی ہلاک ہو چکے تھے۔ اس جنگ میں امریکہ کی شرکت خطرناک حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ جنگ کسی منطقی نتیجے پر پہنچتی 3 ستمبر 1969ء کو شمالی ویٹ نام کے انقلابی لیڈر ہوچی منہ 79 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس سے پہلے صدر جانسن جاتے جاتے ویٹ نام سے امریکی فوجیوں کے پہلے دستے کی واپسی کا اعلان کر چکے تھے۔

صدر نکسن نے ویٹ نام میں امن کو انتخابی نعرے کے طور پر استعمال کیا چنانچہ انہوں نے عوام سے کیا گیا اپنا وعدہ پورہ کرنے کے لئے مسٹر ہنری کسنگر کو اپنا مشیر خصوصی مقرر کیا جس نے شمالی ویٹ نام کی حکومت کے ساتھ خفیہ مذاکرات کا آغاز کیا۔ جس کے بعد امریکی فوجیوں کو شمالی ویٹ نام پر حملوں سے روک دیا گیا۔ لیکن یہ مذاکرات بوجوہ ناکام ہو گئے، چنانچہ ایک مرتبہ پھر شمالی ویٹ نام پر بمباری شروع کر دی گئی۔ اس بمباری میں بڑے پیمانے پر بی-52 قسم کے طیاروں نے ہنوئی اور ہائی فونگ پر وسیع حملے کئے۔ جنگ میں کئی مرحلے ایسے آئے جس سے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس جنگ کے شعلے بھڑک کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے اور تین بڑی طاقتوں کا تصادم بنی

نوع انسان کو ایک خوفناک ایٹمی تباہی سے دوچار کر دے گا۔

مذاکرات کے دوران ایک موقع پر جنوبی ویت نام کے صدر تھیو نے دھمکی دی کہ وہ امریکی پالیسی کو یکسر ناکام بنا دیں گے۔ جس کے جواب میں عین ممکن تھا کہ اگر جنوبی ویت نامی رہنما ہٹ دھرمی نہ چھوڑتے تو امریکہ شمالی ویت نام پر بمباری ترک کر کے جنوبی ویت نام کو فضائی امداد روک دیتا۔ دوسری طرف شمالی ویت نام کی ہنوئی گورنمنٹ صدر تھیو اور امریکہ دونوں پر پورا پورا دباؤ ڈال رہی تھی۔ شمالی ویت نامی وزیر اعظم پھام وان ڈونگ کے مطابق معاہدہ امن میں حسب ذیل نکات بھی شامل تھے۔

(1) جوں ہی عام باہمی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو ویت نام امریکی فوجوں کے انخلاء یا معاہدہ امن پر عمل درآمد کا انتظار کئے بغیر ہی تمام امریکی جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

(2) قیام امن کے فیصلے کے تین مرحلے ہوں گے پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ پوری امریکی فوجوں کے انخلاء کے بعد فائر بندی ہوگی۔ دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ ویتنام کی دونوں حکومتیں یعنی کیمونسٹ شمالی ویتنام اور سائیگان گورنمنٹ کے مابین براہ راست گفت و شنید ہوگی جس کے نتیجہ میں ایک سہ جماعتی عبوری حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور تیسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ تقریباً تین ماہ کی مدت میں قومی انتخابات کرائے جائیں گے تاکہ جنوبی ویتنام کی نئی پارلیمنٹ منتخب کی جاسکے۔

(3) کیمونسٹ عبوری مخلوط حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہ کریں گے اور نہ سائیگاؤں کے وفادار لیڈروں اور عوام کے خلاف انتقامی کارروائیاں کی جائیں گی۔

(4) امریکہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جنگ زدہ ویتنام کی تعمیر نو کے لئے امریکہ سرمایہ لگائے گا۔

دونوں فریق اس سمجھوتے کے کتنے نزدیک پہنچ چکے تھے اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ شمالی ویت نام کی وزارت خارجہ نے بڑے بڑے ممالک کے سفارتی نمائندوں سے یہ بھی کہہ دیا کہ امریکہ کے ساتھ سمجھوتے پر عملاً دستخط ہوا ہی چاہتے ہیں، فوجی معاہدے کی تفصیلات طے ہو چکی ہیں جن میں شمالی ویتنام کے سمندری

علاقے سے بارودی سرنگیں صاف کرنے اور قیدیوں کی رہائی کے لئے طیاروں کی سروس چلانے کے انتظامات بھی شامل ہیں۔ نیوز ڈیک کے بیورو چیف کے ذرائع کے مطابق شمالی ویتنام اور امریکہ کے مابین اصولی طور پر یہ طے پا چکا تھا کہ جنوبی ویتنام میں نئی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا اور

(1) فائر بندی کے بعد ایک عبوری مخلوط کمیٹی قائم کی جائے گی جو قومی انتخابات کا پروگرام طے کرے گی۔ اگرچہ مجوزہ کمیٹی میں جنوبی ویتنام کے صدر تھیو اور کیمونسٹ ویتنام کے نمائندے بھی ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی کمیٹی کا سربراہ نہیں بنایا جائے گا۔

(2) اگرچہ صدر تھیو سردست اس ساری تجویز کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں اس کے باوجود انہوں نے مجوزہ عبوری مخلوط کمیٹی کے لئے جنوبی ویتنام کے نمائندوں کی فہرست بھی تیار کر رکھی ہے

(3) یہ سارا سیاسی مسئلہ ایک بین الاقوامی نگران ادارے کے تحت حل کیا جائے گا اور اس سلسلے میں ادارے کے سربراہ کے لئے فرانس کا نام لیا جا رہا ہے جو غیر جانبدارانہ، منصفانہ انتخابات کرانے کا ضامن ہوگا۔

متذکرہ بالا تمام حقائق اور کوائف اس صورت حال کی نشان دہی کرتے ہیں کہ امریکہ اور شمالی ویتنام دونوں جنگ بند کرنے کی شرائط پر تمام توجہات مرکوز کر رہے ہیں۔ کیمونسٹوں نے صدر نکسن کے تمام ضروری مان لئے تھے جن میں سے ایک کا تقاضا یہ تھا کہ سمجھوتہ یا فیصلہ دو مرحلوں میں ہو۔ ہنوئی اور واشنگٹن میں فوجی معاہدہ ہو اور سیاسی سمجھوتہ کیمونسٹ ویت نام اور جنوبی ویت نام کے مابین ہو۔ صدر نکسن کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی شرائط پر جنگ ختم کرادی ہے اور وہ جنوبی ویتنام کے مستقبل کسی طرح بھی ذمہ دار نہیں ہیں امریکہ نے بھی کسی حد تک کیمونسٹوں کا موقف تسلیم کر لیا ہے کہ شمالی ویتنام کی فوج بے شک جنوبی ویتنام میں موجود رہے لیکن جنوبی ویتنام میں پوشیدہ یا دوسرے طریقوں سے مزید کیمونسٹ فوج داخل نہ کی جائے۔ اس سے بھی اہم بات امریکہ نے جنوبی ویتنام میں مخلوط حکومت کے قیام کا مطالبہ منظور کر کے تسلیم

کی ہے کیوں کہ اس سے تھیو کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے اور تھیو اس مسئلہ امریکہ سے بگڑے ہوئے تھے۔

شمالی ویتنام نے یہ سیاسی جوا کھیلنا بھی گوارہ کر لیا۔ اس کے لئے دو مجبوریاں تھیں ایک اس پر امریکی فضائیہ کی ہولناک بمباریاں اور دوسری طرف یہ امید کہ سیاسی میدان میں برتر حیثیت کیمونسٹوں ہی کو حاصل رہے گی۔ اس وقت جنوبی ویتنام کے بیشتر حصوں پر کیمونسٹ فوجیں قابض تھیں اور ہنوئی گورنمنٹ یہ چاہتی تھی کہ اس صورت حال کی موجودگی میں تصفیہ یا سمجھوتہ 7 نومبر 1972ء سے پہلے پہلے ہو جائے کیوں کہ اگر صدر نکسن دوبارہ صدارتی انتخاب جیت گئے تو پھر ان سے نمٹنا آسان نہ ہوگا۔ یہی وہ صورت حال تھی جس کے پیش نظر صدر نکسن نے ڈاکٹر ہنری کسنگر کی زیر قیادت اپنے سیکرٹریون، مشیروں اور معاونوں کی ایک طاقت ور ٹیم سائیگاؤں بھیجی لیکن دوسری طرف صدر تھیو نے ہٹ دھرمی جاری رکھی جس کی بنا پر یہ تمام کوششیں ضائع ہوگئیں اور ویتنام پر ایک مرتبہ پھر جنگ کی ہولناکیاں طاری ہوگئیں۔

اندرون خانہ بات یہ تھی کہ اکتوبر کی مفاہمت سے اتفاق کرنے کے بعد امریکہ نے دوبارہ سوچا تو اسے خیال آیا کہ یہ معاہدہ مکمل طور پر تسلی بخش نہیں ہے چنانچہ وہ خود بھی بعض تبدیلیوں کا خواہاں تھا اور اس کے لئے صدر تھیو کو ڈھال بنا لیا گیا تھا جب شمالی ویت نام نے یہ تبدیلیاں کرنے سے انکار کر دیا تو امریکہ نے شمالی ویت نام کے درالحکومت ہنوئی میں وحشیانہ بمباری شرع کر دی۔ یہ بمباری امریکہ کو مہنگی پڑی کیوں کہ صرف گیارہ دن کے اندر اس کے سولہ ''بی باون'' تباہ ہو گئے جن کی قیمت کروڑوں روپے بنتی ہے چنانچہ اس نے آبادیوں پر بمباری بند کر کے صرف فوجی اڈوں کو نشانہ بنانا جاری رکھا۔ دوسری طرف شمالی ویٹ نام بھی بات چیت کے لئے تیار تھا چند روز کے اندرا اندر امریکہ نے محسوس کیا کہ مکمل مفاہمت قریب ہے چنانچہ اس نے پورے شمالی ویت نام پر بمباری اور گولہ باری روک دی اور اس انتظار میں رہا کہ اب اس کے بدلے میں شمالی ویٹ نام بھی خیر سگالی کا ثبوت فراہم کرے۔

آخر امریکی صدر نکسن کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں 24 جنوری 1973ء

27 جنوری 1973ء کو ایک مرتبہ پھر ویٹ نام میں قیام امن کے لیے دونوں فریقوں نے جنگ بندی کا معاہدہ کرنے پر اتفاق کیا۔ معاہدہ کے تحت دنیا کی سب سے طویل ہلاکت خیز اور تباہ کن جنگ 26 جنوری 1973ء کو پاکستان کے وقت کے مطابق 5 بجے صبح غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو گئی۔

(1) معاہدہ امن 27 جنوری کو بروئے کار آجائے گا جس کے ساٹھ دن کے اندر اندر امریکی فوجیں ویٹ نام سے نکل جائیں گی۔ لاوس اور کمبوڈیا سے بھی غیر ملکی فوجیں واپس بلائی جائیں گی۔ جبکہ فائر بندی کے بعد شمالی ویٹ نام کی فوجیں بدستور جنوبی ویٹ نام میں رہیں گی۔

(2) معاہدہ کے تحت شمالی ویٹ نام تمام امریکی جنگی قیدی رہا کر دے گا۔

(3) ویٹ نام کا مسئلہ طے کرانے کے لیے بین الاقوامی کانفرنس ایک ماہ تک ہوگی جو جنگ بندی کی ضامن ہوگی اور جس میں امریکہ، شمالی ویٹ نام، جنوبی ویٹ نام، ویٹ نام کی عبوری انقلابی حکومت، روس، چین، فرانس، برطانیہ، کینیڈا اور انڈونیشیا شریک ہوں گے۔

(4) فائر بندی پر عملدرآمد کے لیے تین مرحلوں کا ایک نظام بھی قائم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے جو بین الاقوامی کمیشن قائم کیا جائیگا اس میں کینیڈا ہنگری، انڈونیشیا اور پولینڈ کے ایک ہزار ایک سو ساٹھ ارکان شامل ہوں گے۔

(5) معاہدہ کے تحت جنوبی اور شمالی ویٹ نام نے 17 ویں خط متوازی کے تحت ایک کمیشن جنوبی ویٹ نام اور ویٹ کانگ گوریلوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو گا۔ دوسرے کمیشن میں امریکہ، شمالی ویٹ نام جنوبی ویٹ نام اور ویٹ کانگ گوریلوں کے تین سو نمائندے شامل ہونگے، کو غیر فوجی علاقہ تسلیم کیا اور اس کے احترام کرنے کا اعلان کیا گیا یہ انتظام عبوری ہوگا جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ویٹ نام کے مستقل تصفیہ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

(6) امریکہ اور شمالی ویٹ نام کو یقین ہے کہ اس کے ذریعے ہند چینی اور جنوب مشرقی ایشیا میں امن کی ضمانت مل گئی ہے، اس کے ذریعے جنوبی ویتنام کے

عوام کو یہ حق بھی مل گیا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ غیر ملکی مداخلت کے بغیر کر سکتے ہیں۔ یعنی وہ بات چیت کے ذریعے ویت کانگ اور شمالی ویت نام کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

اس معاہدے میں یہ صراحت کر دی گئی تھی کہ ویت نام کے دونوں حصوں کا اتحاد پرامن بات چیت کے ذریعے ہوگا۔

24 جنوری کو ہنوئی اور واشنگٹن سے سمجھوتے کا جب بیک وقت اعلان ہوا اس وقت امریکہ کے آنجہانی صدر جانسن کی میت دفن کرنے کے لیے واشنگٹن لائی جا رہی تھی۔ دونوں ملکوں کی طرف سے جاری ہونے والے اعلان میں کہا گیا کہ:

> "پیرس میں معاہدہ امن امریکی صدر کے خاص نمائندے ڈاکٹر کیسنگر اور شمالی ویت نام کے نمائندے مسٹر لی ڈک تھو کے درمیان ہوا جس پر 27 جنوری کو پیرس میں دستخط ہوئے۔ دستخط کرنے والوں میں شمالی ویٹ نام اور جنوبی ویت نام کے وزرائے خارجہ شامل تھے۔"

ڈاکٹر کیسنگر معاہدہ کا متن لے کر 25 جنوری کی صبح واشنگٹن پہنچے۔ جس کے فوراً بعد صدر نکسن نے کانگریس میں حزب اختلاف اور اپنی پارٹی کے لیڈروں اعلیٰ فوجی افسروں اور دفاع اور خارجہ امور کے ماہروں سے صلاح مشورہ کیا اس کے بعد انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا اور امریکی عوام کو ویٹ نام میں جنگ بندی کی خوشخبری سنائی۔

انہوں نے معاہدے کی خاص خاص باتوں کا انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ فائر بندی کی نگرانی کے انتظامات شروع کر دیئے گئے ہیں اور ہنگری، پولینڈ، کینیڈا، اور انڈونیشیا سے کہہ دیا گیا ہے کہ اپنے فوجی دستے تیار رکھیں جنھیں فوری نوٹس پر ویٹ نام بھیجا جائے گا جہاں وہ فائر بندی کی نگرانی کریں گے۔ گیارہ منٹ کی نشری تقریر میں صدر نکسن نے کہا کہ امریکہ اس موقف پر قائم رہے گا کہ جنوبی ویٹ نام کی جائز اور قانونی حکومت وہی ہے جس کے صدر نگوین پرن تھیو ہیں۔ صدر تھیو سے اس معاہدے

کی تیاری میں پورا پورا مشورہ لیا گیا اور وہ بھی اس سے مکمل طور پر متفق تھے۔ سابق امریکی صدر آنجہانی لنڈن بی جانسن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ بھی ویت نام میں امن قائم کرنے کی گہری خواہش رکھتے تھے۔ وہ میری پالیسی سے اتفاق رکھتے تھے اور قیام امن کے سلسلے میں میں نے جو بھی کوششیں کیں انھیں آنجہانی جانسن کی حمایت بھی حاصل رہی۔ صدر نکسن نے کہا کہ پوری قوم کو فخر ہے کہ اس کے پچیس لاکھ جوان مختلف موقعوں پر ویت نام میں امن و استحکام کے حصول کی جدوجہد کرتے رہے، ہمیں ان امریکیوں کی بہادری پر بھی فخر ہے جنہوں نے ویت نام کی جنگ میں جان دے دی ہے۔

ویت نام کی جنگ بند کرنے کے بارے میں جو معاہدہ ہوا اسے دنیا بھر میں سراہا گیا۔ چین نے اس معاہدہ کو ویت نام کے حریت پسندوں کی عظیم فتح سے تعبیر کیا اور توقع ظاہر کی کہ اس سے مشرق بعید اور ایشیا بھر میں کشیدگی کم ہوگی اور دنیا میں پائیدار امن کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ روس نے بھی جنگ بندی کے معاہدے کو ویت نام کے بہادر عوام کی فتح قرار دیتے ہوئے عالمی امن کے لیے نیک فال بتایا۔

اس متارکہ جنگ کے بعد ہند چینی میں امن کا خواب ابھی پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جنوبی ویت نام کی حکومت کو خدشہ تھا کہ جنوبی ویت نام میں زیر زمین کام کرنے والے اشتراکیوں پر جب تک قابو نہ پایا گیا امن قائم نہیں ہوسکتا۔ جنوبی ویت نام کے صدر تھیو نے پولیس حکام کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ متارکہ جنگ کے بعد ایک نئی سیاسی جنگ شروع ہوگئی ہے اور یہ جنگ ایک سال یا دو سال بھی جاری رہ سکتی ہے۔ جنوبی ویت نام کے وزیر خارجہ ٹران دان کا کہنا تھا کہ ان کی حکومت ویٹ کانگ کی عبوری انقلابی حکومت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ متارکہ جنگ کے باوجود جنوبی ویت نام میں از سر نو جنگ جاری ہے اور صدر تھیو نے حکم جاری کیا ہے کہ ویٹ کانگ کے ارکان کو فی الفور قتل کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ نے شمالی ویت نام کو دھمکی دی کہ اگر کمیونسٹوں کا ارادہ متارکہ جنگ کا احترام نہیں ہے تو امریکہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ از سر نو اسلحہ اور سپاہی ہند چینی کو ارسال کر

دے۔ کمبوڈیا کی جلاوطن حکومت کے سربراہ شہزادہ سہانوک نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ معاہدہ کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی توڑا جا چکا ہے۔ ہند چینی میں اس معاہدے کے باوجود امریکہ کے مقاصد اب بھی وہی ہیں جو اس سے پہلے تھے۔

ایک طویل اور صبر آزما دور کے بعد جب شمالی ویٹ نام کو یقین ہو گیا کہ امریکہ کے لئے اب جنوبی ویٹ نام کی عملی مدد کرنا مشکل ہو گیا ہے تو 10 مارچ 1975ء کو شمالی ویٹ نام نے اپنے فیصلہ کن حملے کا آغاز سائیگون سے 150 میل دور شمال میں صوبہ داریاک پر حملہ سے کیا۔ جنوبی ویٹ نام کی فوج نے بہت کمزور مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ بہت سے ٹینکوں کی مدد سے کمیونسٹ فوج نے 1973ء کی حد بندی لائن کو عبور کر لیا اور جنوب کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور فوج نے کمیونسٹوں کی سرکردگی میں دارالحکومت نوم پنہہ پر قبضہ کر لیا۔ نئی فوجی حکومت نے جسے امریکہ کی حمایت حاصل تھی اس حقیقت کے ادراک کے بعد کہ کمیونسٹ فوجیں شہر کے باہر ایک بڑا حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں بغیر جنگ لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ نوم پنہہ پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہونے والا ہے تو انہوں نے امریکی سفارتی عملے اور سفیر جان گنتھر ڈین کو ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے تھائی لینڈ پہنچا دیا۔ اس طرح بیس سال بعد امریکی فوجوں نے جنوبی ویٹ نام خالی کر دیا۔ 21 اپریل 1975ء کو شمالی ویتنام کی فوجیں جنوبی ویتنام کے صدر مقام سویگاں میں داخل ہو گئیں اور 30 اپریل کو شمالی اور جنوبی ویتنام نے متحد ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نئی مملکت کا نام سوشلسٹ ریپبلک آف ویتنام رکھا گیا اور سویگان کا نام بھی بدل کر ہوچی منہ سٹی رکھ دیا گیا۔

مصر اور اسرائیل کے معاہدے

معاہدہ سینائے (مصر و اسرائیل 1974ء)

یکم ستمبر 1974ء کو اسرائیل اور مصر کے درمیان عبوری طور پر باہمی امن اور اسرائیلی فوجوں کی واپسی کا ایک معاہدہ طے پا گیا یہ معاہدہ چار طویل حصوں پر مشتمل ہے جس کے 24 پیرا گراف خفیہ رکھے جائیں گے۔ یہ ایک خفیہ دستاویز ہے اس دستاویز کے ہمراہ دو نقشے بھی ہیں جو مصر اور اسرائیل کی تازہ فوجی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہیں، ان نقشوں میں بتایا گیا ہے کہ صحرائے سینا کے محاذ پر اسرائیلی فوجیں کس حد تک پیچھے ہٹیں گی اور مصری فوجیں کتنا آگے بڑھیں گی۔ کچھ علاقے کو غیر فوجی درمیانی حیثیت دی جائے گی تاہم اس علاقے پر مصر کو دسترس حاصل ہوگی۔ خبردار کرنے والے مراکو کے بارے میں بھی طے پایا کہ ان میں دو یا چار افراد متعین کئے جائیں گے۔ امریکہ ایسے مراکز کا انتظام اسرائیل اور مصر دونوں کے لئے کرے گا۔ ان مراکز کی مدد سے ہر دو ممالک کو ایک دوسرے کی فوجی نقل و حرکت کا پورا پورا علم حاصل رہے گا۔

اسرائیل کے سفارتی حلقوں کے مطابق اس معاہدے کے تحت نہر سویز کے مشرقی کنارے پر مصر اپنی فوجوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اسے سات ہزار سے آٹھ ہزار تک کر سکے گا۔ 1973ء کی جنگ میں جو اسرائیلی مارے گئے مصر ان کی نعشوں کی اس صحرا میں تلاش کر کے اسرائیل کے سپرد کر دے گا۔ مصر نہر کے مشرقی کنارے پر میزائل کا نظام قائم نہیں کرے گا نشیبا کا اطلاعاتی مرکز اسرائیل کے پاس رہے گا تاہم

امریکہ مصر کے لئے بھی ایسے معلوماتی مراکز کا اہتمام کرے گا۔نہر سویز سے اسرائیلی سامان کی آمد و رفت پر مصر کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔دونوں ملک آئندہ طاقت استعمال کرنے کی دھمکی نہیں دیں گے اور نہ ہی طاقت استعمال کریں گے۔بحیرہ احمر میں مصری فوج ناکہ بندی نہیں کرے گی۔معاہدے کے تیسرے حصے میں امریکہ کے سول ٹیکنیشنوں کی تعیناتی اور اسرائیل اور مصر کے درمیان بفرزون (غیر جانبدار علاقہ) کی حدود شامل ہیں۔ آخری حصے کو خفیہ رکھا جائے گا۔

اس معاہدے پر تمام دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں کیوں کہ امریکہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو ٹائم بم قرار دیتا تھا روس تقریباً چوتھائی صدی سے اپنے پاؤں مشرق وسطیٰ میں مضبوط کر رہا تھا ویت نام میں ناکامی کے بعد امریکہ کے لئے اپنے سیاسی حریف سے حساب چکانے کا یہ اچھا موقع تھا اور عالم اسلام کے لئے بھی یہ مسئلہ بہت اہم تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مسئلے کے حل میں تاخیر دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ کا باعث بن سکتی تھی جو امن عالم کے لئے تباہ کن ہوتی،اس لئے روس اور امریکہ دونوں اس مسئلے پر پوری توجہ دے رہے تھے۔امریکہ کے صدر فورڈ نے تو اس مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر اپنے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو خصوصی اختیارات کے تحت اس مشن پر تعینات کیا تھا جو اپنی ڈپلومیسی اور سحر انگیز شخصیت کے باعث یہ معاہدہ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔اس معاہدہ کے بعد روس کا ردعمل خلاف توقع نہیں وہ صحرائے سینا میں امریکی ماہرین کی تعیناتی پر سیخ پا تھا دنیائے عرب میں بھی اختلافات کی آگ بڑھک اٹھی اور صدر سادات بھی سیاسی مبصرین کی تعیناتی پر اپنے عوام میں متنازعہ فیہ ہو گئے۔

یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں بعض سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا کہ مصر کے اس معاہدے پر دستخط کرنے میں اقتصادی عوامل سیاسی عوامل کی نسبت زیادہ کارفرما رہے۔اس معاہدے کے بعد جہاں صدر سادات کو لیبیا،

شام، اردن اور فلسطینیوں کے غضب کا نشانہ بننا پڑا وہاں انہیں نہر سویز سے 20 کروڑ پاؤنڈ سالانہ آمدنی کے علاوہ اسی ہزار بیرل روزانہ تیل اور امریکہ سے تقریباً 25 کروڑ سٹرلنگ فوجی اور اقتصادی امداد بھی ملنے کی توقع تھی۔ مزید یہ کہ اسرائیلی فوجوں کے تقریباً 13 میل اور مشرق کی طرف ہٹ جانے سے نہر سویز نسبتاً زیادہ محفوظ ہو جائے گی۔ اگرچہ اسرائیل کی فوجیں 1967ء کی پوزیشن سے اب بھی 156 میل اب بھی مغرب کی طرف ہی ہوں گی۔

ڈاکٹر کسنگر نے کانگریس میں تقریر کے دوران یہ تسلیم کیا کہ اس معاہدے کے کچھ خفیہ حصے بھی ہیں یقیناً وہ اسرائیل کو محفوظ سرحدوں کی، مصر کو شام سمیت مقبوضہ علاقوں کے خالی کرنے کی اور فلسطینی ریاست کے قیام کی کوششوں کی یقین دہانیوں سے متعلق ہوں گے۔ ورنہ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ صدر سادات تین سے پانچ سال کے اندر اندر خشک ہو جانے والے تیل کے چشموں کی خاطر اس معاہدے پر دستخط کر کے پوری دنیائے عرب کے اتحاد کو قربان کر دیتے۔ جبکہ مصر کو یہ بھی معلوم تھا کہ امریکہ نے مصر کے مقابلے میں جس حد تک اسرائیل کو اقتصادی و فوجی امداد دینے کی ضمانت دی ہے اس سے اسرائیل تین سال کے اندر اندر ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن جائے گا۔

جب سے اسرائیل کو اقوام متحدہ سے خارج کرنے کی مہم شروع ہوئی تھی امریکہ سخت مضطرب تھا چنانچہ اس نے سفارتی سرگرمیاں تیز کر دیں اور بالآخر اسرائیل اور مصر کے درمیان ایک ایسا معاہدہ کرانے میں کامیاب ہو گیا جس میں فتح یقیناً امریکی ڈپلومیسی کو ہوئی کیوں کہ اس معاہدہ کی رو سے مصر اب طاقت استعمال نہیں کر سکتا تھا اور امریکہ نے اسرائیل کو بے پایاں فوجی امداد دینے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس طرح مصر نے بہت تھوڑے علاقے کے بدلے میں بہت زیادہ مہلت دے دی بلکہ وہ امریکہ کے خلوص پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہوئے یہ بھول گیا کہ دنیا کی ایک بڑی طاقت روس نے

ماسوائے اسلحہ کے آج تک کچھ نہیں دیا۔امریکہ بھی ایک بڑی طاقت ہے اور اس کے بھی کچھ اپنے مفادات تھے چنانچہ بعض مبصرین کا کہنا تھا کہ امریکہ نے وہی کردار ادا کیا ہے جو معاہدہ تاشقند کے وقت روس نے ادا کیا تھا۔بات چیت کے ذریعے اس وقت بھی مسائل کے حل کا اصول طے پایا تھا مگر کیا مسئلہ کشمیر حل ہو گیا؟ اسرائیل ہندوؤں سے کم چالاک نہیں اس نے علاقہ واپس کرنے کی بڑی بھاری قیمت وصول کی۔اب عرب یہی کر سکتے تھے کہ وہ اسرائیل کے خلاف بیان دیتے رہیں یا پھر امریکہ کے خلوص کو آزماتے رہیں۔یہ وہ کامیابی تھی جو اسرائیل کو میدان جنگ میں اور امریکہ کو عربوں کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنے کی دھمکیوں سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔یہی وجہ تھی کہ صدر فورڈ نے اس معاہدے کو اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا۔

معاہدہ کیمپ ڈیوڈ (1978ء)

کیمپ ڈیوڈ کا قیام وائٹ ہاؤس سے 70 میل دور میری لینڈ کیٹوکٹن پہاڑوں میں صدر اسراحت اور تفریحی مقام کے طور پر 1942ء میں عمل میں آیا، صدر آئزن ہاور نے اپنے پوتے کے اعزاز میں اس کا نام تبدیل کر کے کیمپ ڈیوڈ رکھ دیا اس سے پہلے صدر روز ویلٹ نے اس کا نام شنگری لاء تجویز کیا تھا کیمپ ڈیوڈ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کئی تاریخی بین الاقوامی میٹنگز ہوئیں، دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے یورپی اتحادیوں کے حملے کی منصوبہ بندی کی۔ نارمنڈی پر حملے کی منصوبہ بندی، آئزن ہاور اور خروشیف کی ملاقاتیں، بوائے آف پگز کے مباحث، ویت نام کی جنگ کے مذاکرات اور غیر ملکی شخصیات اور مہمانوں کے ساتھ بہت سی میٹنگز ہو چکی ہیں۔ صدر جمی کارٹر نے مشرق وسطیٰ کے رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کے لئے اسی جگہ کا انتخاب کیا جس کے نتیجے میں اسرائیل اور مصر کے درمیان کیمپ ڈیوڈ معاہدہ طے پایا۔

یہ بات صحیح ہے کہ 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر نے پہل کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ مصری فوجیں نہر سویز عبور کر کے صحرائے سینائی کے علاقہ میں داخل ہو گئیں جو دراصل مصری علاقہ تھا اور جس پر اسرائیل نے 1967ء میں جارحیت کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ اس جنگ میں بھی اسرائیل جارح تھا۔ کیوں کہ اس کا عرب علاقہ پر جنگ کے بعد بھی قابض رہنا ایک مسلسل جارحانہ عمل تھا۔ دوسرے اس جنگ میں بھی جارحیت کا ارتکاب پہلے اسرائیل نے ہی کیا۔ اسرائیلی فوجیں ایک عرصہ سے لبنان اور شام کے علاقوں پر نہ صرف چھوٹے چھوٹے حملے کر رہی تھیں بلکہ اس کے جہاز بھی ان ملکوں کے اندر جارحانہ پروازیں کر رہے تھے۔ غالباً اسرائیل کسی بڑی جارحانہ کاروائی کے لئے ابتدائی جانچ پڑتال اور تجربے کر رہا تھا۔ لیکن عرب سوئے رہتے اور کوئی کاروائی نہ کرتے

تھے۔ چنانچہ اسرائیل 1967ء کی جنگ میں عربوں کے ہتھیائے ہوئے علاقوں کے علاوہ بھی کچھ اور علاقے اپنے قبضے میں کر لیتا۔

(1) اسرائیل نے 1971ء میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں کو مستقل طور پر اسرائیل میں شامل کر لے گا۔ عربوں کو مستقل طور پر ان علاقوں سے دستبردار کرانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اسرائیل عربوں کے کچھ علاقوں پر مزید قبضہ کر کے ان کو سودے بازی کے لئے استعمال کرے۔

(2) امریکہ اور روس کا حالیہ سمجھوتہ (DETENTE) تھا اس سمجھوتے کے مطابق امریکہ مشرقی یورپ میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور روس جنوبی ایشیا میں مداخلت سے باز رہے گا۔

یہی وجہ تھی کہ امریکہ روس کی تجویز کردہ یورپی سلامتی کانفرنس کی مخالفت نہیں کر رہا تھا۔ روس نہ صرف ویتنام کے معاملہ میں نرم پڑ گیا بلکہ کمبوڈیا میں امریکہ کے کٹھ پتلی جنرل لان نول کی حکومت کی بھی مخالفت نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ روس شہزادہ سہانوک کا مخالف تھا۔ گو وہ اس مخالفت میں کمیونسٹ اور افریشیائی بلاکوں میں غلط فہمی سے بچنے کے لئے کوئی شدت نہیں دکھا رہا تھا۔ روس نے ویتنام کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں بھی نرم رویہ اختیار کر کے ایک طرح سے امریکہ کی مدد کی۔ پہلے روس مشرقی ویتنام کی مدد میں بہت سرگرم تھا لیکن جب امریکہ نے ویتنام کے ساحل پر سرنگیں بچھا دیں تو روس نرم رویہ اختیار کر کے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد برزنیف صدر نکسن سے ملنے گئے اور ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ جس میں غالباً یہ طے پایا کہ عرب اسرائیل تنازعہ کے متعلق فریقین یکساں پوزیشن اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے یہ سمجھوتہ عربوں کے خلاف تھا کیوں کہ امریکہ پہلے ہی اسرائیل کو مہلک ہتھیاروں سے مسلح کر چکا تھا۔ لیکن روس تقریباً دو سال سے عربوں کی مدد سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ جس کے خلاف مصر کے صدر انور سادات نے کئی بار اظہار خیال کیا تھا اور پھر غصہ میں آ کر روسی فوجی ماہرین کو ملک سے نکال بھی دیا تھا۔

اس نکسن، برزنیف ملاقات کے بعد ایک عرب اخبار میں ایک دلچسپ کارٹون

بھی شائع ہوا تھا جس میں نکسن برزنیف کو خیر باد کہتے وقت ان سے کہہ رہے ہیں ''مجھے عرب اسرائیل تنازعہ کے متعلق تفصیلی بات کے لئے پھر کبھی یاد دلا دینا'' اور اس کے جواب میں برزنیف کہہ رہے تھے ''مجھے کبھی یاد دلا دیجئے گا کہ میں آپ کو اس معاملہ میں یاد دلا دوں'' اس طرح عرب نکسن، برزنیف سمجھوتے کا شکار ہو گئے۔ ان تمام حالات نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ عرب اور اسرائیل اپنے جھگڑے کا خود ہی لڑ کر فیصلہ کر لیں۔ بڑی طاقتیں دونوں فریقوں کی مدد زیادہ زبانی جمع خرچ اور اقوام متحدہ میں حمایت تک محدود رکھیں۔ روس کچھ عرصہ سے سرگرم مدد صرف شام اور عراق کی کر رہا تھا جن کا وہ اپنے آپ کو سرپرست سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف روس نے کافی عرصہ سے مصر کی سرگرم مدد سے ہاتھ کھینچ رکھا تھا اور امریکہ اسرائیل کو وہ سارا سامان نہیں دے رہا تھا جو وہ طلب کرتا رہا تھا۔ امریکہ نے اسرائیل کو وہ فینٹم طیارے ضرور دیئے۔ لیکن وہ تمام برقی اور ریڈیائی سامان نہیں دیا جو مہلک ہتھیاروں کو مہلک ترین بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ نے سعودی عرب اور کویت کو اپنی گزشتہ روایات توڑ کر فینٹم طیارے اور میزائل مہیا کر دیئے۔ اگرچہ ڈیموکریٹ سینٹر شور مچاتے رہے کہ یہ سامان اسرائیل کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے اور بذریعہ شام و مصر اس سامان کے راز روس تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس اور امریکہ کے درمیان صرف نورا کشتی تھی اور ان دونوں سپر پاورز کو عربوں اور اسرائیلیوں میں حقیقی دلچسپی نہیں تھی؟ یہ ایک نہایت ٹیڑھا سوال ہے جس کا جواب اتنی آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بھارت کے ایک فوجی حکمت عملی کے ایک ماہر مسٹر کے سبرا انیم نے کہا تھا کہ امریکہ اور روس کے درمیان ''مقابلہ اور تعاون'' کا رشتہ قائم ہے۔ یعنی بظاہر یہ دونوں طاقتیں آپس میں تعاون کر رہی ہیں جو دیتانت کہلاتا ہے لیکن اندر سے ان کے درمیان مقابلہ کا جذبہ بھی موجود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ روس اور امریکہ دونوں لیبیا سے خلیج فارس تک کے علاقہ کو ایک نہیں بلکہ دو علاقے تصور کرتے تھے اور ان دونوں علاقوں کے ضمن میں ان کی دو پالیسیاں تھیں۔ ایک وہ علاقہ جو سرگرم جنگ میں ملوث تھا یعنی نہر سویز کے

دونوں طرف کا علاقہ اور دوسرا خلیج فارس کا تیل بردار علاقہ۔ روس نہر سویز کے اس پار کے تمام ملکوں کی موجودہ حکومتوں کے خلاف تھا۔ لیبیا کے کرنل قذافی روس کی کھلی مخالفت کرتے تھے۔ سوڈان کے جنرل نمیری روس کے اس لئے خلاف تھے کہ روسی ایجنٹ ان کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ مراکش اور تونس کی حکومتوں کو بھی روس ''رجعت پسند'' سمجھتا تھا۔ روسی حکمران مصر کے صدر سادات کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کیوں کہ انہوں نے صدر ناصر کی پالیسی (عرب نسل پرستی) کے برعکس اسلام ازم کی پالیسی اپنالی اور دائیں بازو کی جانب جھک گئے۔ انہوں کیمونسٹوں کے ساتھ بے حد سختی کی۔ اخوان المسلمین پر سے پابندیاں نرم کر دیں۔ حکمران عرب سوشلسٹ یونین سے کیمونسٹوں کو نکال باہر کیا۔ روسی فوجی ماہرین کو واپس بھیج دیا اور روس مخالف حکمرانوں (شاہ فیصل، کرنل قذافی اور شاہ حسین) کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کر لئے۔ اور وہ اس جنگ سے پیشتر امریکہ سے بھی تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

6 اکتوبر 1973ء کو جس جنگ کا آغاز ہوا اس سے ایک ہفتہ پیشتر حالات میں کشیدگی عروج پر پہنچ چکی تھی اور خاص طور پر اسرائیل کو جس بات نے زیادہ برہم کر دیا تھا ہنگری کی حکومت کا یہ اقدام تھا کہ اس نے دیانا میں یہودیوں کا وہ مرکز فوراً بند کر دیا جس کے ذریعے روس کے یہودی برابر ترک وطن کر کے اسرائیل پہنچ رہے تھے اور اس وقت تک تقریباً ساٹھ ہزار روسی یہودی اس مرکز کے ذریعے اسرائیل میں آ چکے تھے۔ یہ وہ واحد مرکز تھا جو روسی یہودیوں کو اسرائیل پہنچانے کا کام انجام دے رہا تھا۔ ہنگری کی حکومت کے اس فیصلے کا سہرہ فلسطینی فدائین کے سر تھا۔ مرکز کی بندش سے ایک ہفتہ پہلے فلسطینی فدائین نے روس سے آنے والی اس ٹرین پر قبضہ کر لیا جس میں روس کے یہودی تارکین وطن آ رہے تھے۔ ان میں سے چار یہودیوں ایک ہنگری سپاہی کو انہوں نے اغوا کر لیا اور ان کو اس شرط پر چھوڑنے کا اعلان کیا کہ اگر اس مرکز کو بند کر دیا جائے تو وہ گرفتار شدگان کو رہا کر دیں گے۔ چنانچہ ہنگری کی حکومت نے فوری فیصلے کے تحت اس مرکز کو بند کر دیا۔ تل ابیب جس جنونی کیفیت اور نشہ میں رہ رہا

تھا اس کے لئے یہ اقدام ناقابل برداشت تھا چنانچہ اس نے اس کا انتقام لینے کے لئے مصر اور شام پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

مصر اور شام اگر 5 اور 6 اکتوبر کی رات حملہ نہ کرتے تو اسرائیل حسب سابق اگلے ہی روز مصر اور شام کے ہوائی اڈے تباہ کر چکا ہوتا اور سویز کے مغربی کنارے کے اسماعیلیہ شہر پر قابض ہو چکا ہوتا۔ دوسری طرف شام کے دارالحکومت دمشق پر محاصرہ کی سکیم کو بھی عملی جامہ پہنا چکا ہوتا۔ اسرائیل 1973ء کے شروع سے ایک بھرپور حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ 28 ستمبر کو ایک اسرائیلی رہنما اریک شارون نے ایک معروف اسرائیلی روزنامے میں یہ صاف اعلان کر دیا تھا کہ ہم "مقبوضہ" علاقوں سے ایک بالشت بھی دستبردار نہیں ہوں گے اور ان کی حفاظت اور توسیع کے لئے عسکری طاقت کا استعمال کریں گے۔ 1967ء کی جنگ کے بعد اس نے جس وسیع پیمانے پر فوجی تیاریاں کی تھیں انہیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ آئندہ مزید علاقے حاصل کرنے کے لئے جلد ہی کوئی اقدام کرنے والا ہے۔

مصری محاذ پر جنگ میں جو کامیابیاں ہوئیں وہ غیر معمولی نوعیت کی تھیں، نہر سویز کا مشرقی کنارہ مصر کے قبضے میں آجانے کا مطلب یہ تھا کہ نہر کی عیشت بحال ہو جائے گی۔ فوری طور پر اصل فائدہ روس کو ہونا تھا کیوں کہ جمال عبدالناصر کے زمانے میں مصر نے روس سے جو قرضہ لیا تھا اس کے عوض مصر نے نہر سویز کو اس عرصہ تک روس کی تحویل میں دینے کا معاہدہ کیا تھا۔ روس کے طریقہ جنگ کے مطابق مصری فوجوں نے 160 کلومیٹر لمبی پٹی پر اپنی گرفت مستحکم کر لی جو پورٹ سعید سے لے کر پورٹ توفیق تک پھیلی ہوئی ہے اور وہاں مصری فوجیں سیناء کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مصری فوجوں نے سیناء میں تیل کے کنوئیں بھی اڑا دیئے تھے جن پر اسرائیل نے 1967ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ ان کنوؤں سے اسرائیل سالانہ سات ملین ٹن تیل برآمد کر رہا تھا اسے ان کی تباہی سے دس کروڑ ڈالر سالانہ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ اس جنگ میں مصر نے سینائی میں اپنا کھویا ہوا علاقہ تو واپس لے لیا لیکن فلسطینیوں کو یہ شکایت رہے گی کہ مصر نے یہ علاقائی جنگ لڑی ہے فلسطین کی آزادی کی جنگ نہیں لڑی۔

جولان کی پہاڑیاں اس سلسلہ کوہ کا جنوبی حصہ ہیں جو جبل الشیخ کے نام سے لبنان تک پھیلا ہوا ہے۔ پورے فلسطین کو سیراب کرنے والے دریا جبل الشیخ سے نکلتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا نہایت سرد ہے، یہی وجہ ہے کہ یہودیوں نے 1918ء میں اسرائیلی ریاست کا جو خاکہ تجویز کیا تھا اس میں جبل الشیخ شامل ہے۔ 1967ء میں اسرائیل نے جولان پر قبضہ کر کے اپنے قدیم خواب کو شرمندۂ تعبیر کر لیا تھا۔ ان چھ سالوں میں اسرائیل نے جولان کے اندر بیس قصبے تعمیر کیے ان قصبوں کو اسرائیلی اخبارات کیبوتز لکھتے ہیں۔ یہ فوجی چھاؤنیوں کی طرز پر بنائے جاتے ہیں اور ملی جلی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان تمام قصبوں میں اسرائیل ان مہاجرین کو آباد کر رہا تھا جو روس سے ہجرت کر کے یہاں پہنچ رہے تھے۔ روسی یہودیوں کے لئے یہ جگہ اس لئے منتخب کی گئی کہ اس کی آب و ہوا ان کے لئے نہایت سازگار تھی اور خود روسی حکومت کی وساطت سے روسی یہودیوں نے اپنے لئے اس سرد مقام کو مخصوص کرایا تھا۔

جنگی تجزیئے کے مطابق دمشق تر نوالہ نہیں تھا، اس لئے سقسع اور دمشق کے درمیان چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلے ہیں اور دمشق سے دس میل پہلے زیدانی کا پہاڑی سلسلہ حملہ آور فوج کے لئے ناقابل عبور ہے اور دمشق کے مسلمانوں کا یہ اعلان حجر پر نقش ہے کہ اسرائیلی فوجیں شامیوں کی لاشوں پر دمشق میں داخل ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسرائیل نے شام کی دو مشہور فوجی چھاؤنیوں پر جو درعا (شام اور اردن کی سرحد پر) اور قطنا (وسط سوریا) میں واقع ہیں۔ سخت بمباری کی اور بڑے قیمتی ذخائر کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن شامی محاذ کا ایک اور پہلو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ:

6 اکتوبر سے پیشتر شام کے اندرونی حالات نہایت خراب تھے۔ حلب، حمص اور حماہ میں سنی مسلمانوں کی کثیر تعداد جیلوں میں ڈال دی گئی تھی۔ وہ عید میلاد النبی پر تقریبات منعقد کرنا چاہتے تھے، مگر حکومت کی طرف سے انہیں اجازت نہیں دی گئی اور یہ کشمکش آخر کار فسادات اور خونریزی تک پہنچ گئی۔ شامی فوج کے اندر سنی مسلمان نکالے جا چکے تھے اور اعلیٰ مناصب اور دوسرے درجے کے عہدے تمام تر علوی فرقے اور دروزی فرقے کے لوگوں کے پاس تھے۔ پچھلے پانچ سالوں میں شام کے سنی

مسلمانوں نے علوی فرقے کے ہاتھوں بہت زک اٹھائی۔

دوسرے دروزیوں کی اسرائیلیوں سے جو وفاداری تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 19 ستمبر 1973ء کو جولان کی ٹیچرز یونین نے باقاعدہ طور پر اسرائیل کی ٹیچرز یونین میں ادغام کا اعلان کیا جبکہ سنی مسلمان جو اب بھی 6 لاکھ کے قریب بیت المقدس، الخلیل (جسے اب اسرائیل جبرون کہتا ہے) اور غزہ کے علاقے میں رہتے ہیں اور باوجودیکہ انتہائی ذلت و عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر ان میں کسی ایک مسلمان نے بھی اسرائیلی قبضہ کو جائز تسلیم نہیں کیا۔

اکتوبر 1973ء کی جنگ میں اردن کی پوزیشن نہایت مبہم اور پیچیدہ تھی جس طرح مصر نے سیناء کے محاذ پر شدید دباؤ ڈالے رکھا تاکہ شام پر اسرائیل کے دباؤ کو کم کیا جا سکے۔ اسی طرح اردن کا محاذ کھول کر ایسا اقدام کیا جانا ضروری تھا۔ عرب مصرین اردن کے موقف کا تجزیہ تین صورتوں میں کرتے تھے۔ پہلی صورت یہ کہ اردن کے لئے دریائے اردن کے مغربی کنارے پر جنگ چھیڑنا اس لئے مشکل تھا کہ (گو اردن کے پاس بہترین لڑاکا فوج تھی اور اس کی شجاعت اور پامردی کا مظاہرہ 1967ء کی جنگ میں دیکھنے میں آیا) اردن کے پاس فضائی طاقت حد درجہ کم تھی اور جب تک اردن کو فضائی تحفظ نہ ملتا اس کے لئے جنگ میں اترنا انتہائی خطرناک تھا۔ اس لئے اردن اس انتظار میں تھا کہ اسے فضائی تحفظ ملے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ شاہ حسین امریکہ اور اسرائیل کی اس سکیم کو قبول کر چکے تھے کہ اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کو ملا کر ایک فلسطینی ریاست قائم کر دی جائے اور فلسطینی ریاست اور اردن پر مشتمل ایک دولت متحدہ قائم کی جائے جس میں عمومی سرپرستی شاہ حسین کو حاصل ہو۔ البتہ فلسطینی ریاست کا اندرونی نظم و نسق فلسطینیوں کے ہاتھ میں ہو۔

فلسطینی ریاست کے لئے یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ اس کی کوئی فوج نہ ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی ذیلی ریاست اسرائیل کے لئے بھی آرام دہ ہو سکتی تھی اور شاہ حسین کے لئے بھی جو فلسطینیوں کے ہاتھوں انتہائی تنگ تھے۔ مصرین کے نقطہ نظر کے مطابق شاہ حسین اسی سکیم کی وجہ سے جنگ میں حصہ لینا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ شاہ حسین

کے بارے میں خود اسرائیل کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ستمبر میں اسرائیل کی حکمران پارٹی حزب العمل کے لیڈروں کے ایک اجتماع میں شمعون پیریس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''آج ہمارے اور اردن کے درمیان تعلقات قائم ہو چکے ہیں اگر ہم ان تعلقات کی تفصیل میں نہ جائیں اور صرف ان کے جوہر پر اکتفا کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جنگ سے بہت دور ہیں پس اس سے بڑھ کر اور ہمیں کیا چاہئے۔''

یہ بات بھی واضح تھی کہ اب صورت حال بدل چکی تھی اس لئے شاہ حسین کے لئے ضروری تھا کہ وہ بھی اس جنگ میں حصہ لیں اور سعودی عرب کے میراج طیارے اسے فضائی تحفظ مہیا کریں۔ دراصل اردن کا محاذ ہی اسرائیل کے لئے دنداں شکن جواب ہوسکتا تھا۔ اردن کا محاذ اس لئے بھی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کا رخ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی طرف تھا اور مسلمان اپنے قبلہ اول کو آزاد کرانے کے لئے بے تاب تھے۔

اس جنگ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ امریکہ اسرائیل کو نہ صرف مدد دے رہا تھا بلکہ خود بھی اس جنگ میں شریک ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسرائیل کو امریکہ کی کھلم کھلا امداد کے علاوہ خفیہ طور پر بھی پوری مدد دی جارہی تھی۔ ''دی ہیرلڈ آف فریڈم'' کے ناشر مسٹر فرینک کیبل نے فروری 1972ء کے شمارے میں ''خفیہ تحقیقات'' کے عنوان سے جو یادداشتیں لکھیں ان میں وہ لکھتا ہے کہ: ''امریکہ کی ساتویں فوج کے دو ڈویژن جو اب مغربی جرمنی میں مقیم ہیں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ جب مشرق اوسط میں جنگ چھڑ جائے تو وہ اسرائیل کا دفاع کریں۔'' اس سلسلے میں اور بھی دلچسپ باتیں ملتی ہیں جو اور بھی خفیہ امور کو بے نقاب کرتی ہیں جو اس وقت کے صدر امریکہ نکسن اور ان کے یہودی چیف ایڈوائزر ہنری کسنجر کے درمیان طے ہوئے تھے۔

جنگ شروع ہونے کے بعد عرب لیگ کا پہلا اجلاس 18 اکتوبر کو کویت میں منعقد ہوا جس میں عربوں نے پہلی بار اس امر کا فیصلہ کیا کہ اسرائیل کے ساتھ عربوں کے تنازعہ کو حل کرنے کے لئے تیل کو بطور حربہ استعمال کیا جائے۔ اجلاس کے بعد جب فیصلے کا سرکاری اعلان جاری ہوا تو اس میں پہلی مرتبہ ایک ایسے مسئلہ کو بھی اسرائیل اور عربوں کے درمیان تنازعہ کا ایک جزو بنا دیا گیا جسے پہلے ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا

رہا۔اس اجلاس میں بعض عرب ملکوں کا رویہ انتہائی سخت تھا چنانچہ عراق کے وزیر روغنیات سعدون ہمادی نے مطالبہ کیا کہ امریکہ کے تیل سے متعلق تمام مفادات کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ان کے اس مطالبے میں سعودی عرب کی تیل کمپنی آرسکو کو قومی تحویل میں لینا بھی شامل تھا۔انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ امریکی بنکوں سے سرمایہ نکال لیا جائے اور امریکہ سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیئے جائیں۔

بعض عرب ملکوں کا رویہ نرم تھا خصوصاً سعودی عرب کا خیال تھا کہ سعودی عرب نے امریکہ سے نئے کارخانوں کے سلسلے میں جو تکنیکی معاونت کی جو امید لگا رکھی ہے وہ متاثر ہوگی انہیں اپنے وزیر خارجہ عمر سقاف کے فون کا انتظار تھا جو اس وقت واشنگٹن میں صدر نکسن کے نام شاہ فیصل کا پیغام لے کر گئے تھے۔ وہ صدر نکسن کے ساتھ بات چیت کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔واشنگٹن سے فون آنے پر سعودی عرب بھی دیگر عرب ملکوں کا ہمنوا ہوگیا۔ یہ تیل کے موثر ہتھیار کے استعمال کا ہی نتیجہ تھا کہ صرف دو روز بعد ہی امریکہ کے یہودی وزیر خارجہ ہنری کسنجر ماسکو میں تھے۔

امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنگر 20 اکتوبر کو ماسکو پہنچ گئے اور انہوں نے روسی لیڈروں کے ساتھ جنگ بندی کے لئے بات چیت شروع کی۔جس کے بعد 22 اکتوبر کو امریکہ اور روس نے سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی ایک مشترکہ قرارداد جو کہ برطانیہ نے پیش کی، متفقہ طور پر منظور کر لی گئی جس کے تحت جنگ بندی کے فوراً بعد اسرائیلی فوجوں کو سلامتی کونسل کی قرار داد 242 کے تحت ان تمام علاقوں کو خالی کرنا ہوگا جن پر انہوں نے جون 1967ء کو قبضہ کیا تھا۔اس قرارداد کے دیگر نکات حسب ذیل ہیں۔

(1) جون 1967ء کے تصادم میں اسرائیلی فوجوں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا انہیں خالی کر دیں۔

(2) جنگ سے متعلق نقصانات کے تمام دعاوی ترک کر دیئے جائیں اور اس خطے کی تمام ریاستیں ایک دوسرے کی خود مختاری ، آزادی ،علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کا احترام کریں۔ایک دوسرے کے امن و چین سے رہنے کے حق کو تسلیم کریں اور اپنی سرحدوں کو ہر قسم کے خطرے سے محفوظ کرنے کے

اختیار کا احترام کریں۔

ایک درجن سے زائد ممالک ایسے ہیں جن کے پاس بے پناہ دولت ہے زبان ایک، کلچر ایک، مذہب ایک اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دشمن ایک۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں دو ملک بھی ایسے نہیں جن میں ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ اس دفعہ عربوں نے اپنی صفوں میں 1967ء کی نسبت اتحاد کا مظاہرہ بھی کیا اور جس موثر طریقے سے انہوں نے اسرائیل کے طلسم کو توڑا دنیا ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہوگئی۔

مصر کے انور سادات نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ دنیا کو مشرق وسطیٰ اور خصوصاً عرب ممالک سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ چنانچہ اسٹیٹس کو میں تبدیلی کی خاطر انہوں نے مصالحت میں پہل کی اور نومبر 1977 میں اسرائیلی پارلیمنٹ ڈیسیٹ کا دورہ کیا (یہ اقدام اسرائیل کو تسلیم کرنے سے کم نہیں تھا) سادات کا کہنا تھا کہ ہم اسرائیل سے لڑ سکتے ہیں لیکن امریکہ سے جنگ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ مصر کے صدر کے دورہ اسرائیل کے بعد دونوں ممالک کے درمیان خفیہ بات چیت کا آغاز ہوا اور 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ میں انور السادات اور اسرائیل کے میناہم بیگن کے درمیان ملاقاتیں ہوئیں۔ امریکی صدر جمی کارٹر بھی اس گفت وشنید میں موجود تھے۔

مارچ 1979ء میں کیمپ ڈیوڈ ہی کے مقام پر دونوں ممالک کے سربراہان اور نمائندوں کی کانفرنس بلائی گئی اور امریکی صدر نے ثالثی کا کردار ادا کیا۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں 26 مارچ 1979ء کو کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ یہ معاہدہ کل دس دفعات اور تین مشمولات پر مشتمل تھا۔ معاہدے کی رو سے اسرائیل سینائے کے علاقے سے دستبردار ہوا (حقیقتاً مصر کو اسرائیل کے حوالے سے صرف یہ رعایت ملی تھی کہ اسے اس کا یہ علاقہ واپس مل گیا) اور اس کے بدلے میں مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ معاہدے میں طے پایا کہ مصر نہر سویز سے اسرائیلی مال بردار جہازوں کو بلا معاوضہ گزرنے کی اجازت دے گا۔ اس کے علاوہ بحیرہ روم سے آنے والے کسی بھی ملک کے جہاز کو جس کی منزل اسرائیلی ریاست ہو، بلا معاوضہ آنے دے گا۔ اسٹریٹ آف ٹیرین اور خلیج عقبہ کو بین الاقوامی پانی سمجھتے ہوئے دونوں ممالک استعمال کریں گے۔ اسرائیل

اپنے تحفظ کے لئے مخصوص جگہوں پر اپنی فوجیں متعین رکھے گا اور فریقین کسی بھی نوعیت کے اختلاف اور تصادم کے باوجود اس معاہدے پر قائم رہنے کے پابند ہوں گے۔

یہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی شرائط تھیں جنہیں مجبوراً مصر نے تسلیم کیا۔ فلسطین میں اسرائیلی بربریت کے باوجود یہ معاہدہ تو ہو گیا لیکن اس سے مصر کو صرف اتنا فائدہ ہوا کہ اسے اس کے مقبوضہ علاقے واپس مل گئے اور امریکہ مصر کو ایک خطیر رقم (2 ارب ڈالر) بطور امداد دینے کا پابند ہوا۔ اس پر عرب ممالک نے غم و غصے کا اظہار کیا اور مصر کو عرب لیگ کی رکنیت سے خارج کر دیا۔ لیبیا اور شام میں مصر کے خلاف مظاہرے ہوئے اور مصر کے وزیر خارجہ نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے مصر کی سیاست پر اتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے کہ مصری حکومت کے خلاف وہاں کی عوام کے جذبات بھڑک اٹھے، دائیں اور بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے دونوں عناصر ان سے دور ہٹتے جا رہے تھے بائیں بازو والے صدر سادات کے امریکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کے خلاف تھے اور دائیں بازو والے الزام لگاتے تھے کہ صدر سادات نے مصر کے مسلمانوں کو مغرب کی بے مہار تہذیب سے منسلک کر دیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصری عوام کے اشتعال میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی اور وہ وقت بھی آیا کہ مصر کی ایک سیاسی اور مذہبی جماعت "جماعۃ الاسلامیہ" کے کارکنوں نے 6 اکتوبر 1981ء کو ایک فوجی پریڈ کے دوران انور السادات کو قتل کر دیا۔ کیمپ ڈیوڈ میں ہونے والے معاہدے نے انور سادات کو عرب دنیا میں ایک ناپسندیدہ شخصیت بنا دیا لیکن وہ بزعم خود اپنے ملک کو امن کی راہ پر گامزن کر گئے۔

معاہدہ فاک لینڈ (برطانیہ، ارجنٹائن 1982ء)

جزائر فاک لینڈ براعظم جنوبی امریکہ سے 300 میل کے قریب ہے جزیروں کا یہ گروپ لگ بھگ دو سو چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے ان تمام جزیروں کا کل رقبہ 4700 مربع میل ہے ان میں دو بڑے جزیرے زیادہ اہم ہیں ایک جزیرہ مشرقی فاک لینڈ کہلاتا ہے اور دوسرا مغربی فاک لینڈ دونوں کے درمیان تنگ سمندری راستہ ہے جسے فاک لینڈ ساؤنڈ کہتے ہیں۔ان دونوں بڑے جزیروں کا مجموعی رقبہ چار ہزار تین سو مربع میل ہے۔

فاک لینڈ کے زیر اثر دوسرے اہم جزائر کے گروپ فاک لینڈ کے جزیروں سے 700 سے 200 میل مشرق کی جانب واقع ہیں۔ان جزیروں کی آب و ہوا کا سب سے اہم پہلو یہاں کی تیز رفتار ہوائیں ہیں جن کی وجہ سے کوئی درخت یہاں پر قدرتی طور پر نہیں اگ سکتا۔یہاں سارا سال بارش ہوتی ہے جو اوسط 25 انچ سالانہ ہے۔ہر مہینے تقریباً 16 سے 25 دن بارش ضرور ہوتی ہے۔گھاس جھاڑیاں عام ہیں یہاں بھیڑیں پالنے کا پیشہ سب سے اہم ہے۔جزائر فاک لینڈ کی کل آبادی 1970 کی مردم شماری کے مطابق صرف دو ہزار کے قریب ہے۔اس وقت دو تین جزائر ایسے تھے جہاں صرف دو دو یا تین تین افراد رہتے تھے۔

جزائر فاک لینڈ براعظم جنوبی امریکہ کی جنوبی نوک کے شمال مشرق میں واقع ہیں۔آبنائے مکیلن جو جنوبی بحر الاوقیانوس اور جنوبی بحر الکاہل کے درمیان اہم سمندری راستہ فراہم کرتی ہے جزائر فاک لینڈ سے صرف 300 میل کے فاصلے پر واقع ہے جن دنوں صرف بحری جہاز ہی دور دراز کے سفر اور آمد و رفت کا ذریعہ تھے فاک لینڈ کی سیاسی اہمیت بہت واضح تھی کیوں کہ جزائر فاک لینڈ پر قبضہ کر کے کوئی بھی طاقت با آسانی آبنائے مکیلن کی آمد و رفت پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔اگرچہ آج کل ہوائی جہاز

رسل و رسائل کا اہم ذریعہ ہیں تاہم تجارت کا زیادہ تر انحصار سمندری جہازوں اور ان کی آزادانہ نقل و حرکت پر ہی ہے اس لئے فاک لینڈ جزائر اس حوالے سے بھی اپنی اہمیت کے سبب قوموں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران دسمبر 1914ء میں آبنائے مکیلن پر قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں برطانوی اور جرمن جہازوں کی جنگ بھی ہوئی جو جنگ ''فاک لینڈ'' کہلاتی ہے اس جنگ میں برطانیہ فتح یاب رہا تھا۔ جزائر فاک لینڈ اور قرب و جوار کے دوسرے جزیروں کی قدر و قیمت ان کے براعظم قطب جنوبی کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے بھی بڑھ گئی۔ قطب جنوبی اگرچہ ساڑھے چھ ہزار فٹ موٹی برف کی تہوں کے نیچے دبا ہوا ایک یخ بستہ علاقہ ہے تاہم معدنیات کے ذخائر سے مالا مال ہے اور ایک اہم برفانی تفریح گاہ کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھر رہا تھا۔ قطب جنوبی کی یخ بستگی انسان کے سائنسی فکر و کاوش اور اس کے جذبہ تجسس کے لئے ایک اہم چیلنج ہے۔

یہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے مختلف حصوں پر ملکیت کا دعویٰ تو برطانیہ اور ارجنٹائن سمیت بہت سے ممالک نے کیا لیکن عملی طور پر کوئی بھی اسے سر نہ کر سکا اور نہ ہی لوگ اپنی آبادیاں بڑھا کر اس پر قابض ہو سکے۔ اس علاقے میں محض متعارف ہونے کی راہ میں بھی جو عظیم دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں ان کے پیش نظر بڑی طاقتوں اور دیگر کئی ممالک نے جس میں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جاپان، ناروے، چیکوسلواکیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ارجنٹائن اور چلی شامل ہیں ایک تیس سالہ معاہدے پر دستخط کئے۔ اس معاہدہ قطب جنوبی کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس براعظم پر فی الحال کسی قوم کا تسلط نہیں سمجھا جائے گا اور ملکیت کے دعویٰ کو معاہدے کی مدت کے اختتام تک منجمد سمجھا جائے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ نہ جنگ ہی یہاں ہوگی نہ ایٹمی غلاظت سے اسے آلودہ ہونے دیا جائے گا اور یہ کہ سب قوموں کو سائنسی تحقیق اور مطالعے کا حق حاصل ہوگا اور حصول علم کی خاطر باہمی تعاون کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ کئی قوموں نے سائنسی مطالعے کے مراکز یہاں کے

ساحلی علاقوں میں کھول رکھے تھے۔

برطانیہ کی تمام قطب جنوبی کے متعلق سائنسی کاوشوں کا اہم مرکز سٹینلے کی بندرگاہ میں واقع تھا جو جزائر فاک لینڈ کا دار الحکومت ہے۔اس مرکز سے آلات اور سامان خورد ونوش آسانی سے قطب جنوبی کے سائنسی مرکز تک پہنچایا جا سکتا ہے اور مطالعاتی ٹیمیں آسانی کے ساتھ اس مقابلتاً ترقی یافتہ علاقے سے کچھ عرصے کے لئے قطب جنوبی کے سرد علاقے میں تحقیق و مطالعہ کے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔

معاہدہ قطب جنوبی جو تیس سال کے لئے کیا گیا تھا طے شدہ مدت کے آخر تک جو **1991**ء میں ختم ہوئی بہت سے دوسرے تاریخی معاہدوں کی طرح کم حوصلگی اور ذاتی مفادات کی نذر گیا۔جو معدنیات یہاں پائی جاتی ہیں ان میں کوئلہ، تانبا، سونا ،ٹین زنک وغیرہ شامل ہیں اور یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ پٹرولیم کے ذخائر بھی یہاں موجود ہیں لیکن ان دھاتوں کو نکالنا فی الوقت انتہائی دقیق مسئلہ نظر آتا تھا۔قطب جنوبی کے سمندروں میں وہیل مچھلی کا شکار بھی پہلی سی اہمیت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ بہت زیادہ شکار کے بعد اب ان مچھلیوں کی تعداد سمندر میں بہت کم ہوگئی تھی۔

برف کے وسیع تودے جو قطب جنوبی کے برفانی ذخائر سے ٹوٹ کر سمندر میں گرتے رہتے تھے صحرائی علاقوں کے لئے پانی فراہم کرنے کا بیش بہا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔لیکن فی الحال سب سے زیادہ اہمیت ٹورسٹ انڈسٹری یعنی سیر و تفریح کے مواقع پیش کرنے میں نظر آتی تھی اور پچھلے برسوں میں ارجنٹائن نے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے ہفتے دس دن کے تفریحی سفروں کا انتظام بھی کئی مرتبہ کیا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے شائد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قومیں اگرچہ قطب جنوبی پر قابض تو نہیں ہوئیں تاہم منتظر ضرور تھیں۔اس بات کی خواہشمند تھیں کہ ایک دن اس علاقے کی دولت سے مالامال ہونے کے لئے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے نہ رہ جائیں ۔چنانچہ ہوشمند قومیں چوکس بھی تھیں، محنت بھی کر رہی تھیں اور اس علاقے کی سیاسی اہمیت سے بھی واقف تھیں۔انہیں اقوام میں برطانیہ بھی ایک سمجھدار، محنتی، خطر پسند اور مستقبل پر کڑی نگاہ رکھنے والی قوم تھی جس نے ایک عرصہ سے جزائر فاک لینڈ پر قبضہ

جما رکھا تھا۔ یہ جزیرے اسے سمندری راستوں کی حفاظت کرنے کے عمدہ مواقع فراہم کر سکتے تھے مگر صرف برطانیہ کو ہی یہ جزیرے اچھے نہیں لگتے بہت سی دوسری قومیں بھی میدان میں تھیں جن میں ارجنٹائن بھی سرفہرست تھا اور ماضی میں کئی برس تک ان جزیروں پر قابض بھی رہ چکا تھا۔ اس تنازعہ میں دونوں فریق اپنے آپ کو حق بجانب اور جزائر کو اپنی صحیح قانونی ملکیت سمجھتے تھے۔

برطانیہ کا دعویٰ تھا کہ یہ جزیرے سب سے پہلے جان ڈیوس نے 1593ء میں دریافت کئے، وہ ایک برطانوی سیاح تھا جو ڈیزائر نامی جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ برطانیہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ 1765ء میں انہوں نے مغربی فاک لینڈ جزیرے میں اپنی پہلی بستی قائم کی جبکہ مشرقی جزیرہ فاک لینڈ میں فرانس نے 1664 میں پہلی بستی قائم کی۔ برطانیہ کا یہ موقف تھا کہ ہسپانوی فوجوں نے 1770ء میں انہیں نکال باہر کیا اور فرانسیسیوں کو بھی کچھ دے دلا کر نکالنے کے بعد خود آباد ہو گئے۔ (یاد رہے کہ ہسپانوی باشندے جنوبی امریکہ میں ارجنٹائن اور بہت سے دوسرے علاقوں میں آباد ہیں اور اس وقت سپین براہ راست حکمران بھی تھا)

برطانیہ کا موقف تھا کہ انگریزوں اور ہسپانیوں کے درمیان جنگ ہوتے ہوتے اس طرح رہ گئی کہ ہسپانیوں نے ایگمنٹ کی بندرگاہ اور قلعہ انگریزوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد 1774ء میں زیادہ اخراجات کی وجہ سے برطانوی فوجی خود ہی جزائر فاک لینڈ سے چلے گئے اور جزیرے بھی چھوڑ دیئے، مگر جاتے جاتے ایک کتبہ نصب کر گئے جس پر لکھا تھا کہ تمام جزائر فاک لینڈ تحت طرطانیہ کی ملکیت اور ریاست ہیں۔

ارجنٹائن کے تاریخ دانوں کا کہنا تھا کہ جزائر فاک لینڈ جان ڈیوس نے دریافت نہیں کئے بلکہ اس سے بہت پہلے السٹین، گومزڈواڑے، باربوسا نے دریافت کئے جو میگیلن کی سفری مہم کے افراد تھے۔ یہ کہ 1494ء میں نئی دنیا کی تقسیم کا جو معاہدہ "ٹارڈی سلا" کے نام سے طے پایا، اس میں جزائر فاک لینڈ پر سپین کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ ارجنٹائن کا موقف یہ تھا کہ 1774ء میں ایک خفیہ زبانی معاہدہ برطانیہ

اور سپین کے درمیان طے پایا تھا جس کے تحت برطانیہ نے جزائر فاک لینڈ پر سپین کے حق کو تسلیم کیا اور جزیرے چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ 1774ء سے 1811ء تک سپین جزائر فاک لینڈ پر قابض رہا۔ 1774ء کے بعد ہی اہل سپین نے کئی بستیاں آباد کیں، مکان تعمیر کیے اور فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ 1806ء کے میں ارجنٹائن کا علاقہ بیونس آئرن سپین کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اس کے بعد سپین نے ان جزیروں کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا، البتہ ارجنٹائن کے مختلف صوبوں کی فیڈریشن نے 1920ء میں جزائر پر قبضہ جما لیا اور 1829ء میں آبادکاروں کے کئی گروپ لوئی ورڈنٹ کی سرکردگی میں جزائر بھیج دیئے کیوں کہ سپین سے آزاد ہونے کے بعد ارجنٹائن ان علاقوں کو اپنی ملکیت تصور کرتا تھا۔

1883ء کے اس جارحانہ تو آبادیاتی دور میں برطانوی فوجی پھر سے آن وراد ہوئے اور باقی ماندہ ارجنٹائی باشندوں کو نکال کر خود قابض ہو گئے، برطانوی آبادکار بھی اس جزیرے میں بسا دیئے گئے۔ اس وقت ارجنٹائن اپنی آزادی کی صرف سولہ سال ہی ہوئے تھے اور وہ اتنی فوجی قوت نہیں رکھتا تھا کہ اس صدی کی واحد عالمی سپر طاقت کو اپنے جزائر سے نکال سکے۔ لیکن اہل ارجنٹائن نے اپنے جغرافیائی نقشوں میں ہمیشہ اپنے ملک ہی کا حصہ دکھایا۔

برطانیہ کا موقف یہ تھا کہ ان جزیروں پر وہ سپین کا حق بھی تسلیم نہیں کرتے لیکن سپین کے چلے جانے کے بعد قائم مقام ارجنٹائن حکومت کا حق تسلیم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گو 1833 سے 1982ء تک دونوں فریقوں نے جنگ سے اجتناب کیا تاہم ارجنٹائن مسلسل اس مسئلے کے حل کے لئے کوشاں رہا۔ 1947ء میں اس تنازعہ کا فیصلہ کرنے سے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس نے اس لئے انکار کر دیا کہ ارجنٹائن نے اس بین الاقوامی عدالت کے فیصلہ کرنے کے حق پر ہی اعتراض کر دیا تھا۔ 1964ء میں ارجنٹائن نے اس معاملے کو اقوام متحدہ کی نوآبادیات کی سپیشل کمیٹی کے سامنے رکھا۔ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ دونوں ممالک آپس میں گفت وشنید سے کوئی حل تلاش کریں۔

1967ء میں جنوبی امریکہ میں آباد 21 لاطینی اقوام نے ان جزائر پر "ناجائز" قبضے کے خلاف ارجنٹائن کی پیش کردہ ایک قرارداد کو متفقہ طور پر پاس کر دیا۔

2 اپریل 1982ء کو ارجنٹائن کی فوجوں نے بحر اوقیانوس میں واقع برطانوی نو آبادی جزائر فاک لینڈ پر حملہ کر دیا اور اپنے فوجی اپریشن کو اپریشن روساریو کا نام دیا۔ حالانکہ اس علاقے میں بڑے جزیرے سٹینلے پورٹ پر برطانیہ کے 80 اور 120 مقامی فوجی تعینات تھے جنہوں نے مزاحمت نہیں کی۔

جزیرہ فاک لینڈ کے تنازع پر شروع ہونے والی برطانیہ اور ارجنٹائن کے مابین "جنگ اوقیانوس" کا اختتام بھی بالآخر جبر اور جانبدارانہ احکامات پر مبنی سمجھوتے پر ہوا۔ اس وقت ارجنٹائن پر جنرل لیوپولڈ گالتیر حکمرانی کر رہے تھے اور برطانیہ میں مسز مارگریٹ تھیچر وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھیں۔ برطانیہ کی کثیر اور مستعد فوجی طاقت کے سامنے ارجنٹائن کی عسکری قوت صرف دس ہفتوں میں ڈھیر ہوگئی۔

جنگ بندی کی ایک قرارداد پانامہ اور اسپین نے اقوام متحدہ میں پیش کی جس کے خلاف خود برطانیہ نے اپنا حق ویٹو استعمال کیا۔ (اس سے قبل اور بعد برطانیہ نے خالصتاً اپنے مفاد کے لئے ویٹو استعمال نہیں کیا تھا) امریکی صدر رونالڈ ریگن نے برطانیہ کی حمایت کرنے اور ارجنٹائن پر معاشی پابندیاں لگانے کا اعلان کیا۔ یورپی اقتصادی برادری نے بھی ارجنٹائن پر معاشی پابندیاں لگانے کا اعلان کیا۔ تاہم امریکی صدر کی شٹل ڈپلومیسی کے نتیجے میں 25 مئی 1982ء کو امن سمجھوتے کی شرائط تیار کی گئیں جس کے بعد ارجنٹائن کی فوج کے کمانڈر انچیف مسٹر الفریڈو آسٹز نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر غیر مشروط طور پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کے تحت پورٹ سان کالوس پر جو مشرقی فاک لینڈ کی جانب ہے برطانیہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا، ساؤتھ سینڈ وچ از لینڈ پر بھی برطانوی استحقاق کو تسلیم کیا گیا اور برطانیہ کی قید میں آئے ہوئے 12000 سے زائد جنگی قیدیوں کو تاوان کے عوض رہا کیا گیا۔ اس یکطرفہ سمجھوتے کی شرائط طے کرتے وقت ارجنٹائن کے حقوق کا قطعاً خیال نہیں رکھا گیا۔

جنیوا امن معاہدہ (افغانستان، روس اور پاکستان 1980ء)

کوریا ویت نام اور فاک لینڈ کی جنگوں کے بعد افغانستان میں روسی فوجوں کی دخل اندازی گذشتہ دس سال سے دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں جتنی بھی محاذ آرائی ہوئی ہے ان سب واقعات کا محرک ایک ہی امر تھا کہ سیاسی معاملات کو طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوشش کی گئی اور ہر مرتبہ ہزاروں جانوں کے نقصان کے بعد یہ وحشیانہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور بالآخر مسائل کا حل مذاکرات کی میز پر تلاش کیا گیا۔ معاہدہ جنیوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس معاہدہ نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ سیاسی مسائل کا حل میدان جنگ نہیں لیکن اس کے باوجود بھی مختلف اقوام عالم تاریخ کے اس سیدھے سادے سبق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

27 اپریل 1978ء کی صبح داؤد خان کی زیر صدارت ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں ملک کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ یہ 27 اپریل کا وہی دن تھا جب 1973ء میں سردار داؤد نے اپنے کزن اور برادر نسبتی ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد افغانستان میں بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کیا۔

سردار داؤد شروع ہی سے پاکستان اور ایران دشمنی کے لئے مشہور تھے، انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنی خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کر کے پاکستان کے پختون اور بلوچ علاقوں میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی لیکن سعودی عرب کی بر وقت مداخلت کر کے پاکستان اور ایران کے متعلق خارجہ پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور پاکستان کی علاقائی سالمیت کا احترام کرنے کا وعدہ بھی لیا۔ ایران اور پاکستان سے تعلقات میں بہتری بائیں بازو کی جماعتوں کے موافق نہ تھی، سردار داؤد نے بھی اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ

انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد جونئی کابینہ تشکیل دی تھی اس میں ایک بھی ترقی پسند نہ تھا۔ سردار داؤد نے شروع میں امریکہ سے اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن امریکہ نے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں وہ روس کے ساتھ مفاہمت کی راہ پر چل پڑے اور انہوں افغان افواج کے لئے اسلحہ حاصل کیا۔

ملک کے سیاسی حالات پر امن طور پر معمول کے مطابق جاری تھے کہ 17 اپریل 1978ء کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے آگے چل کر ملکی سیاست میں ہیجان برپا کر دیا۔ بائیں بازو کے ایک معروف اخبار ''پرچم'' کے مدیر میر اکبر خیبر کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔ میر اکبر کو عوام میں بڑا احترام حاصل تھا چنانچہ ان کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ ان کے جنازے میں شرکت کے لئے سڑکوں پر نکل آئے اور یہ جنازہ ایک بہت بڑے مظاہرے کی شکل اختیار کر گیا۔ مظاہرین نعرے لگاتے ہوئے امریکی سفارتخانے کے سامنے پہنچ گئے وہ امریکہ اور سردار داؤد کے خلاف نعرے لگا رہے تھے ان کا خیال تھا کہ میر اکبر کے قتل میں سردار داؤد اور امریکہ دونوں ملوث ہیں۔ ان دنوں سردار داؤد کی پالیسیوں میں بھی اچانک تبدیلی واقع ہو گئی تھی اور وہ امریکہ کے ساتھ بھی تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ سوویت یونین کے حامی حلقے ان کے یوٹرن لینے سے نالاں تھے اور میر اکبر کے قتل کو سیاسی ہوا دینے میں موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں داؤد حکومت نے بائیں بازو کے سرکردہ لیڈروں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ گرفتار ہونے والے لیڈروں میں نور محمد ترکئی اور ببرک کارمل بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ حفیظ اللہ امین بھی گرفتار ہوئے لیکن وہ اپنی گرفتاری سے پہلے افغان مسلح افواج میں اپنے حامیوں کو داؤد کے خلاف بغاوت پر اکسانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ سردار داؤد کو انٹیلی جنس ذرائع نے اس امر کی اطلاع کر دی تھی لیکن انہوں نے ان کی طرف سے چشم پوشی کا مظاہرہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 27 اپریل 1978ء کو دس بجے صبح کابینہ کی میٹنگ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے کابل کے مشرق سے چوتھی اور پندرھویں بکتر بند بریگیڈ کے ٹینک حرکت میں آئے

اور شہر میں داخل ہو گئے۔اسی طرح ملک میں دیگر اہم عمارتوں جن میں وزارت دفاع، کابل کا ہوائی اڈہ اور ایوان صدر بھی شامل تھے فوج نے قبضہ کر لیا۔ تقریباً 1800 سپاہی جو ایوان صدر کی حفاظت پر مامور تھے، نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔

افغانی عوام کی ایک بڑی تعداد کمیونسٹ روس کے ساتھ وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں سے الحاق پر نالاں تھی چنانچہ اگر نئی حکومت کے سربراہ کا جھکاؤ سوشلسٹ یا کیمونسٹ ممالک کی طرف ہوتا تو یہ قدامت پرست حلقہ اس ترکئی حکومت کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتا، چنانچہ نئی حکومت کے لئے اسلام پسندی کا پرچار کرنا مجبوری بن گیا۔داؤد خان کی برطرفی کے بعد جب ظاہر شاہ نے نیا آئین جاری کیا تو اس کے کوئی تین سال بعد نور محمد ترکئی نے کابل سے ایک اخبار بنام ''خلق'' جاری کیا۔1952ء میں جب وہ ابھی پینتیس سال کے تھے انہیں واشنگٹن کے سفارتخانے میں پریس اتاشی مقرر کیا گیا،لیکن موجودہ حکومت سے ساتھ غداری کے الزام میں انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔

واشنگٹن میں سبکدوشی کے بعد انہوں نے 1965ء کو اپنے تیس ساتھیوں کے تعاون سے عوامی جمہوری پارٹی کی بنیاد رکھی،انہیں اس پارٹی ''خلق'' کا سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔اس وقت ان کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف تھا۔1966ء میں خلق پارٹی دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔الگ ہو جانے والے گروپ نے ''پرچم'' کے نام سے اپنا اخبار جاری کر دیا۔خلقیوں کی زیادہ تر حمایت دیہی علاقوں کے علاوہ پختون علاقوں میں بھی تھی۔جبکہ پرچم والوں کو فارسی بولنے والوں کی حمایت حاصل تھی۔

دائیں بازو کی جماعتیں خاص طور پر اخوان المسلمین انقلاب سے پہلے سردار داؤد کے سوویت یونین سے گہرے روابط کی وجہ سے متنفر تھی۔داؤد کی اپنی جماعت ''قومی انقلابی جماعت'' بھی عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی،ملک کی اقتصادی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے ملک کی دس لاکھ کے قریب آبادی کو روزی کمانے کے لئے خلیجی ممالک میں جانا پڑا۔چنانچہ داؤد حکومت کی

غیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پرچم اور خلق دونوں نے مئی 1977ء میں اتحاد کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اختلافات سوویت یونین کے ایماء پر ختم کئے گئے تھے۔ جس میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ صورت حال تو انقلاب سے پہلے تھی لیکن انقلاب آنے کے بعد انقلاب لانے والے دونوں دھڑوں میں اتحاد قائم نہ رہ سکا اور ببرک کارمل کو کچھ عرصہ بعد ہی سفیر بنا کر ملک سے رخصت کر دیا گیا۔ ملک میں بھی گرفتاریاں ہوئیں پرچم پر الزام لگایا گیا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنا رہے تھے، جس کے نتیجے میں وزیر دفاع بریگیڈیئر عبدالقادر جس نے کرنل کی حیثیت سے فضائیہ کو داؤد کے خلاف استعمال کیا تھا اور بری فوج کے چیف آف سٹاف جنرل شاہ پور دونوں کو برطرف کر دیا گیا۔ اعلیٰ افسران، پروفیسر، بعض صوبوں کے گورنر مسلح افواج کے جوان اور ہزاروں سرکاری ملازمین بھی زیر عتاب آئے۔ سوویت فوجی افسروں کو جو فارسی بول سکتے تھے وزارتوں اور فوجی یونٹوں میں تعینات کر دیا گیا۔

ترکئی کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ انقلاب کے بعد اسلام سے ہمدردی محض زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہ تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کیمونزم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہی تھا اور افغانستان کے مذہبی عناصر جو کہ کثیر تعداد میں تھے افغانستان کی موجودہ حالت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ترکئی نے ایک مرتبہ مغربی جرمنی کے ایک صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جدید اور ترقی پسند اسلام کا حامی ہے، یہ محض ایک بیان تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ پارٹی کے نئے آئین کی خفیہ دستاویز کے آغاز میں ہی پارٹی کو اسلام کے بجائے لینن ازم اور مارکس ازم کا پابند کر چکے تھے۔ وہ افغانستان کو اسلامی ریاست قرار دے کر سوویت یونین کی دوستی کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔

1978ء کے انقلاب سے پہلے مختلف گروہ افغان حکومت کے خلاف گوریلا کاروائیوں میں مصروف تھے، پاکستان کی حکومت بھی وقتاً فوقتاً ان گروہوں کو داؤد حکومت کے خلاف استعمال کرتی رہتی تھی۔ نور محمد ترکئی کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد کئی نئے

گروہ پیدا ہو گئے جو ان کی حکومت کے لئے روز بروز مشکلات پیدا کر رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکئی کے لئے بھی منافقت ترک کر کے سوویت یونین کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اور انہوں نے اپنے انقلاب ثور کو اکتوبر کے روسی انقلاب کی توسیع قرار دینا شروع کر دیا۔

حکومت نے کابل میں ایک مذہبی کونسل ترتیب دی اور اس کونسل کے ذریعہ باغیوں کے خلاف جنگ کو جہاد قرار دیا گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ باغیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے والا مر جائے تو شہید اور بچ جائے تو غازی۔ مخالفین نے بھی ترکئی کے حکومت کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ کنڑ اور پکتیا میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ لوگ گھر بار چھوڑ کر پناہ کے لئے پاکستان کی طرف آنے لگے۔ سال کے آخر تک تیس ہزار کے قریب مہاجرین پاکستان پہنچے۔ ایک لاکھ ستر ہزار مہاجرین پہلے سے موجود تھے۔ ترکئی حکومت نے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے بہت سی اصلاحات جاری کیں لیکن وہ بھی کارگر ثابت نہ ہو سکیں، عوام کی طرف سے بہت شدید رد عمل ہوا۔

ترکئی مسلح افواج سے بھی مطمئن نہیں تھے انہیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پرچم سے تعلق رکھنے والے افسران انہیں کسی وقت بھی فارغ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک خفیہ پولیس تشکیل دی جو فوجی افسران کے رجحانات اور نظریات کی چھان بین کرتی۔ لاتعداد تجربہ کار فوجی افسران برطرف کر دیئے گئے اور ان کی جگہ پر جونیئر افسران کو ترقیاں دی گئیں، چنانچہ فوج میں بھی انتشار پیدا ہو گیا۔ اب حکومت نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سوویت بلاک میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ 5 دسمبر 1978ء کو کابل میں افغان سوویت معاہدے کا اعلان کیا گیا جو بیس سال کے طویل عرصہ کے لئے تھا۔ اس معاہدے میں عسکری امور میں تعاون کے ساتھ ساتھ ایشیا میں ایک نئے حفاظتی نظام کی تشکیل کا بھی تذکرہ تھا جسے براعظم کے تمام ممالک کی کوششوں سے قائم کیا جانا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت سوویت یونین افغان حکومت کی مدد کے لئے افغانستان میں فوج بھیج سکتا تھا۔ اس معاہدے کے بعد افغانستان نے سوویت یونین کی کھلے بندوں حمایت کا اعلان کر دیا اس نے کیوبا،

ایتھوپیا، انگولا، ویتنام اور شمالی کوریا کے حق میں آواز بلند کی اور شمالی کوریا کی حکومت کو کوریا کے عوام کی جائز نمائندہ قرار دیا۔

زرعی اصلاحات کے اعلان سے زمیندار اور کاشتکار دونوں انقلابی حکومت کے خلاف ہو گئے۔ بے زمین کسانوں میں زمین کی تقسیم کا اعلان ان کے لئے خوشی کا باعث تھا لیکن حکومت نے نہ تو ان کے لئے پانی کی فراہمی کا کوئی انتظام کیا اور نہ ہی بیج اور مویشی مہیا کئے۔ کسانوں نے محسوس کیا کہ حکومت انہیں زمیندار سے ملنے والی مراعات سے بھی محروم کرنا چاہتی ہے۔ قیمتوں پر کنٹرول حاصل کرنے سے تاجر طبقہ بھی حکومت سے ناراض ہو گیا۔ خواتین کے متعلق اعلان کو مذہب کے معاملات میں براہ راست دخل اندازی قرار دیا گیا۔ جنوری میں کابل حکومت کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان حالات میں حکومت پر ایک نئی مصیبت آن پڑی۔ کابل میں امریکہ کے سفیر ایڈلف ڈبس کو اغوا کر کے کابل کے ایک ہوٹل میں یرغمال بنا لیا گیا۔ اغوا کرنے والے جیل سے اپنے تین ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے، حکومت نے اپنے حفاظتی دستوں کو ہوٹل پر حملہ کر کے امریکی سفیر کو رہا کرانے کا حکم دیا۔ فریقین میں گولیوں کا تبادلہ ہوا، ایک گولی امریکی سفیر کو بھی لگی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ یہ گولی کس کی تھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ امریکہ نے اس پر شدید احتجاج کیا اور اس کا الزام سوویت روس پر لگایا۔

حفیظ اللہ امین اور نور محمد ترکئی کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے، افغان کابینہ میں اقتدار کی جنگ ہو رہی تھی۔ امین کو وزیر خارجہ شاہ ولی اور وزیر اطلاعات شافی کی حمایت حاصل تھی جبکہ وزیر داخلہ شیر جان مزدور یار اور چیف آف سٹاف اسلم وطن یار ترکئی کے حامی تھے۔ انقلاب ثور کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ملک میں خواندگی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عورتوں کو تعلیم دینے کے خلاف ہرات میں ایک زبردست مظاہرہ ہوا۔ ہرات میں متعین سترھویں ڈویژن کے سپاہیوں کو مظاہرین کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس ڈویژن میں بعض افسر خلق نواز تھے جب انہیں مظاہرین کو بذریعہ قوت منتشر کرنے کا حکم ملا تو انہوں نے انحراف

کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پوری ڈویژن جو دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی مظاہرین کے ساتھ مل گئی۔ سپاہیوں نے حکومت کے اسلحہ خانے لوٹ کر ہتھیار مظاہرین کے حوالے کر دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرات میں مقیم چھ سو کے قریب سوویت شہری ہلاک کر دیئے گئے۔ جس کے بعد شہر پر فضائی حملوں کا دور شروع ہو گیا اور شہر پر اندھا دھند بمباری کر کے ہزاروں افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں یہاں بھی گوریلا جنگ شروع ہو گئی۔

اب حفیظ اللہ امین کو وزیر اعظم بنا دیا گیا حکومت نے دفاع کے لئے ایک کونسل قائم کر دی، جس کے ممبران میں ترکئی، اسلم وطن یار، شیر جان مزدور یار اور اسد اللہ سہروردی کے علاوہ فضائیہ اور بری افواج کے افسران بھی اس میں شامل تھے۔ اس کونسل کی خاص ذمہ داری تھی کہ وہ اعلیٰ فوجی افسران کی وفاداریوں کی چھان بین کرے۔ ہرات کے واقعہ کے بعد بعض جگہوں پر فوجی دستے متعین کرنے کے متعلق حالات کا جائزہ لینے کے لئے ماسکو نے ساٹھ کے قریب فوجی افسران بھیجے۔ دفاعی کونسل کو یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ پھر سے فوجی منحرف ہو کر مجاہدین سے جا ملیں گے، چنانچہ اس نے باغی دیہات میں فوج بھیجنے کے بجائے ہیلی کاپٹروں اور بمبار طیاروں سے حملے کرائے جس سے بھاری اموات ہوئیں اور لوگوں کے گھر تباہ ہوئے۔

27 جولائی **1979**ء کو حفیظ اللہ امین کو پارٹی کا سیکرٹری بنا دیا گیا اور وزیر دفاع کا عہدہ بھی اس نے سنبھال لیا۔ فوج کے سپاہی زیادہ مزاحمت کے قائل نہیں تھے لیکن بعض جگہوں پر انہوں نے تشدد کی مثالیں قائم کیں، مثلاً کنڑ کے ایک گاؤں کیرالہ میں فوج نے سارے گاؤں کو نیست نابود کر دیا اور ہزار سے زیادہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسے واقعات نے عوام اور فوج کے درمیان خلیج مزید وسیع کر دی۔

نور محمد ترکئی کو سوویت یونین کی پشت پناہی حاصل تھی ترکئی کے حامی اعلانیہ تو کچھ نہ کر سکے لیکن وہ حکومت کے خلاف اشتہار، پوسٹر اور پمفلٹ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ پنج شیر میں بھی مجاہدین کے حملے جاری تھے، درہ سالانگ کے راستے سے سوویت یونین سے جو عسکری اور امدادی سامان

افغانستان پہنچتا تھا وہ مجاہدین پنج شیر میں ہی لوٹ لیتے تھے۔ترکئی نے پاکستان کے ساتھ مفاہمت کر کے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہو سکی کیوں کہ سوویت ان کوششوں کے خلاف تھا جس میں پاکستان کو اہم کردار دیا جائے۔

اکتوبر کے شروع میں نور محمد ترکئی نے ماسکو کا دورہ کیا وہاں ان کی ملاقات ببرک کارمل سے ہوئی۔دونوں شخصیات نے حفیظ اللہ امین کو ٹھکانے لگانے اور پرچم اور خلق کی مخلوط حکومت بنانے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔کہا جاتا ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کا سفیر بھی اس سازش میں شریک تھا۔قبل اس کے کہ اس منصوبے پر عمل ہو تا ایک افغان میجر نے حفیظ اللہ امین کو منصوبے سے آگاہ کر دیا اور مجوزہ میٹنگ میں شرکت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔امین نے میٹنگ میں جانے کا مشورہ تو قبول نہ کیا البتہ میٹنگ کے آغاز پر ہی ایک گولی چلی اور نور محمد ترکئی کا کام تمام ہو گیا۔اس واقعہ کے اگلے روز ترکئی کی خرابی صحت کی بنا پر حکومت سے دستبرداری کا اعلان کیا گیا۔9 اکتوبر کو دنیا کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ پارٹی کا رہنما قتل کر دیا گیا ہے۔

ترکئی کے قتل کے بعد امین اور سوویت سفیر پوزانف کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے کیوں کہ امین کو یقین تھا کہ سوویت سفیر ان کے خلاف سازشوں میں شریک تھا۔اس نے ماسکو سے اس سفیر کو واپس بلانے کا مطالبہ کر دیا۔ماسکو نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد پوزانف کو واپس بلا کر اس کی جگہ ایک تاتاری مسلمان کو کابل میں سفیر مقرر کر دیا۔پہلے تو سوویت یونین نے حفیظ اللہ امین کو چارو ناچار قبول کر لیا لیکن جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ امین اب حالات کو سنبھالنے کے قابل نہیں تو اپنے نائب وزیر داخلہ لیفٹننٹ جنرل وکٹر پاپوٹن کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے کابل بھیجا اس کا بظاہر مقصد تو حفیظ اللہ امین کی مشاورت کرنا تھا لیکن اندرون خانہ سوویت روس کی کوشش تھی کہ کسی طرح افغانستان میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو سوویت یونین سے باقاعدہ مداخلت کی درخواست کرے۔سوویت روس افغانستان میں مداخلت کے لئے صرف موقع کی طاق میں تھا۔

سوویت یونین نے نومبر 1979ء کے آخر میں افغانستان میں فوجی مداخلت

کا فیصلہ کر لیا تھا اس کے لئے اس وقت کا انتخاب کیا گیا کہ جب مغربی ممالک کرسمس منانے میں مصروف ہوں، حفیظ اللہ امین کے حامی افسران فوجی نقل و حرکت کے خلاف کچھ نہ کر سکے اور حقائق جاننے کی کوشش میں لگے رہے۔ سوویت مشیر جو پہلے سے ہی وہاں موجود تھے انہوں نے رشکور میں ساتویں اور آٹھویں ڈویژن کے افسروں کو جو امین کے حامی تھے کمروں میں بند کر کے تالے لگا دیئے۔ حفیظ اللہ امین سوویت مشیروں کے مشورے پر ایوان دارالامان میں منتقل ہو گئے۔ کمانڈوز دستوں نے دارالامان پر ایک زبردست حملہ کیا جس میں حفیظ اللہ امین بھی جان سے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امین کو گرفتار کر کے پھانسی دی گئی تھی۔

حفیظ اللہ امین کے بعد ببرک کارمل کو افغانستان کا نیا صدر بنا دیا گیا۔ جس وقت دارالامان میں معرکہ ہوا ببرک کارمل چیکوسلواکیہ میں بطور سفیر متعین تھے۔ سوویت روس کا کہنا تھا کہ ببرک کارمل کچھ عرصہ قبل واپس افغانستان آ چکے تھے جبکہ مغربی ذرائع کا کہنا تھا کہ ببرک کارمل سوویت ٹینکوں پر بیٹھ کر افغانستان پہنچے تھے۔ بہر حال یہ حقیقت تھی کہ کارمل افغانستان میں سوویت یونین کی تین سو ساٹھویں موٹر رائفل ڈویژن کے ساتھ نمودار ہوئے اور ایوان صدر جا بیٹھے۔

یہ وہ وقت تھا جب امریکہ چپ سادھے سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا اور اس نے کسی سطح پر بھی مداخلت کرنے سے گریز کیا کہ مبادا روس اپنے ارادوں سے باز نہ آجائے مگر جب افغانستان میں جنگ شروع ہوئی تو امریکہ افغانیوں کی ہر طرح سے مدد کی، ان کو اسلحہ فراہم کیا اور ٹریننگ کیمپ قائم کئے۔ سوویت یونین نے میڈیا کا محاذ سنبھال لیا اور حفیظ اللہ امین کے خلاف پراپیگنڈا مہم تیز کر دی۔ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ امین امریکی سی آئی اے کی وساطت سے افغانستان کے پختون علاقے پاکستان کے حوالے کرنا چاہتا تھا، وہ وطن فروش تھا۔

خلقیوں نے معاشرے میں تبدیلی لانے کے لئے بڑی تیزی دکھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے عوام کو سیاسی جماعتیں بنانے اور عوامی تنظیمیں قائم کرنے کی آزادی دے دی۔ ببرک کارمل نے ایک پریس کانفرنس میں اس بات کا بھی اظہار کیا

کہ نیا آئین اسلام کے اصولوں کے مطابق ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نجی ملکیت کا احترام کیا جائے گا اور اس نئے آئین کے ذریعے افغان عوام کو تمام سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق دیئے جائیں گے۔ کارمل نے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ بھی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ کانفرنس کے اگلے روز مذہبی زعماء کی کونسل کے چیئر مین عبدالعزیز نے حکومت کی حمایت میں تقریر کی۔

15 جنوری 1980ء کو مزار شریف کے ایک رہنما عبدالغفار نے کارمل حکومت کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اور کہا ہمارے ہاں مذہب کی مکمل آزادی اور اعتقادات پر کوئی پابندی نہیں۔ بعض علماء نے حکومت کی توصیف و تعریف میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن عوام پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک کیمونسٹ حکومت کی جگہ دوسری کیمونسٹ حکومت آ گئی ہے۔

ببرک کارمل نے حکومت سنبھالتے ہی سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم جاری کرنے کے ساتھ ساتھ انقلاب دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس کا عوام پر کوئی اثر نہ ہوا، اس نئے انقلاب کو بیرون ملک سے درآمد کیا ہوا انقلاب قرار دیا گیا۔ ہاں اگر روس مداخلت نہ کرتا تو زیادہ امکان تھا کہ صورت حال کچھ اور ہوتی۔ کارمل نے نئی کابینہ میں خلق پارٹی کے رہنماؤں کو تو شامل کیا ہی، ساتھ پرچم پارٹی کے افراد کو بھی وزارتیں سونپ دیں لیکن حکومت کے اہم محکمے خلق رہنماؤں کے سپرد ہی کئے گئے۔

کارمل حکومت نے نئی اصلاحات متعارف کرائیں سیاسی قیدیوں کی رہائی، نئی ٹریڈ یونینوں کی تشکیل اور اسی قسم کے دوسرے اعلانات عوام پر اثر انداز نہ ہو سکے، کیوں کہ لوگ یہ جانتے تھے کہ کارمل غیر ملکی فوج کے بل پر حکمران بنا تھا، یہ غیر ملکی طاقت بھی وہ تھی جو خدا اور اسلام کی دشمن تھی۔ بہت سے کارمل کے اپنے ساتھی بھی سوویت مداخلت سے ناخوش تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کارمل حکومت کی انتظامیہ پر گرفت جو پہلے ہی ڈھیلی تھی مزید کمزور پڑ گئی۔

افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت کے بعد جب میدان کارزار گرم ہو گیا

تو امریکہ نے اپنی حکمت عملی تبدیلی کرتے ہوئے اس مداخلت کو عالمی امن کے لئے شدید خطرہ قرار دیا۔14 جنوری 1980ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں سوویت یونین کو ایک بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔سوویت یونین کی حمایت میں صرف اٹھارہ ووٹ ڈالے گئے اور مخالف ووٹوں کی تعداد 104 تھی۔مختلف معرکوں میں ہلاک ہونے والے سوویت سپاہیوں کے ذاتی سامان میں سے گیس ماسک دستیاب ہوئے۔علاوہ ازیں سوویت یونین نے کیمیائی جنگ کے لئے بھی کچھ یونٹیں اپنے لشکر کے ساتھ بھجوائی تھیں۔

ان واقعات سے مخالفین نے اس بات کی خوب تشہیر کی کہ سوویت یونین کیمیائی جنگ میں ملوث ہے۔جب عالمی رائے عامہ کی طرف سے دباؤ بڑھا تو اسے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے مقابلے پر آنا پڑا۔اس کا کہنا تھا کہ اسے مداخلت کی دعوت دی گئی تھی اور وہ دونوں ممالک کے درمیان ہونے والی معاہدے کی شق 4 کے تحت افغان حکومت کی مدد کے لئے افغانستان میں داخل ہوا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ بیرونی مداخلت کے خلاف بہت سے گروہ برسرپیکار تھے لیکن وہ سب نے سب غیر منظم اور منتشر الخیال تھے۔ایک گروہ دوسرے سے بالکل لاتعلق تھا اور اپنے اپنے انداز سے جنگ میں مصروف تھا۔ایک گروہ کو بھیجے جانے والے ہتھیار دوسرا گروہ یا تو لوٹ لیتا تھا یا پھر ٹول ٹیکس وصول کئے بغیر جانے نہ دیتا تھا۔بعض اوقات تو آپس میں بھی لڑنا شروع کر دیتے تھے۔1980ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب مزاحمتی گروہوں نے اتحاد اور مشترکہ حکمت عملی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پشاور میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔اس متحدہ محاذ کو سعودی حکومت کی طرف سے چوبیس ملین ڈالر کی امداد دی گئی۔

سوویت یونین نے محسوس کیا کہ مزید اعانت کے بغیر کارمل حکومت قائم نہیں رکھی جا سکتی۔چنانچہ سوویت یونین کے مارشل سوکولوف نے مزید فوج بھیجنے کا فیصلہ کر لیا اور نئے فوجی دستوں میں پانچویں موٹر رائفل ڈویژن فرح اور ایک ڈویژن کو ہرات بھیجا گیا۔ان کا مقصد افغانستان ایران سرحد کو بند کرنا تھا،ایک اور ڈویژن ترمذ سے نکل کر شمالی افغانستان چلی آئی اور اس کے ساتھ چالیسویں لشکر کا ہیڈ کوارٹر بھی سوویت یونین

میں ترمذ سے بگرام منتقل کر دیا گیا۔

کابل یونیورسٹی بند کر دی گئی، کابل کے تاجروں نے ہڑتال کر دی، بازار بند ہوئے، مظاہرے کئے گئے، نعرے لگائے گئے لیکن سوویت یونین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس زمانے میں سوویت یونین میں کوئی رائے عامہ نہ تھی اور اگر تھی بھی تو اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہ تھی اور نہ ہی حکومت پر کسی طرح اثر انداز ہو سکتی تھی۔ مجاہدین نے کنٹر کے دارالحکومت چغہ سرائے کا محاصرہ کر رکھا تھا جس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مجاہدین اس شہر پر قبضہ نہ کر لیں سوویت یونین کی ایک موٹر رائفل ڈویژن جس کے پاس 250 ٹینک تھے اور بھاری توپ خانہ بھی تھا حرکت میں آئی اور انہوں نے چغہ سرائے میں محصورین کو ان کی ضرورت کی اشیاء پہنچائیں اور اسمار پر پھر سے کنٹرول قائم کیا اور بری کوٹ تک چلے گئے۔ اس اپریشن سے مجاہدین کو کافی نقصان اٹھانے کے علاوہ انہیں کچھ عرصہ کے لئے زیر زمین جانا پڑا۔

ببرل کارمل نے جمہوری عوامی پارٹی کی ایک میٹنگ طلب کی جس میں ایک نئے عبوری آئین کی منظوری دی گئی۔ ملک میں نیا جھنڈا بنا کر خلقیوں کے بنائے ہوئے جھنڈے کو متروک قرار دے دیا گیا۔ نہ تو نیا آئین عوام میں پزیرائی حاصل کر سکا اور نہ ہی عوام نے نئے جھنڈے کا خیر مقدم کیا۔ مئی 1980ء کے پہلے ہفتے میں طلباء نے پھر مظاہرے کئے اور اس بار ان کے ساتھ سکولوں کے بچے بھی شامل تھے۔ مغربی سفارتکاروں کو یہ اطلاع ملی کہ انتظامیہ نے مظاہرین پر گولی چلا دی ہے جس سے پچاس بچے ہلاک ہو گئے۔ البتہ افغان وزارت داخلہ نے اس اطلاع کی توثیق نہیں کی صرف اتنا بتایا کہ مظاہرہ کرنے والے لاتعداد طلباء کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

اس بگڑتی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے بعض مجاہد تنظیموں نے جرگہ طلب کیا۔ بجائے اس کے کہ یہ جرگہ کوئی لائحہ عمل اختیار کرتا مجاہدین کے گروہوں کے درمیان مخاصمت اور کھل کر سامنے آئی جس کا سوویت یونین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ افغان حکومت کو جہاں اور بہت سے دوسرے مسائل کا سامنا تھا وہاں فوجی انتشار نے بھی بہت سے مسائل پیدا کئے۔ چوتھی اور پندرھویں بکتر بند بریگیڈوں کے خلقی

افسران ببرک اور سوویت دونوں کے خلاف تھے۔ببرک کارمل نے جب غزنی کے کمانڈر کی جگہ پرچمی کو تعینات کیا تو افسران نے بغاوت کر دی۔فریقین کے درمیان کئی دن تک خونریز جنگ ہوتی رہی اور کارمل انتظامیہ کی مدد کے لئے سوویت یونین کی فوج اور فضائیہ کو بھی اس جنگ میں حصہ لینا پڑا۔

اس وقت افغان فوج کا سب سے بڑا مسئلہ منحرف ہونے والوں کا فرار تھا۔ایک اندازے کے مطابق ان ایام میں افغان فوج کی نفری کم ہو کر صرف تیس ہزار رہ گئی تھی۔نئے بھرتی ہونے والوں کو ٹھیک سے تربیت بھی نہیں دی جا رہی تھی اور ان کے مورال کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کے ساتھ پہلے ہی مقابلے میں وہ ان کے ساتھ آ ملتے تھے۔ہر فرار ہونے والا اپنی اے کے 47 رائفل ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔بعض اوقات وہ ٹینک اور بڑی توپیں بھی لے اڑتے تھے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغان حکومت نے نئے عسکری قوانین نافذ کر دیئے،معمولی جرائم پر بھی سخت سزاؤں کا اعلان کر دیا گیا یہاں تک کہ فوج میں بھرتی کے لئے بلائے جانے کے حکم کو نظر انداز کرنے پر چار سال کی سزا رکھی گئی۔بغیر اجازت غیر حاضری پر دو سے چھ سال قید،بیماری سے متعلق مکر کرنے پر چھ سال قید اور فرار،حکم عدولی،سرکاری رازوں کی چوری،اپنے ہتھیار دشمن کے حوالے کرنے،انقلاب کے خلاف سازشیں کرنے اور فوج میں بھرتی کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے جرائم کے لئے پندرہ سال قید یا موت کی سزا کا تعین کیا گیا۔ان سخت سزاؤں کی وجہ سے افغان فوج میں قدرے استحکام پیدا ہوا۔

سوویت یونین کو افغانستان میں فوج بھیجتے وقت یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اس ملک میں طویل مدت تک قیام کرنا پڑے گا۔سوویت یونین کی قیادت کی توقعات کے باوجود ببرک کارمل اپنے ارادوں میں ناکام رہا وہ نہ تو حالات پر قابو پا سکا اور نہ ہی ملک کو متحد رکھ سکا۔بلکہ غیر ملکی فوج کی مداخلت کا الٹا اثر ہوا کہ جو لوگ اس سے پہلے خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے وہ بھی مزاحمت میں شریک ہو گئے۔نئے احکامات کے باوجود جن سے افغان فوج میں قدرے استحکام پیدا ہوا تھا فوج کو مجاہدین کے خلاف لڑنے والوں کی

شدت سے کمی محسوس ہوتی رہی۔ جبری بھرتی کی عمر جو پہلے اکیس سال تھی اب بیس سال کر دی گئی۔ مختلف جگہوں پر جبری بھرتی کے ادارے قائم کر دیئے گئے اور یہ حکم بھی دیا گیا کہ نئے بھرتی ہونے والوں کی مدت ملازمت میں چھ مہینوں کی توسیع کر دی گئی ہے۔ جمہوریت پسند نوجوانوں کی ایک تنظیم بھی قائم کی گئی اور اس تنظیم میں جبراً یا خود بھرتی ہونے والوں کو بھی فوجی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر کو دور دراز علاقوں میں مجاہدین سے لڑنے کے لئے بھیج دیا گیا۔

پاکستان میں مہاجرین کی تعداد سترہ لاکھ تک پہنچ چکی تھی اور مزید دو تین لاکھ افراد نے ایران میں پناہ لی تھی۔ پاکستان چونکہ تنہا مہاجرین کی کفالت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے امریکہ، سعودی عرب، چین اور دوسرے بہت سے ممالک نے ان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی پیش کش کی جو بخوشی قبول کر لی گئی۔

اس زمانے میں سوویت یونین اور افغانستان کے درمیان تجارت میں بے حد اضافہ ہوا، سوویت یونین نے کابل کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کے لئے ہزاروں مشیر بھی روانہ کئے اور تعمیراتی کام بھی سنبھال لئے۔ کابل کے ہوائی اڈے کی توسیع کی گئی، ہسپتال اور بجلی گھر قائم کئے گئے اور ٹرکوں اور دوسری گاڑیوں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لئے لاتعداد ورکشاپس بھی بنا دیئے گئے۔

امریکہ نے ویت نام کی جنگ کے لئے پانچ لاکھ سپاہی استعمال کئے اور اس جنگ میں امریکہ کے روزانہ چالیس ملین ڈالر خرچ ہوتے تھے۔ اس کے برعکس سوویت یونین نے افغانستان میں پہلے پہل ایک لاکھ فوج سے مداخلت کی اور یوں اپنے اخراجات کو بھی محدود کر لیا اسے صرف پندرہ ملین ڈالر روزانہ خرچ کرنے پڑ رہے تھے۔ گو اس کی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی اور وہ اس سلسلے میں امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

سوویت سپاہی شہریوں کو جب بھی گلی کوچوں میں نظر آئے ان پر حملے کئے گئے، اپنی یونٹوں سے الگ ہونے والے سپاہی یا سیر و تفریح کی غرض سے رخصت پر آئے ہوئے سپاہی کم ہی یونٹوں میں واپس پہنچتے تھے۔ سوویت یونین نے کنڑ اور پکتیا کے

علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی کئی ناکام کوششیں کیں، یہ علاقے چونکہ پاکستان کی سرحد پر واقع تھے، یہاں کابل انتظامیہ کے خلاف مزاحمت مضبوط تھی اور مجاہدین سوویت اور افغان فوجوں کے حملوں کا جواب انہیں کے انداز میں دیتے تھے۔گوریلا جنگوں میں عام طور پر پناہ اور کھانا ان کے ہمدرد دیہاتیوں اور شہریوں سے ملتا ہے۔ وہ حملوں کے بعد انہیں کے گھروں میں چھپ کر بیٹھتے ہیں اور موقع ملتے ہی انہیں پناہ گاہوں سے نکل کر حملے کرتے ہیں۔

امریکہ نے جس طرح ویت نامی گوریلوں کی پناہ گاہیں ختم کرنے کے لئے شہروں قصبوں اور دیہات کو غیر آباد کرنے کا طرزعمل اپنایا تھا۔سوویت یونین نے بھی افغانستان میں وہی کچھ کیا۔گاؤں کے گاؤں بمباری سے ویران کر دیئے گئے اور اس کا مقصد یہی تھا کہ ان پانیوں ہی کو خشک کر دیا جائے جہاں یہ مچھلیاں پلتی ہیں۔ سوویت فوجوں نے مشرقی پہاڑوں میں آباد بعض پختون قبائل کو جو کسی نہ کسی وجہ سے مجاہدین کے ساتھ نہ تھے اپنی حمایت پر راضی کر لیا تھا۔جن قبائل کا تعاون حاصل نہیں ہوا انہیں مسلسل بمباری کر کے خوفزدہ کیا گیا۔

دراصل یہ جنگ ماضی کی دوسپر پاورز کے درمیان دنیا کی چودھراہٹ حاصل کرنے کے لئے تھی ۔جنگ تو امریکہ اور روس کے درمیان تھی لیکن میدان جنگ افغانستان کو بنایا گیا تھا ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ مطلب اور مقصد کے بغیر امریکیوں نے کبھی کسی قوم کی مدد نہیں کی اور ہوا بھی یہی کہ جب روس وہاں سے رسوا ہو کر بھاگ نکلا تو امریکہ نے اپنے مفادات کے تحت انہیں مجاہدین کو (مجاہدین کا خطاب بھی امریکہ ہی نے دیا تھا) ''دہشت گرد'' قرار دے کر ان کی جان کے درپے ہو گیا۔

چنانچہ سوویت یونین یہ اعلان کر رہا تھا کہ پاکستان میں مجاہدین کی ٹریننگ کے لئے تین سو سے زائد کیمپ موجود ہیں جہاں امریکی انسٹرکٹر مجاہدین کو ٹریننگ دے رہے ہیں۔سوویت ذرائع ابلاغ ان جہازوں کے ناموں کی تفصیل بھی بتا رہے تھے جن کے ذریعہ امریکی اسلحہ کراچی کی بندرگاہ پر پہنچ رہا تھا۔وقت گزرتا گیا حالات بگڑتے گئے۔ افغانستان کے شہروں اور دیہات میں لڑی جانے والی جنگ میں شدت پیدا ہوتی

گئی۔سوویت فوجیوں نے فصلیں اجاڑیں ،لوگوں کے گھر برباد کیئے،لوگوں کو ہجرت کر نے پر مجبور کیا گیا،اس قتل عام سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

سوویت یونین کو یہ یقین تھا کہ پاکستان اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے،اس نے پاکستان کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی،سوویت طیارے پاکستان کی فضاؤں پر نمودار ہوئے بے گناہ لوگوں کا خون بہایا مگر پاکستان کے ارادوں میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی اس کا یہی اعلان تھا کہ وہ افغان مہاجرین کو انسانی ہمدردی اور اسلامی رواداری کی بناء پر اپنے ہاں پناہ دے گا۔یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ نے پہلی مرتبہ پاکستان کی سٹرٹیجک اہمیت کو تسلیم کیا اور ضیاء الحق کو محدود امداد کی پیش کش کی ، جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ پہلے پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان افغانستان حائل تھا اب افغانستان میں سوویت یونین کے داخل ہو جانے کے بعد پاکستان فرنٹ لائن ریاست بن گیا۔

افغانستان میں جنگ میں بعض ایسے انسانی مسائل پیدا کئے جن کا کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ان میں سے ایک مسئلہ تو سوویت اور مجاہدین قیدیوں کا تھا۔ پہلے پہل تو طرفین قیدیوں کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کرنے پر تیار نہیں تھے۔جو بھی دونوں میں سے کسی کے ہاتھ لگتا بلا تامل قتل کر دیا جاتا۔مجاہدین کے پاس تو افغانستان میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ قیدیوں کے لئے کیمپ قائم کرتے،وہ تو چھاپہ مار جنگ لڑ رہے تھے۔ان کے لئے قیدیوں کو کھلانا پلانا اور ان کی حفاظت کرنا ایک مشکل امر تھا،کابل انتظامیہ کے پاس تو اس قسم کی تمام سہولتیں موجود تھیں ،لیکن پھر بھی وہ قیدیوں کو گرفتار کرتے ہی قتل کر دیتے۔جب یہ بات دنیا میں پھیلی اور دنیا کے ہر مہذب شخص نے اس کی مذمت کی تو وہ جنگ میں پکڑے جانے والے مجاہدین کو پل چرخی،شش درک اور دارالامان کے جیل خانوں میں بھیجنے لگے۔

ببرک کارمل نے اپنی تقاریر میں اپنی کامیابیوں کو بڑے فخر یہ انداز میں بیان کیا مگر یہ کامیابیاں اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوئی تھیں ۔ان کے لئے کارمل کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ ببرک کارمل نے افغان عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے

1985ء میں لوئے جرگہ طلب کر لیا۔ یہ لوئے جرگہ بے اختیار نمائندوں پر مشتمل تھا، مجاہدین نے جرگہ میں شریک ہونے والوں کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ لیکن ان دھمکیوں کے باوجود حکومت نے ایک اور جرگہ بلانے کا اعلان کر دیا۔ قبائلی سرداروں اور کابل انتظامیہ کے درمیان مفاہمت کرانے کی ذمہ داری ڈاکٹر نجیب اللہ کو سونپی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ نجیب اللہ کا تعلق ایک اونچے پختون گھرانے سے تھا اور خاد کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے سرحد کے اس پار لوگوں سے روابط پیدا کر لئے تھے۔ مجاہدین کو ملنے والی امداد انہیں راستوں سے گزر کر مجاہدین تک پہنچتی تھی جو تمام کے تمام پختون علاقوں سے گزرتے تھے۔ اس سلسلے میں پختون قبائل کا تعاون بہت کارگر ہو سکتا تھا۔

افغانستان کی جنگ طول پکڑتی جا رہی تھی مجاہدین نہ تو سوویت یونین کو افغانستان سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ ہی کابل انتظامیہ کے جسم پر کوئی مہلک زخم لگایا جا سکا۔ بعض مبصرین تو اپنے تبصروں میں ان خیالات کا اظہار بھی کرنے لگے تھے کہ مجاہدین کی مہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی اور کابل انتظامیہ بالآخر افغانستان کا مکمل کنٹرول سنبھال لے گی۔

نجیب اللہ کی کوششوں سے کابل میں ایک اور جرگہ منعقد کیا گیا اس جرگے میں شامل ہونے والے رہنماؤں کی تعداد پہلے جرگے کی نسبت زیادہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جرگے میں کچھ پاکستانی پختون بھی شامل تھے۔ انہیں دنوں پاکستانی فوج نے ایکشن کر کے ہیروئن بنانے کی چند لیبارٹریاں مسمار کر دیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہیروئن بنانے والے پاکستانی حکومت سے ناراض ہو گئے۔ نجیب اللہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پختونوں کو پاکستان کے خلاف اکسایا۔ کابل ریڈیو نے بھی اپنی نشریات میں پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا۔

اپریل 1986ء میں پھر ایک لوئے جرگہ بلایا گیا جرگے میں ببرک کارمل موجود نہیں تھا صرف کارمل کا مختصر سا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ وہ انقلاب ثور کی سالگرہ کی تقریب میں بھی موجود نہیں تھا۔ اس کی عدم موجودگی نے کابل میں افواہوں کو جنم دیا کوئی کہہ رہا تھا جیل میں ہے، کوئی کہہ رہا تھا ہلاک کر دیا گیا ہے۔ الغرض جتنے منہ

باتیں ۔ بالآخر 4 مئی کو ریڈیو کابل نے ایک اعلان میں کہا کہ ببرک کارمل نے صحت کی خرابی کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا ہے، ان کی جگہ ڈاکٹر نجیب کو پارٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن کابل میں بہت سی جگہوں پر بکتر بند دستے دیکھے گئے تھے اور کارمل کے حق میں کابل کی سڑکوں پر مظاہرے بھی ہوئے جو غالباً آنے والے حکمران سے نفرت کے اظہار کے طور پر تھے۔

اس سے پہلے سوویت یونین کی قیادت بھی تبدیل ہو چکی تھی برژنیف کے بعد آندروپوف دو سوویت لیڈر یکے بعد دیگرے فوت ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے جنرل محمد ضیاء الحق سے جو اس کے پیشرو کے جنازے میں شرکت کے لئے گئے تھے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے برعکس افغانستان کے رہنما کو بڑی عزت و احترام دیا گیا تھا۔ ان دونوں کے بعد سوویت یونین میں ایک ایسے لیڈر نے اقتدار سنبھالا جو انقلاب کا حامی تو تھا لیکن وہ اس انقلاب کے ثمرات عوام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ وہ لیڈر تھا جس نے افغان مسئلے کو رستا ہوا ناسور کہہ کر اس کے سیاسی حل پر زور دیا۔ یہ لیڈر میخائل گورباچوف تھے جن کے دور حکومت میں سوویت یونین کی داخلی صورت حال میں واضح طور پر تبدیلی آئی۔ ماسکو کے عوام کو تحریر، تقریر اور تنقید کی آزادی ملی تو انہوں نے حکومت سے افغانستان کی جنگ سے متعلق سوالات کئے۔

ادھر نجیب اللہ نے حکومت سنبھالتے ہی ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور ملک کو متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ گورباچوف کے بیانات سے محسوس ہوتا تھا کہ سوویت یونین افغانستان سے فوجیں نکالنے پر تیار ہے اور اس کے لئے عائد کی جانے والی شرائط بھی قبول کرنے کو تیار ہے لیکن جنیوا مذاکرات سوویت افواج کی واپسی کے ٹائم ٹیبل کے اختلاف کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ اس زمانے میں گورباچوف کی حکومت اتنی مستحکم نہ تھی کیوں کہ انقلاب کے بعد جن لوگوں نے عوام پر ایک خاص قسم کا نظام زندگی مسلط کر رکھا تھا وہ اپنے مفادات سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ گورباچوف کو ان کی طرف سے مخالفت کا سامنا تھا۔ جس کی وجہ سے گورباچوف فوجوں کی واپسی کے ٹائم ٹیبل کے متعلق فیصلہ نہ کر سکے اور مذاکرات ناکام ہو گئے۔

آٹھ سال کی طویل اور صبر آزما جنگ کے باوجود مجاہدین کے ارادوں اور ان کے عزائم میں کوئی لچک نہیں آئی تھی ۔ وہ اسی طرح سپر پاور کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے ۔ وہ بڑے حوصلے اور ہمت سے جارحیت کا مقابلہ کر رہے تھے ۔ پورے افغانستان میں آگ اور لہو کا کھیل جاری تھا ۔ سوویت یونین اپنے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی افواج کو افغانستان سے واپس بلا سکتا تھا لیکن اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان تھا جو اقوام متحدہ کے دیئے ہوئے رہنما اصولوں کی روشنی میں مذاکرات کے لئے اصرار کر رہا تھا ۔

سوویت یونین کو مجبور کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ فوجی سیاسی اور دہشت گردی کا دباؤ جو آخری وقت تک ناقابل برداشت حد تک بڑھا دیا گیا ۔ سوویت روس کابل انتظامیہ کو اسلحہ کی سپلائی بند نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ روس کا موقف تھا کہ اس طرح کابل انتظامیہ تنہا رہ جائے گی ۔ جبکہ کابل انتظامیہ کے ساتھ اس کے کئی معاہدے موجود تھے جن کی رو سے سوویت حکومت کابل انتظامیہ کو اسلحہ دینے کی پابند تھی ۔ روس کا یہ سخت موقف معاہدہ پر دستخط کرنے میں تاخیر کا باعث بن رہا تھا ۔ آخر کار امریکہ نے ایک تجویز دی کہ سوویت یونین کابل انتظامیہ کو اسلحہ کی سپلائی جاری رکھے اور امریکہ بھی مجاہدین کو اسلحہ دینا بند نہ کرے ۔

عبوری حکومت کے قیام کا مسئلہ بھی معاہدہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا ۔ پاکستان چاہتا تھا کہ افغانستان میں روسی فوج کے انخلاء سے قبل ایک عبوری حکومت قائم ہو جائے جس میں مجاہدین بھی شامل ہوں ۔ پاکستان اور امریکہ کی کوشش اس لئے بھی ضروری تھی کہ اس طرح عبوری حکومت تشکیل پانے سے افغانستان میں خون خرابے کا خطرہ ٹل جاتا ۔ اس سلسلے میں طویل مذاکرات ہوئے جن میں یہ طے پایا کہ عبوری حکومت کی تشکیل کا معاملہ افغان مجاہدین اور کابل انتظامیہ پر چھوڑ دیا جائے اور اقوام متحدہ کے نمائندے مسٹر کارڈویز اس معاملے میں وساطت کا کردار ادا کریں گے ۔

اس طرح یہ بات دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان طے پا گئی کہ عبوری

حکومت کی تشکیل صرف اور صرف افغان عوام کا مسئلہ ہے اور اس میں کوئی دوسری طاقت مداخلت نہیں کرسکتی۔ ان امور کے طے پانے کے بعد 14 اپریل 1988ء کو ایک سمجھوتے پر دستخط کردیئے گئے جسے ''جنیوا امن معاہدہ'' کا نام دیا گیا۔ اس طرح جنگ بند ہوگئی، روسی افواج افغانستان سے واپس چلی گئیں لیکن افغانستان میں امن قائم ہونے کے بجائے مختلف الخیال افغان مجاہدین کے گروہوں کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔

جب روسی فوجوں اور افغان مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی تو عوام کی ایک بڑی تعداد کو ایران اور پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔ پاکستان میں ان کی تعداد تیس لاکھ سے بھی تجاوز کرگئی چنانچہ حکومت پاکستان نے ازراہ ہمدردی انہیں وہ تمام سہولیات فراہم کیں جو بنیادی انسانی حقوق سے متعلق ہیں۔ آبادی کے اس قدر دباؤ کی بنا پر حکومت پاکستان نے جنگ کے مسئلے کو میدان کارزار میں حل کرنے کے بجائے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی فورموں سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا اس ضمن میں پاکستان نے یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا اور جنرل اسمبلی میں 23 کے مقابلے میں 116 ووٹوں کی اکثریت سے اقوام عالم نے افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء کا مطالبہ کیا۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قراردادوں میں افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے لئے مذاکرات میں اگرچہ پاکستان اور ایران کو فریق بنایا گیا، لیکن روس سمیت ساری دنیا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ افغانستان میں اصل فریق دو ہی تھے ایک روس جس نے اس قدیمی آزاد اور روائتی غیر جانبدار مسلم ملک میں اپنی فوجیں داخل کررکھی تھیں اور دوسرا فریق افغان مجاہدین تھے جنہوں نے اپنے ملک سے روسی فوجوں کو نکالنے کے لئے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔

پاکستان اور ایران کو اقوام متحدہ نے اس لئے فریق بنایا کہ یہ دونوں افغانستان

کے برادر ہمسایہ ملک ہیں اور روس کی فوجی کاروائی کے نتیجے میں جن چالیس لاکھ سے زائد افغان باشندوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے ایران اور زیادہ تر پاکستان میں پناہ لی تھی۔ان دونوں ممالک نے مذاکرات کے ذریعے کوشش کی کہ افغان مہاجرین کی عزت اور حفاظت کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس جانے کی ایسی صورت نکل آئے جو افغان عوام خاص طور پر حملہ آور روسی فوجوں سے نبرد آزما افغان مجاہدین کے لئے قابل قبول ہو۔

روس پاکستان اور ایران پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ کابل میں اس کی مسلط کردہ ببرک کارمل حکومت کو تسلیم کر لیں اور اس سے ہی براہ راست بات چیت کریں ۔یہ صورت پاکستان اور ایران کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔

افغانستان کے مسئلے کے پرامن سیاسی حل کی تلاش کے لئے جون 1982ء کو جنیوا مذاکرات کا پہلا دور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے ذاتی نمائندے ڈیگو کارڈویز کی نگرانی میں شروع ہوا۔ایران نے ابتداء میں مذاکرات میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا لیکن پہلے دن کے مذاکرات میں ایران کی طرف سے اپنے فیصلے میں اچانک تبدیلی سے کچھ پریشان کن صورت حال بھی پیدا ہوئی۔ایران کا اصولی موقف یہ تھا کہ افغانستان کے عوام کی اصل نمائندگی وہ مجاہدین کرتے ہیں جو اپنے ملک پر حملہ آور روسی فوجوں کے خلاف داد شجاعت دے رہے ہیں کیوں کہ ببرک کارمل کی حکومت تو روس کی مسلط کردہ ہے۔پہلے ایران نے بالواسطہ طور پر جنیوا مذاکرات میں شمولیت قبول کر لی تھی۔ایران کے وزیر خارجہ ڈاکٹر علی اکبر ولایتی نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو باضابطہ طور پر اطلاع بھی دے دی تھی کہ جنیوا میں ایران کے نمائندے ڈاکٹر محمد جعفر محلاتی مذاکرات کی نوعیت اور رفتار سے اپنی حکومت کو مطلع کر تے رہیں گے۔لیکن پھر اچانک ایران نے فیصلہ بدل کر اس حد تک بھی مذاکرات میں

شرکت سے انکار کر دیا۔تاہم اقوام متحدہ کی طرف سے اور پاکستان کے زور دینے پر ڈاکٹر محلاتی کو مذاکرات میں طے شدہ صورت حال کے مطابق بالواسطہ شرکت کے لئے نیو یارک سے جنیوا روانہ ہونے کی ہدایت کر دی گئی۔

مذاکرات کے دو دور ہوئے لیکن کسی فیصلہ پر نہ پہنچنے کی وجہ سے مذاکرات اگلے سال تک کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔بات چیت کے بعد اقوام متحدہ کے ایک ترجمان نے اپنے تحریری بیان میں صرف یہ بتایا کہ اس میں مذاکرات کے طریق کار اور پہلے سے طے شدہ ان چار معاملات پر ابتدائی نوعیت کا تبادلہ خیالات ہوا ہے جن کی تفصیل اس کے بیان کے مطابق یوں ہے:

(1) افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی

(2) اس ملک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت

(3) آئندہ عدم مداخلت کے لئے بین الاقوامی ضمانتیں

(4) اور افغان مہاجرین کی رضا کارانہ واپسی

مذاکرات کا دوسرا دور 11 اپریل 1983ء کو شروع ہوا اور 22 اپریل تک جاری رہا ان مذاکرات میں پاکستان کا موقف قدرے نرم ہو گیا۔اس سے پہلے پاکستان کی حکومت اس بات پر مصر تھی کہ نہ صرف افغانستان سے روسی افواج واپس چلی جائیں بلکہ وہاں کے عوام کو حق خود ارادیت کا موقع بھی مہیا کیا جائے تا کہ وہ اپنے حکومت کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔

مذاکرات کے ابتدائی دور میں پاکستان نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ روسی افواج کی واپسی کے بعد کرمل انتظامیہ کا وجود برداشت نہیں کرے گا لیکن اب اس نے اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا اور پاکستان اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ کابل میں کیمونسٹ حکومت کو ختم کر دیا جائے۔روسی فوجیں مکمل طور پر افغانستان سے چلی جائیں اور وہاں

جو بھی حکومت ہو وہ 1893ء کی بین الاقوامی (ڈیونڈر لائن) سرحد کو تسلیم کرنے کا اعلان کرے۔ کارڈویز نے دونوں وفود سے ملاقات کے دوران سمجھوتے کا مسودہ دیا جو انہوں نے سیکرٹری جنرل کے مشورے سے تیار کیا تھا۔ اس سمجھوتے کے مسودے میں فریقین سے بات چیت کے دوران ترامیم ہوتی رہیں گی۔ اس وقت سب سے اہم سوال یہ تھا کہ افغان مہاجرین کو گھروں میں باعزت واپسی کے لئے خود مہاجرین کے نقطہ نظر کا کس طرح تعین کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایران کا موقف تھا کہ مذاکرات میں افغانستان میں مزاحمت کرنے والے افغان نمائندے بھی شریک ہونے چاہئیں۔

مذاکرات کا تیسرا دور 16 جون 1983ء کو شروع ہوا یہ دور جون میں ختم ہو گیا۔ اس دور میں جہاں افغانستان سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی کا پروگرام، افغان مہاجرین کی رضا کارانہ طور پر اپنے گھروں کو واپسی کے لئے سازگار حالات اور عدم مداخلت کے بارے میں بین الاقوامی ضمانتیں شامل تھیں وہاں واخان کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔

مذاکرات کا چوتھا دور 20 جون 1985ء کو شروع ہوا یہ دور اس لحاظ سے کامیاب ثابت ہوا کہ اس میں پہلی بار فریقین کے رویوں میں لچک پیدا ہونے کے علاوہ یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں اس مسئلے کے حل کے لئے کس قسم کے مسائل کو حل کرنا چاہئے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نمائندے مسٹر کارڈویز نے کہا کہ فریقین مذاکرات کے انتہائی پیچیدہ اور مشکل دور سے گزر رہے ہیں اس لئے مذاکرات کے اس دور کی بات چیت کا متن ظاہر کرنا ان کے مفاد میں نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ فریقین اپنے ہمراہ معاہدے کے مسودہ کے چار متن لے جا رہے ہیں تا کہ ان پر سوچ بچار کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے سرحدی علاقوں پر افغانستان کی گولہ باری بھی زیر غور آئی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ یعقوب علی خان نے کہا کہ مسئلہ کے حل کی بنیاد بننے والے چار اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یعنی متفقہ ٹائم ٹیبل کے اندر

روسی فوجوں کی واپسی، عدم مداخلت، افغان مہاجرین کی آبرومندانہ بحفاظت واپسی اور بین الاقوامی ضمانتیں۔

جنیوا مذاکرات کا پانچواں دور 29 اگست کو افغانستان اور پاکستان کے نمائندوں کے درمیان شروع ہونے سے پہلے ہی تعطل کا شکار ہوگیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ افغان وفد کا اصرار تھا کہ مذاکرات براہ راست کئے جائیں۔اس اجلاس میں مسئلہ افغانستان کے حل کے سلسلے میں امکانی سمجھوتے پر عملدرآمد کے لئے بین الاقوامی ضمانتوں پر غور کیا جانا تھا۔ان ضمانتوں کے سلسلے میں ضمانت فراہم کرنے والے مجوزہ ممالک کی جانب سے ابتدائی ردعمل موصول ہوا، جو مثبت تھا۔سمجھوتے کے سلسلے میں ضمانتوں کی فراہمی کے لئے امریکہ اور روس کے نام تجویز کئے گئے تھے۔

چھٹا دور 16 دسمبر 1985ء کو شروع ہوا لیکن 19 دسمبر کو بغیر کسی فیصلے کے ختم ہوگیا۔اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نمائندے کارڈویز نے پریس کانفرنس میں کہا کہ دونوں فریقوں کو اپنی تجاویز پر غور کے لئے وقت دینے کو وہ وقفہ سمجھتے ہیں اس لئے اگلے دور کو ساتواں دور کہنا غلط ہوگا۔مبصرین کا کہنا تھا کہ مذاکرات میں پیش رفت نظر آرہی تھی لیکن وزیر خارجہ شاہ محمد دوست کی قیادت میں افغان وفد نے اب مذاکرات براہ راست شروع کرنے پر زیادہ زور دیا۔بات چیت کا تعطل اس وقت ہوا جب کارڈویز نے دونوں ممالک کے نمائندوں سے فوجوں کی واپسی سے متعلق چوتھے نکتہ سے نبٹنے کے لئے کہا اور افغان وفد نے یہ ردعمل ظاہر کیا کہ اس معاملے پر وہ براہ راست بات کریں گے، جبکہ پاکستانی وفد کا اصرار تھا کہ بالواسطہ طریق پہلے ہی کی طرح برقرار رہنا چاہئے۔ اس دور میں سرفہرست روسی فوجوں کی واپسی کے معاملہ کو ضمانتوں کی فراہمی اور مہاجروں کی واپسی کے معاملوں سے منسلک کرنے کا طریقہ زیر بحث رہا۔

8 مارچ 1986ء کو اسلام آباد میں پاکستان کے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب

خان اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے خصوصی نمائندے مسٹر ڈیگو کارڈ ویز کے درمیان مسئلہ افغانستان پر جنیوا کے بالواسطہ مذاکرات کے اگلے دور سے متعلق باضابطہ بات چیت کا دور ہوا۔

چھٹے دور کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہونے سے پہلے 4 مئی 1986ء کو روسی حکومت نے افغان صدر ببرک کارمل کو برطرف کر دیا۔ یہ پاکستان کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا مبصرین کا کہنا تھا کہ روسی حکام نے پاکستان کی یہ شرط پوری کر دی ہے۔ ببرک کارمل کو دسمبر 1979ء کے آخر میں مشرقی یورپ سے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے کابل پہنچایا گیا تھا اور روسی اشیر باد کے نتیجے میں حفیظ اللہ امین کی جگہ افغان سربراہ بنایا گیا تھا۔ اس وقت تک 80000 روسی افواج افغانستان میں داخل ہو چکے تھے۔ 27 دسمبر کو حفیظ اللہ امین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ببرک نے عنان حکومت خود سنبھال لی۔ وہ پہلے انقلابی کونسل کا صدر بنا اور اس کے ساتھ ہی نئی حکومت کی کابینہ کا اعلان کر دیا۔ اس نے وزیر اعظم اور انقلابی کونسل کے چیئرمین کے عہدے اپنے پاس رکھے اور افغان فوج کا کمانڈر انچیف بھی خود ہی بن بیٹھا۔ کارمل کو اقتدار سے ہٹا کر اس کی جگہ خفیہ پولیس کے سابق سربراہ پختون جنرل نجیب اللہ کو حکمران عوامی جمہوری پارٹی کا نیا جنرل سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

150ء میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں ببرک کو پانچ سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ اس نے 1957ء سے 1965ء تک وزارت منصوبہ بندی میں کام کیا پھر خلق پارٹی کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ 1979ء میں حفیظ اللہ امین نے اسے سفیر بنا کر چیکوسلاویہ میں بھیج دیا اور اسی سال کے آخر میں اس پر غداری کا الزام لگا کر سفیر کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ اس وقت سے چیکوسلاویہ میں ہی جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک قسمت نے پلٹا کھایا اور اسے ایک خصوصی روسی طیارے میں

بٹھا کر کابل بھیج دیا گیا۔

ببرک کارمل کی جگہ نجیب اللہ کا تقرر روس کا اسٹراٹیجک موو تھا جس کے کئی مقاصد ہو سکتے تھے۔

☆ افغانستان میں ببرک کارمل کی جگہ ایک سخت اور موثر شخص کو اقتدار میں لانا۔

☆ افغانستان میں سوشلسٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنا۔

☆ مجاہدین جس طبقہ کو استعمال کرتے تھے اسے ختم کرنا یا اپنے ساتھ ملانا۔

☆ قبائل کو افغان انقلاب کے حق میں استعمال کرنا۔

☆ قبائل کی حمایت کے دروازے مجاہدین کے لئے بند کرنا۔

☆ پاکستان کی سرحدوں پر مسلح کاروائی کے ذریعہ دباؤ بڑھانا۔

☆ پاکستان کے اندر دہشت گردی کے ذریعہ انتشار پھیلانا۔

☆ پاکستان کے اندر افغان حکومت کے لئے رائے ہموار کرنا تاکہ پاکستان اپنے موقف سے ہٹ جائے۔

ڈاکٹر نجیب اللہ کے اقتدار سنبھالتے ہی یہ بات دیکھنے میں آئی کہ پاکستان کی سرحدوں پر اور پاکستان کے اندر دھماکوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔روس نے سیاسی اعتبار سے پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا دوسری طرف بھارت نے بھی پاکستان کے خلاف ایک اعصابی جنگ شروع کر رکھی تھی اور پاکستان کے جوہری پروگرام کے بارے میں پروپیگنڈہ تیز کر دیا تھا جس کا مقصد مغربی ممالک اور امریکہ میں پاکستان کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا تھا یہ وہ فضا تھی جس میں جنیوا میں مذاکرات بھی جاری تھے۔

5 مئی 1986ء کو ملتوی شدہ مذاکرات کا چھٹا دور پھر شروع ہوا جس میں فریقین نے مجوزہ مجموعی تصفیہ کی اس اہم چوتھی دستاویز کے لئے سمجھوتے کے بارے میں اپنا ابتدائی ردعمل ظاہر کیا جس کا تعلق افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے

نظام الاوقات اور دوسری تین دستاویزات کا اس کے رابطے سے تھا۔ ان دستاویزات کا تعلق افغانستان کے معاملات میں عدم مداخلت کے اصولوں، افغانستان میں عدم مداخلت کے سلسلے میں امریکہ اور روس کی طرف سے بین الاقوامی ضمانتوں کی فراہمی اور افغان مہاجرین کی وطن واپسی سے تھا۔ 9 مئی کو مذاکرات معمولی پیش رفت کے بعد ملتوی کر دیئے گئے 13 مئی کو دوبارہ مذاکرات کا آغاز ہوا 16 مئی کو مذاکرات میں توسیع کر دی گئی۔

21 مئی کو پاکستان نے یہ تجویز کیا کہ مجوزہ سمجھوتے پر مقررہ مدت میں عملدرآمد کی نگرانی کے لئے ایک تیسرے فریق کی ضرورت ہے پاکستان نے تجویز پیش کی کہ چوں کہ سمجھوتے پر اقوام متحدہ کے زیرانتظام ہی کام ہو رہا ہے لہٰذا افغان بحران کے حل کے لئے جو سمجھوتہ طے پائے اقوام متحدہ اس کی عدم خلاف ورزی کے لئے نگران کا کردار ادا کرے، جبکہ کابل انتظامیہ نے اس امر پر زور دیا کہ مجوزہ سمجھوتہ پر عملدرآمد کا کام فریقین پر چھوڑ دیا جائے۔ پاکستان نے کابل انتظامیہ کی اس تجویز کو رد کر دیا۔ چنانچہ 23 مئی کو یہ دور بھی ختم ہو گیا۔ کابل انتظامیہ کے نمائندوں نے مذاکرات میں جو نئی رکاوٹ پیدا کی اس کے نقصان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کا براہ راست مذاکرات کا مطالبہ مان لیا جاتا تو اس سے کابل میں روس کی حمایت سے قائم انتظامیہ نہ صرف خود کو جائز قرار دے لیتی بلکہ اپنی شرائط منوانے کی پوزیشن بھی مضبوط کر لیتی۔

جنیوا مذاکرات کا ساتواں دور 31 جولائی 1986ء کو شروع ہوا۔ پھر 8 اگست تک یہ دور بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا کیوں کہ روسی حکومت اپنی افواج کی واپسی کے لئے 18 ماہ کی مدت پر اصرار کر رہی تھی اور پاکستان کو یہ مدت قبول نہ تھی۔ جنیوا میں مسٹر کارڈویز نے یہ اعلان کیا کہ مذاکرات کا آٹھواں دور شروع ہونے کی کوئی

امید نہیں ۔ان مذاکرات نے اس وقت انتہائی نازک صورت اختیار کر لی جب اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر پیریز ڈیکویئار نے کہا کہ اقوام متحدہ کبھی نہ ختم ہونے والے یا لا متناہی مدت تک چلنے والے مذاکرات کا اہتمام نہیں کر سکتی۔اس صورت حال میں روسی لیڈر میخائل گورباچوف نے رضا کارانہ طور پر روسی فوجوں کی 6 رجمنٹوں کی واپسی کا اعلان کر دیا۔شائد وہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ افغانستان سے اپنی افواج کی واپسی کے دعویٰ میں مخلص ہیں ۔اس ڈرامائی تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے ذاتی نمائندے ڈیگو کاردویز نے کہا کہ روس نے افغانستان سے اپنی فوج کی جزوی واپسی کا جو وعدہ کیا ہے وہ ایک مثبت قدم ہے اور بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

7 ستمبر 1987ء کو آٹھواں دور ہوا جس کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ آخری اور فیصلہ کن دور ہوگا لیکن یہ دور بھی بے نتیجہ رہا بات اس بار بھی روسی فوجوں کی واپسی کی مدت کے سوال پر آ کر ختم ہوگئی ۔روس نے اصولی طور پر اپنی فوجیں واپس بلانے کی بات تسلیم کر لی لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ یہ واپسی کتنی مدت میں ہوگی؟ روس نے یہ مدت بڑی مشکل سے 16 ماہ مقرر کی۔اس دور کی ایک خاص بات یہ تھی کہ کابل انتظامیہ نے جنیوا مذاکرات میں ایران کی شمولیت کا بھی مطالبہ کیا۔

بالآخر چھ سال کی گفت شنید کے بعد 14 اپریل 1988ء کو جنیوا میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان معاہدہ طے پایا۔روس اور امریکہ نے ضمانتیوں کی حیثیت سے اس پر دستخط کیے ۔معاہدے کا متن یہ ہے:

(1) الف:

پاکستان اور افغانستان کے مابین باہمی تعلقات عدم مداخلت کی بنیاد پر فروغ پائیں گے اور فریقین سختی سے اس پر عمل کریں گے۔

ب: عدم مداخلت کے اصولوں پر عملدرآمد کے لئے فریقین یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی خودمختاری، سیاسی آزادی، سرحدی استحکام، قومی اتحاد اور ایک دوسرے کی غیر جانبداری کا احترام کریں گے۔ فریقین کسی دوسرے ملک کی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سماجی نظام اور حق خودارادی کا احترام کریں گے۔ اور کسی صورت میں بھی ایک دوسرے کو دھمکی یا طاقت کے استعمال کرنے کا حق نہ ہوگا۔ یہ یقین دہانی کرانے کے لئے کہ اس کی سرحد کسی صورت میں بھی استعمال نہیں کی جائے گی۔ فریقین مسلح مداخلت سے گریز کریں گے، دہشت گردوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی بھی امداد نہیں کر سکے گا۔

ج: موجود معاہدے پر عمل درآمد کا اطلاق 15 مئی 1988ء سے ہوگا۔

د: یہ معاہدہ جب سے لاگو ہوگا تو اس کی تکمیل بھی اسی حساب سے ہوگی۔

ر: یہ معاہدہ انگریزی پشتو اور اردو میں لکھا گیا ہے تمام متن مستند ہیں اختلاف کی صورت میں انگریزی متن کو ترجیح دی جائے گی۔

(2)

الف: امریکہ اور روس نے ضمانتیوں کی حیثیت سے اس معاہدے پر دستخط کئے ہیں افغانستان کی ضمانت روس نے اور پاکستان کی ضمانت امریکہ نے دی ہے۔

ب: ایک دوسرے معاہدے کے تحت یہ طے پایا کہ سرزمین پاکستان پر جتنے بھی مہاجرین زندگی گزار رہے ہیں انہیں حکومت پاکستان رضاکارانہ طور پر اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دے گی۔ واپس جانے والے افراد کو وہ تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی جو مقامی باشندے پہلے ہی حاصل کر رہے ہیں۔

ج: واپس جانے والے تمام باشندے جمہوریہ افغانستان کے امور میں شرکت کا حق رکھیں گے، حکومت پاکستان واپس جانے والے افراد کی پرامن واپسی کی ذمہ

دار ہوگی۔

(3)

ا: دونوں حکومتوں کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین افغانستان واپس جانے والے افراد کو مالی امداد فراہم کریں گے۔

ب: روس 15000 فوجیوں میں سے آدھے فوجی 15 اگست 1988ء تک واپس بلالے گا۔

ج: 15 مئی 1988ء سے 9 ماہ تک تمام روسی افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں گی۔

اگرچہ دنیا کے ''امن پسند'' ممالک نے اس معاہدے کو سراہا لیکن ایران اور افغان مہاجرین نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ زین نورانی نے کہا کہ ضمانتیوں کے کہنے پر ہی معاہدے پر دستخط کیے گئے ہیں، انہوں نے کہا کہ وہ افغانستان کی موجودہ حکومت کو تسلیم نہیں کرتے اس ضمن میں انہوں نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کے نمائندے پیریز ڈی کوئیار کو ایک مراسلہ بھی روانہ کیا۔

اس معاہدے میں یہ طے کیا گیا کہ روس چلا جائے گا لیکن اس کے جانشین نجیب کو بدستور جنوبی افریقہ کے اقلیتی حکمرانوں کی طرح تخت کابل پر براجمان رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس معاہدے کا پہلا نقطہ یہ تھا کہ اب روس کی جگہ فرنٹ لائن پر نجیب ہوگا اور روس پس پردہ اپنی موجودگی کا احساس برقرار رکھے گا اور اگر لڑائی ہوئی تو دونوں اطراف افغان ہوں گے کچھ نجیب کے حامی اور کچھ مادر وطن کی آزادی کے لئے متاع زندگی نثار کرنے والے مجاہدین ہوں گے۔ امریکہ اور روس چوں کہ امن عالم کے ٹھیکیدار تھے اس لئے انہوں نے معاہدے کی روح پانچ نکات پر استوار کی:

☆ افغانستان سے روسی فوجیں اپنی جان بچا کر واپس چلی جائیں گی مگران کے مفادات کے تحفظ کا اختیار کٹھ پتلی نجیب کے پاس رہے گا۔

☆ افغانستان میں جنگ اس طرح شروع رہے کہ دونوں طرف نقصان مسلمانوں کا ہی ہو۔

☆ معاہدہ اس طرح منظور کرایا گیا کہ اس کی بنا پر پاکستان، مجاہدین اور مہاجرین کے درمیان اتحاد و اتفاق کے رشتے بتدریج کمزور ہوتے جائیں۔

☆ دونوں سپر پاورز کا اسلحہ فروخت ہونے کا سلسلہ بند نہ ہو۔

☆ پڑوسی ملک میں جنگ وجدل کا بازار گرم رہنے سے پاکستان کے اندر بھی حقیقی امن واستحکام قائم نہ ہو سکے۔

ان نکات پر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عالمی ادارے نے جنیوا مذاکرات کے نتیجے میں طے پانے والے معاہدے میں امریکہ اور روس یعنی سفید فاموں کے مفادات کا تو پورا پورا تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے مگر افغانستان کے اندر امن وامان کی ضرورت کو بالائے طاق رکھ کر ماسکو اور واشنگٹن کو یہ پروانہ جاری کر دیا کہ وہ اپنے اپنے اتحادیوں کو اسلحہ فراہم کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں کیا امن وامن برقرار رہ سکتا تھا؟

جنیوا معاہدہ عصر حاضر کی تاریخ کا انتہائی کٹھن معاملہ تھا اور یہ پہلے طویل ترین مذاکرات تھے جن میں روس کی موجودگی کے باوصف ایک معاہدہ بہر طور تحریری ہی نہیں بلکہ اس پر دستخط کرنے کی بھی نوبت آئی۔ اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے مسٹر کارڈ ویز کو اس معاہدے کے لئے کئی سال تک صبر آزما اور دشوار ترین مذاکراتی اجلاسوں کی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا لیکن معاہدے پر دستخط کرنے کی تقریب محض 26 منٹ تک جاری رہی۔ متعلقہ فریقین کی طرف سے تقریب کے دوران کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا

گیا لیکن ان کے تیوروں سے بہت کچھ آشکار ہو گیا۔

جنیوا معاہدے کے تحت 15 مئی 1988ء کو افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی شروع ہو گئی اور اس کے ساتھ افغانستان میں مجاہدین نے واپس جانے والے روسی فوجیوں پر گولہ باری کی تاہم اس کا اس معاہدے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ 4 جون 1982ء کو میخائل گورباچوف نے امریکی صدر ریگن کی ماسکو میں موجودگی کے دوران ایک پریس کانفرنس میں الزام عائد کیا کہ امریکہ اور پاکستان جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے افغان مجاہدین کی مدد کر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مجاہدین کی اکثریت نے جنیوا معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے مجاہدین نے اپنی کاروائیاں جاری رکھیں اور 20 مئی کو جلال آباد پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اس دوران امریکہ نے اپنی پسندیدہ حکومت قائم کرنے کے لئے افغانستان کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جہاں امریکہ نواز، روس نواز اور اسلام پسندوں کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ افغانستان میں چوری، قتل، ڈکیتی، رہزنی، اغواء غرضیکہ ہر قسم کی وارداتیں عام ہو گئیں تو افغانستان کے نوجوانوں نے طالبان کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنی حکومت قائم کر لی اور ان برائیوں کا قلع قمع کر دیا اس سلسلے میں انہیں اسلام پسندوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی جو امریکہ کے نزدیک مجاہد تھے لیکن جب امریکہ نے اپنے منصوبے خاک میں ملتے ہوئے دیکھے تو نائن الیون کے واقعے کی منصوبہ بندی کر کے طالبان کو عالمی دہشت گرد قرار دے کر ان پر چڑھائی کر دی۔

مشرقی اور مغربی برلن کا اتحاد (1089ء)

سات سو پچاس سال پران شہر برلن پہلی مرتبہ 1701ء میں اس وقت کی مملکت پروشیا کا صدر مقام بنایا گیا۔ مملکت پروشیا کے بیشتر حصے اب روس اور پولینڈ کی سرزمین کہلاتے ہیں۔ 1871ء میں شہر برلن کو دوسری جرمنی رائش کا صدر مقام بنایا گیا اور 1920ء میں عظیم تر برلن کی تعمیر کا بیڑہ اٹھایا گیا۔ 1813ء کے بعد برلن نے پہلی مرتبہ اپریل 1945ء میں کسی غیر ملکی لشکر کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ 25 لاکھ نفری پر مشتمل روسی فوجی دو گروپوں میں تقسیم ہو کر 830 مربع کلومیٹر کے اس شہر کو ہر طرف سے گھیرے میں لے چکی تھی۔

روسی ریڈ آرمی کا دباؤ مغرب کی جانب بڑھتا جا رہا تھا، ان کی کوشش تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں اتحادی فوجوں کے ساتھ مل کر جائیں اور شہر برلن پر مکمل قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہٹلر کو زندہ گرفتار کر لیں۔ ہٹلر کو زندہ گرفتار کرنے کی روسی افواج کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی کیوں کہ ہٹلر بمعہ اپنی اہلیہ ایوا براؤن 30 اپریل 1945ء کو خودکشی کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا اور اس کے حکم کے مطابق اس کے ساتھی ہٹلر اور ایوا براؤن کی لاش پر بار بار پٹرول چھڑک کر اس حد تک جا چکے تھے کہ اب برلن میں واقع قصر چانسلر کے باغیچہ میں شعلوں اور راکھ کے علاوہ کسی دوسری چیز کی شناخت ہی ممکن نہ تھی۔ روسی اور اتحادی افواج ہٹلر کی موت سے یہ فائدہ اٹھانے میں ضرور کامیاب ہو گئے کہ صرف دو دن بعد 2 مئی کو جرمن فوجوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

ہٹلر کی اقتدار سے چمٹے رہنے کی شدید خواہش نے اس عظیم شہر کو برباد کر دیا۔ جرمن قوم شدید جانی و مالی نقصان اٹھانے کے باوجود سرنگوں ہو گئی اور روسی افواج نے شہر میں موجود ڈھائی لاکھ عمارتوں کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے اٹھارہ لاکھ گولے

برلن شہر پر برسائے اور ریڈ آرمی نے صرف اس شہر پر قبضہ کرنے کی خاطر تین لاکھ سے زیادہ افراد کی جانوں کا نذرانہ وصول کیا۔اس شہر کے محاصرے کے لئے ساڑھے تین ہزار ٹینک اور دوسری بکتر بند گاڑیاں استعمال کیں ۔527 ہوائی جہازوں نے بمباری میں حصہ لیااور شہر پر گرائے جانے والے بموں کے محض شیل اگر وزن کئے جاتے تو ان شیل کا وزن 36 ہزار ٹن بن جاتا۔اس طرح جنگ بند ہوجانے کے بعد جب اتحادی افواج 88 ہزار ایکڑ پر محیط اس شہر میں داخل ہوئیں تو برلن شہر سے ساڑھے سات کروڑ و کیوبک میٹر ملبہ ہٹانا پڑااور بعد کے واقعات کے باعث یہ شہر توڑ کر مغربی اور مشرقی برلن میں تقسیم کر دیا گیا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ پر یہ شہر مجموعی طور پر بیس انتظامی اضلاع پر مشتمل تھا جنہیں مشرقی اور مغربی برلن قرار دے کر اتحادیوں آپس میں تقسیم کر لیا۔شہر برلن کی فی مربع کلو میٹر کثیف آبادی کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں اقتصادی فوائد نے بہت بڑا رول ادا کیا۔ 1961 میں دیوار برلن تعمیر ہوجانے کے بعد 3 لاکھ 70 ہزار مشرقی جرمن باشندے مغربی برلن میں آباد ہو گئے ۔اس کے علاوہ فرانس برطانیہ اور امریکہ کی افواج کی موجودگی کے باعث 2 لاکھ پچاس ہزار غیر ملکی اس شہر میں مستقل رہائش رکھنے پر مجبور ہو گئے جن میں سے محض ترک باشندوں کی تعداد ایک لاکھ نفوس سے زیادہ تھی جو زیادہ اجرت حاصل ہونے کے باعث اس شہر میں مستقل آباد ہو گئے ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برلن شہر کو خاصا برا وقت بھی دیکھنا پڑا ، مارچ 1948ء میں روس اتحادیوں کی جانب سے برلن میں بنائی جانے والی کنٹرول کونسل سے علیحدہ ہو گیا۔یہ محض اس لئے کیا گیا کہ روس اپنے کنٹرول میں جرمن شہروں میں اشتراکی نظام رائج کرنے کی غرض سے ایک نام نہاد مملکت کی بنیاد رکھے گا۔روس نے محض اس پر اکتفانہیں کیا بلکہ مغربی برلن کے ایسے زمینی راستے جو باقی ماندہ جرمن مملکت سے اس شہر کو ملاتے تھے یا تو کاٹ دیئے یا بلاک کر دیئے ۔یہ کاروائی گیارہ ماہ جاری رہی اور اس دوران محض فضائی راستہ برلن شہر سے رابطہ کا ذریعہ تھا۔امریکہ ، برطانیہ اور فرانس نے فضائی راستہ سے خوراک اور دوسرا ضروری سامان برلن پر گرانا شروع کر دیا تا کہ یہاں

کی آبادی مطمئن رہے اور امریکہ برطانیہ اور فرانس کو اپنی افواج مستقلاً اس شہر میں رکھنے کا جواز مل جائے۔ روس نے اس رویہ کے خلاف خاصہ احتجاج کیا اور 1958ء میں روسی وزیر اعظم خروشیف نے دھمکی دی کہ اگر فرانس، برطانیہ اور امریکہ نے برلن خالی نہ کیا اور اسے غیر فوجی آزاد شہر کا درجہ نہ دیا تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ باقی تین اتحادیوں نے جب اس دھمکی کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ لیا تو روس نے برلن شہر کو بذریعہ دیوار تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور غیر معمولی سرعت سے کنکریٹ کے بلاکوں کی مدد سے اگست 1961ء میں دیوار برلن مکمل کر لی گئی۔

مغربی جرمنی والوں کو اس پار جانے کے لئے ایک پرمٹ کی ضرورت ہوتی تھی اور دیوار پر تعینات گارڈ کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھے۔ مشرقی جرمنی نے فوج کی مشین گنوں سے لیس اس لائن کے ساتھ ساتھ خاردار تار بچھا دی جو مغربی اور مشرقی برلن کو علیحدہ کرتی تھی۔ دیوار کے چنے جانے کے بعد مغربی برلن کو جانے کے 80 راستوں کو کم کر کے 7 کر دیا گیا۔ کیمونسٹوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئی دیوار کی مغربی سمت 110 گز چوڑی ''نو مین لینڈ'' بنائی جائے۔ لیکن جب اتحادی فوج اور ٹینک اس زون میں داخل ہوئے تو وہ اپنے مطالبے سے ہٹ گئے اور اتحادیوں نے ان اقدامات کو غیر قانونی اور جابرانہ قرار دیا۔

مغربی جرمنی نے اپنی سلامتی اور آزادی کے لئے فرانس، برطانیہ اور امریکہ پر زور دینا شروع کر دیا کہ برلن کو ایک خصوصی شہر کی حیثیت دی جائے اور اس شہر میں آباد لوگوں کو تحفظ اور سکون فراہم کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ چنانچہ ستمبر 1971ء میں امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے تاکہ برلن میں آباد لوگوں کی زندگی کو آسان بنایا جا سکے اور مغربی حصہ سے مشرقی حصہ میں جانے والے لوگوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ اس معاہدہ کے تحت بڑی بڑی باتیں جو طے پا گئیں وہ کچھ اس طرح تھیں:

☆ روس جرمنی کے مغربی حصہ میں مغربی اتحادیوں یعنی امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہے اور اس پر روس کو کوئی اعتراض نہیں۔

☆ روس مغربی برلن کا مغربی جرمنی کے دوسرے شہروں سے رابطہ تسلیم کرتا ہے اور اس بات پر رضامند ہے کہ مغربی برلن کو باہر کی دنیا میں مغربی جرمنی اپنی مرضی کے مطابق متعارف کرا سکتا ہے۔

☆ مغربی برلن کو جانے والی ٹریفک کی آمد و رفت روسی حفاظت میں ہوگی۔

☆ مغربی برلن کے باشندے جن پر مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی جانے پر پابندی تھی اسے فی الفور ختم کیا جاتا ہے۔

☆ مغربی برلن مغربی جرمنی کا حصہ تصور نہیں ہوگا اور اس کا نظم ونسق مغربی اتحادی چلائیں گے۔

☆ مغربی برلن سے انتخابات میں منتخب ہونے والے افراد مغربی برلن پارلیمنٹ میں شرکت تو کر سکیں گے مگر ووٹ دینے کے حق میں۔۔۔ برلن پر لاگو نہیں کیے جائیں گے بلکہ یہ مغربی جرمنی کی پارلیمنٹ کو پیش کیے جائیں گے اور یہ پارلیمنٹ ان قوانین کو برلن شہر کی مخصوص حیثیت کے مطابق ڈھالنے کی پابند ہوگی۔

☆ برلن کی فضائی حدود اور فضائی ٹریفک مجموعی طور پر مغربی اتحادیوں کے پاس ہوگی۔ اسی وجہ سے جرمن لائن لفٹ ہانسا برلن نہیں پرواز نہیں کرتی تھی۔

☆ مغربی جرمنی کی وفاقی حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ صدر جمہوریہ مغربی برلن میں اپنی سرکاری رہائش گاہ رکھ سکیں گے اور وفاقی حکومت مغربی برلن میں اپنا ایک کمشنر رکھنے کا مجاز ہوگا۔

یہ معاہدہ جون 1972ء میں لاگو کر دیا گیا اور برلن جرمن قوم نے مغربی برلن پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دیا ور وفاقی حکومت کے ساتھ دفاتر مغربی برلن میں کھول دیئے گئے جن میں 22 ہزار افراد کو روزگار مل گیا۔ کسٹم اور ڈاکخانہ میں کام کرنے والے 25 ہزار افراد اس کے علاوہ تھے۔ اس تمام تر طریقہ کار کے باعث دس بارہ سال کے عرصہ میں عملاً مغربی جرمنی مکمل طور پر مغربی برلن میں کارفرما نظر آنے لگا۔ مغربی برلن کی وفاقی حکومت نے برلن کی امداد کے لئے خصوصی فنڈ قائم کیا۔ برلن میں صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے اقدامات کیے اور مزدور طبقہ کو خصوصی مراعات کے ذریعے برلن

میں کام کرنے کو ترجیح دینے پر مجبور کیا گیا۔

انجینئرنگ پراڈکٹس میں برلن بہت آگے چلا گیا اور جرمنی کو مستقبل کی ٹیکنالوجی فراہم کرنے لگا۔ اس وقت الیکٹریکل انجینئرنگ شہر کی سب سے بڑی صنعت ہے اور تقریباً 55 ہزار افراد کو روزگار فراہم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ فوڈ انڈسٹری مکینیکل انجینئرنگ اور کیمیکل انجینئرنگ سے متعلق صنعتیں بھی شہر کا اہم حصہ ہیں۔ مغربی جرمنی نے غیر ملکی کمپنیوں کے 150 دفاتر کھولنے میں بھی مدد فراہم کی تاکہ برلن کی مصنوعات برآمد کی جا سکیں۔

مغربی برلن نے ہمبرگ کو سڑک کے ذریعہ برلن سے ملانے کے لئے ایک خصوصی شاہراہ کی تعمیر کے اخراجات برداشت کئے اور برلن میں واقعہ نہر کو صاف کر کے جہاز رانی کے قابل بنا دیا تھا تاکہ آبی راستوں سے بھی برلن باقی ملک سے منسلک ہو جائے۔ نومبر 1982ء تک یہ دونوں پراجیکٹ مکمل ہو گئے اور مغربی جرمن میں آباد جرمن باشندے اپنے ہم نسل مشرقی جرمنوں کے زیادہ قریب ہونا شروع ہو گئے۔

مشرقی جرمنی کی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کے لئے مغربی جرمنی نے 525 ملین جرمن مارک سالانہ بطور سامان کی ٹرانزٹ فیس کے دینا شروع کر دیئے۔ اس طرح مغربی برلن سیاسی اور معاشرتی دونوں محاذوں پر اشتراکیت کے نظام میں نقب لگاتا رہا اور اس کے ذرائع ابلاغ یہ باور کراتے رہے کہ جرمن قوم خواہ وہ مغربی حصہ میں رہتی ہو یا مشرقی حصہ میں دراصل وہ تاریخی لحاظ سے ایک ہی ہے اور یہ تمام اخراجات ہم کسی دوسری قوم پر نہیں کر رہے بلکہ اپنی ہی قوم کو مضبوط بنانے کے لئے کر رہے ہیں۔ مغربی برلن کے میئر نے 1985ء میں واضح اور دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دیا کہ برلن شہر کی تقسیم غیر فطری اور مصنوعی ہے دیوار کے دوسرے طرف آباد جرمن بھی اس تقسیم کو مستقل اور ہمیشہ قائم رہنے والی تصور نہیں کرتے۔ 11 ستمبر 1989ء کو ہنگری نے سات ہزار مشرقی جرمن کے افراد کو آسٹریا جانے کی اجازت دے دی اور اس طرح ان کی آزادی کا پروانہ جاری کر دیا تقریباً سات ہزار پناہ گزین اس رات مغربی جرمنی کی سرحد پر جمع ہو گئے جہاں مغربی جرمنی کی سرحد عبور کرنے پر وہ وہاں کی شہریت کے حقدار ہو گئے۔

2 مئی کو ہنگری نے خار دار تاروں کو کاٹنا شروع کر دیا اور بہت سے لوگ مختلف بہانوں سے مغربی جرمنی میں داخل ہو گئے اور انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ مشرقی جرمنی کے سربراہ ہونیکر کی حکومت نے ہنگری پر مشرقی جرمنی کے لوگوں کو آزاد راستہ دینے پر سخت تنقید کی۔ ماسکو نے بھی ہنگری کے اس اقدام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن کوئی ایکشن نہیں لیا۔ آخر 10 نومبر 1989ء کو وہ گھڑی آن پہنچی جب لوگ خوشی سے جھوم اٹھے یعنی اس رات بارہ بجے مشرقی جرمنی کی حکومت نے اپنی سرحدیں کھول دیں اور کنکریٹ کی آٹھ فٹ اونچی دیوار جو برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی گرانے کا آغاز ہو گیا۔

دیوار کو گرانے میں بچوں بوڑھوں اور عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ مشرقی جرمنی کے حکام نے آزادانہ الیکشن اور آزادی رائے کے نئے قوانین متعارف کرانے کا اعلان کیا۔ لوگ مارے خوشی کے جھوم اٹھے اور کچھ فرط جذبات سے رو دیئے۔ جرمن قوم نے برلن شہر کو دوبارہ حاصل کر لینے کے بعد جن اقدامات کے ذریعہ اپنی قانونی اور سیاسی حیثیت کا واضح اظہار کیا وہ اس طرح ہیں:

☆ اتحادی ملکوں کے ملٹری مشن کی علیحدہ حیثیت ختم کرتے ہوئے ان ملکوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنا ملٹری سٹاف اپنے سفارت خانہ میں منتقل کر دیں کیوں کہ قانونی طور پر اس شہر کی حفاظت اور حیثیت کا قیام اب ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔

☆ شپان ڈاؤ کی وہ جیل جس میں ہٹلر کا دست راست روڈولف 40 سال قید رہنے کے بعد 1987ء میں انتقال کر گیا تھا اور جس کو توڑ کر برطانوی حکومت نے اپنی آرمی کو ایک شاپنگ سنٹر بنا کر دیا تھا جرمن حکومت نے اسے واپس لے لیا۔

☆ اتحادی افواج کے افراد کو برلن شہر میں موجود برلن پولیس نے شناخت اور ٹریفک بے قاعدگیوں کے ضمن میں روکنا اور پوچھنا شروع کر دیا جو اس سے قبل ایک غیر قانونی عمل تھا۔

اپریشن ڈزرٹ سٹارم (عراق 1990ء)

صدام حسین نہ کسی کے آگے جھکے ہیں اور نہ جھکیں گے (یہ الگ بات کہ عراق پر جارحیت کر کے انہیں اقتدار سے ہٹا دیا گیا)۔ وہ جو فیصلے کرتے اکثر اتنے درست ثابت ہوتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ صدام حسین نے اپنی زندگی میں کئی فوجی انقلاب دیکھے اور انہیں دنیا کی دو عظیم سپر طاقتوں سے ٹکرانے کا تجربہ بھی ہوا۔ اپریل 1989 میں عراق کی نیشنل اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس میں صدام حسین کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ 1989ء کے آخر میں صدام حسین نے عرب ممالک کو خبردار کرنا شروع کیا کہ امریکہ خلیج میں فوجی مداخلت کرنا چاہتا ہے اور اس کا سب سے اہم مقصد عراق کی فوجی طاقت کو ختم کرنا ہے تاکہ اسرائیل کے لئے خطرات کو کم کیا جا سکے۔ اور یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ امریکہ جس طرح گریٹر اسرائیل کے منصوبے پر عمل پیرا ہے اس سے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو خاص طور پر خطرات لاحق ہیں۔ چنانچہ امریکہ کو عراق کے ایٹمی پروگرام پر سخت اعتراض تھا لیکن عراق اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھے ہوئے تھا۔ صدام حسین کو خلیجی ممالک میں امریکہ کے فوجی اڈوں پر بھی اعتراض تھا۔ اس دوران رملہ آئل فیلڈ کے مسئلہ پر ان کا کویت کے ساتھ تنازعہ ہو گیا۔ یہ علاقہ کویت اور عراق کے درمیان متنازعہ تھا اور ایک معاہدے کے تحت دونوں ممالک اس علاقے سے تیل نہ نکالنے کے پابند تھے لیکن عراق ایران جنگ کے دوران جب عراق جنگ میں مصروف تھا تو کویت نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقے سے تیل نکالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس زمانے میں عراق کی معیشت کا بہت ہی برا حال تھا۔ ایران کے ساتھ جنگ کے بعد عراق غیر ممالک کے اربوں ڈالر کا مقروض تھا۔ جن میں سے تقریباً 35 ارب ڈالر تو صرف خلیجی ممالک کے ہی دینے تھے۔ کویت سعودی عرب اور مغربی

ممالک کے ساتھ صدام حسین کا بنیادی تنازعہ یہ تھا کہ تیل کی قیمت میں کسی حد تک اضافہ کر دیا جائے جس سے عراق کی معیشت سنبھلنے کے قابل ہو جائے اور عراق اپنے قرضوں کا بوجھ کم کر سکے۔

عراق کی معیشت ایران کے ساتھ طویل جنگ کی وجہ سے تباہ ہو چکی تھی اور اسے زیادہ آمدن کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ سعودی عرب اور دیگر ممالک پر تیل کی قیمت نہ بڑھانے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے۔ عراق سعودی عرب اور کویت اس بات پر آمادہ ہو چکے تھے کہ تیل کی قیمت میں معمولی اضافہ کیا جائے گا لیکن عملاً سعودی عرب اور کویت نے تیل کی قیمت پہلے سے بھی کم کرنی شروع کر دی۔ سعودی عرب اور کویت صدام حسین کی بات اس لئے نہیں مانتے تھے کہ مغربی ممالک ان کی حمایت کر رہے تھے۔ عراق نے کویت اور سعودی عرب سے جس سطح پر بھی امداد مانگی انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کویت برطانیہ کے حکم پر چل رہا تھا اور سعودی عرب امریکہ کی امداد پر چل رہا تھا۔

سعودی عرب اور کویت کے بار بار انکار کی وجہ سے صدام حسین غصے میں آ گئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے عراق میں مقیم امریکی سفیر ایک چوالیس سالہ خاتون اپریل گلاپسی کو بلایا اور کہا کہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے، میں سخت تکلیف میں ہوں۔ اگر سعودی عرب اور کویت نے اپنا رویہ ٹھیک نہ کیا تو مجھے ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ اپریل گلاپسی نے صدام حسین کا پیغام اپنی حکومت تک پہنچایا اس کے بعد صدام حسین کے پوچھنے پر اپریل گلاپسی نے بتایا سعودی عرب اور کویت کے ساتھ آپ کے جھگڑے میں امریکہ کوئی دخل نہیں دے گا اور غیر جانب دار رہے گا۔ صدام حسین نے اس وقت اس بات کا یقین کر لیا کیوں کہ ابھی تک عراق کے امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات رہے تھے۔ جس کے بعد صدام حسین نے اعلان کر دیا کہ اب ہم کویت کے خلاف فوجی اقدامات کریں گے۔ اس کے بعد صدام نے عراقی فوجوں کو کویت کی سرحد پر بھیجنا شروع کر دیا اور ایک لاکھ عراقی فوج کویت کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اس دوران امریکی سیٹلائٹ عراق کی فوجوں کی نقل و حرکت نوٹ کرتے رہے۔

صدام حسین نے اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں۔ 2 اگست 1990ء کو عراق نے کویت پر قبضہ کر لیا اور دعویٰ کیا کہ امریکہ نے 6 اگست کو اپنی فوجیں اتاری تھیں تا کہ عراق کے خلاف ایکشن کیا جائے۔ صدام حسین کویت پر قبضہ کرنے کے بعد 8 اگست 1990ء کو ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرنے آئے تو انہوں نے انتہائی گرما دینے والے انداز میں امت مسلمہ کو جھنجھوڑا اور دوٹوک الفاظ میں کہا کہ میں غیر ملکی اطاعت قبول کرنے کے بجائے موت کو ترجیح دوں گا۔

امریکی صدر جارج بش (سینئر) کو عراقی حملے کی اطلاع ملی تو جارج بش نے اپنی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل کرسٹوفر کو بلایا اور پوچھا کہ اب امریکہ کو کیا کرنا چاہیے؟ امریکی کمانڈر انچیف نے اپنی غیر جانب دار پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لئے عراق اور کویت کے اثاثے منجمد کرنے اور امریکی بینکوں میں موجود ان کے کھاتے بند کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ امریکی صدر نے اس کا حکم بھی جاری کر دیا۔

اسی دوران مارگریٹ تھیچر نے امریکی صدر سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ امریکہ کو عراق کے خلاف کاروائی کرنی چاہیے اگر آپ خاموش بیٹھے رہے تو دنیا کہے گی کہ آپ بڑے کمزور صدر ہیں۔ اس کے بعد جارج بش (سینئر) نے امریکی جرنیلوں کو بلایا اور پوچھا کہ کویت پر عراق کے حملے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ امریکی جرنیلوں نے رائے دی کہ صدر بش عراق کے حملے کے خلاف ایک بیان جاری کر دیں عراق کویت چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ چنانچہ صدر بش نے عراق کے حملے کے خلاف ایک بیان جاری کر دیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اس دوران امریکی اور مغربی ذرائع ابلاغ اور خصوصاً یہودی لابی کی پشت پناہی میں کام کرنے والے اخبارات نے شور مچانا شروع کر دیا کہ امریکا عراق کے خلاف کاروائی کرے۔ ستمبر کے مہینے میں عراق کے خلاف یہ مہم انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

امریکہ میں گورنروں کے انتخابات کے بعد جارج بش نے مزید سخت رویہ اختیار کر لیا اس دوران امریکی فوجوں کی مشرق وسطیٰ کی طرف نقل و حرکت شروع ہوئی تو صدام نے خبردار کیا کہ امریکی فوجوں کی مشرق وسطیٰ میں مداخلت برداشت

نہیں کی جائیگی۔

چنانچہ امریکہ نے عراق کے خلاف جنگ کے لئے اپنی فوجیں اسرائیل کے راستے سعودی عرب پہنچا دیں۔ صدام نے واضح الفاظ میں کہا جو چاہے مرضی کرلو میں اپنی فوجیں کویت سے واپس نہیں بلاؤں گا لیکن اگر مجھ پر حملہ ہوا تو اسرائیل کو نہیں چھوڑوں گا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلمان ممالک میں صدام حسین کی مخالفت شروع ہوگئی (سرکاری سطح پر)۔

صدام حسین نے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کی کھل کر حمایت نہیں کی کیوں کہ ایران عراق جنگ کے ابتدائی سالوں میں پاکستان نے ایران کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود صدام حسین پاکستان کے عوام میں ہیرو بن کر ابھرے کیوں کہ انہوں نے عسکری اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود یہودیوں کے ساتھ پنجہ لڑایا تھا۔ اس جنگ میں صدام حسین نے کیا کھویا کیا پایا؟ اس بات کے قطع نظر اس جنگ کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ صدام حسین نے امریکہ کی اسلام دشمنی کا پول کھول دیا تھا کیوں کہ امریکہ نے کبھی فلسطین اور کشمیر کو آزاد کرانے کیلئے ڈیڈ لائن نہیں دی۔

جارج بش (سینئر) کو جب ایمنسٹی انٹرنیشنل نے یہ رپورٹ لاکر دی کہ صدام حسین نے کویت پر بہت مظالم کئے ہیں تو بش صاحب کو بہت دکھ ہوا لیکن یہ الگ بات ہے کہ اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں جب اسرائیل مظالم کرتا ہے اوران پر صدام حسین کے بین ان کو سنائی نہیں دیتے۔ اقوام متحدہ کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ نکاراگوا، پانامہ، قبرص اور لبنان میں کیا ہوا؟ ایک امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے لبنان سے اسرائیلیوں کو نکالنے کے مسئلے پر کیا موقف اختیار کیا؟ اس وقت امریکہ نے اسرائیل کی خاطر سلامتی کونسل میں ویٹو کردیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدام حسین امریکہ کی آنکھ میں اس لئے کھٹکتے تھے کیوں کہ وہ شام کی گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی قبضے کی مخالفت کرتے تھے۔

جب صدام حسین نے کویت پر قبضہ کیا تو امریکہ نے انہیں امن کا دشمن، غنڈہ، ڈاکو اور نہ جانے کیا کچھ کہنا شروع کردیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی نہیں بھلائی جاسکتی کہ امریکہ ہمیشہ سے اقوام متحدہ کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کو سبوتاژ کرتا رہا

ہے۔1989ء۔90ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب سلامتی کونسل نے پانامہ پر امریکی قبضے کے خلاف قرارداد منظور کی تو امریکہ نے ویٹو کر دیا۔اس سلسلے میں امریکہ نے تین قراردادوں پر ویٹو کیا جن میں سے دو قراردادوں نے پانامہ پر امریکی حملے کی مخالفت کی تھی اور ان قراردادوں کے دوران ایک میں برطانیہ نے ووٹ ہی نہیں دیا تھا اور دوسری میں اسی برطانیہ نے فرانس کے ساتھ مل کر امریکہ کا ساتھ دیا۔تیسری قرارداد اسرائیل کی ان کاروائیوں کے خلاف تھی جو انسانی حقوق کو کچلنے کے لئے کی گئیں تھیں۔

اسی طرح امریکہ نے اسرائیل کے ساتھ مل کر جنرل اسمبلی کی دو قراردادوں کو ویٹو کر دیا تھا جن میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسرائیل بین الاقوامی قانون کی پابندی کرے۔ان میں سے ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ امریکہ نکاراگوا کے خلاف اقتصادی جنگ بند کرے۔ان دونوں قراردادوں کے مطابق اس سے پہلے عالمی عدالت بھی امریکہ کے خلاف فیصلہ دے چکی تھی۔اس کے علاوہ امریکہ گذشتہ تین دہائیوں سے سلامتی کونسل کی ان قراردادوں کی مخالفت کرتا آرہا تھا جن میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرے۔

جب اقوام متحدہ میں پانامہ پر امریکی قبضے کے مسئلے پر بحث ہوئی تو سلامتی کونسل میں امریکی سفیر نے کہا تھا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ 51 یہ کہتی ہے کہ مخالف کے ہتھیاروں کے خلاف اپنے مفادات کے دفاع کے لئے طاقت کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔یہی دفعہ امریکہ کو پانامہ پر حملے کا اختیار بھی دیتی ہے۔کیوں کہ پانامہ نے اپنے علاقے کو منشیات سمگل کر کے امریکہ بھیجنے کے لئے استعمال کیا۔اسی طرح اس دفعہ نے امریکہ کو لیبیا پر بمباری کرنے کا حق دیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ نظریاتی قوانین امریکہ کے مفادات کا تحفظ کریں تو وہ ان کو اپنے حق میں استعمال کرے گا لیکن جب یہ نظریات امریکہ کی مخالفت میں جائیں تو امریکہ انہیں مسترد کر دے گا۔

اس وقت جب صدام حسین یہ کہہ رہے تھے کہ کویت کو عراق کے قبضے سے چھڑانا اور فلسطین کو اسرائیل کے قبضے سے چھڑانا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں تو امریکہ ان دونوں کڑیوں کو باہم ملانے پر تیار نہیں تھا۔

اپریل1990ء میں صدام حسین نے امریکہ کو یہ پیشکش کی تھی کہ اگر اسرائیل اپنے ایٹمی ہتھیار تباہ کر دے تو عراق بھی اپنے ایٹمی ہتھیار تباہ کرنے کو تیار ہے۔ اسکے جواب میں امریکہ نے یہ کہا تھا کہ ہمارا دوست اور اتحادی رہنے والا صدام حسین اگر اپنے ہتھیار تباہ کرنے کو تیار ہے تو یہ بہت ہی اچھا اقدام ہوگا لیکن اس کو کسی دوسرے ملک (اسرائیل) کے ہتھیاروں کے سسٹم تباہ کرانے کی تجویز پیش کر کے دوسروں کے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

عراق نے جب کویت پر حملہ کیا تو اس وقت اسے عرب ممالک کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی۔ روس کو اس زمانے میں صدام حسین کا سرپرست بھی کہا جاتا تھا۔ لیکن تین اگست1990ء کو امریکہ اور روس کی جانب سے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں کویت پر عراقی حملے کی شدید مذمت کی گئی۔ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر اور روسی وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے نے مشترکہ بیان میں عراق کے کویت پر حملہ کی مذمت کرتے ہوئے صدام حسین کو جارح قرار دیا جس کے ردعمل میں عراق نے چھ اگست کو اعلان کیا کہ کویت آج سے اس ملک کا حصہ ہے۔

10اگست1990ء کو خلیج کی کشیدہ صورت حال کی وجہ سے عراق نے دنیا بھر میں کویت کے سفارتخانوں کی حیثیت ختم کر دی۔ صدام نے یہ اعلان عراق کی پارلیمنٹ میں کیا۔ صدام حسین جب پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے تو تمام ارکان نے تالیاں بجا کر کویت پر حملے کے اقدام کی تائید کی۔ ارکان نے بلند آواز میں صدام حسین کو خوش آمدید کہتے ہوئے ,,سچائی کی تلوار،، سے تعبیر کیا اور ان کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کی یقین دہانی کرائی۔

اردن کے عوام نے صدام حسین کے حق میں مظاہرہ کیا اور امریکہ کے خلاف نعرے لگائے۔ اس سے پہلے (سات اگست90ء) اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراق کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا دیں۔ قرار داد کے حق میں تیرہ ممالک نے ووٹ دیا جبکہ یمن اور کیوبا نے اپنا ووٹ استعمال نہیں کیا۔

صدام حسین نے جب کویت پر حملہ کیا تو اس سے فوری طور پر عراق کی معیشت

مضبوط ہوگئی۔ان کے پاس تیل کی مقدار دوگنا ہوگئی اوراس کے بعد دنیا کے تیل کے ذخائر کا بیس فیصد عراق کے ہاتھ آ گیا۔صدام حسین جو عرب دنیا کا سردار ہونے کا دعویٰ کرتے رہے تھے کویت پر حملے سے ان کی پوزیشن مستحکم ہوگئی۔اور وہ اس اقدام کے بعد عالمی پریس کا موضوع بن گئے۔

27 اگست 1990ء کو عراق نے کویت کو اپنا انیسواں صوبہ قرار دے دیا اور اسے تین انتظامی اضلاع میں تقسیم کر دیا۔ان تین میں سے ایک ضلع کا نام صدام حسین کے نام پر رکھا گیا۔کویت سٹی کا نام بدل کر ,,قدیمہ،، رکھا گیا۔سلطنت عثمانیہ کے دور میں بھی اس کا شہر کا نام قدیمہ ہی تھا اور یہ جہازوں کی آمدورفت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔پاکستان ، بنگلہ دیش اور بھارت کے مسلمان عوام نے صدام حسین کے مؤقف کی حمایت کی ، جبکہ سرکاری طور پر مخالفت کی گئی۔

فرانس کے وزیر اعظم مائیکل روکارڈ نے عراق کو متنبہ کیا کہ فرانس کے پاس اگر عراقی بلیک میلنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ رہا تو وہ فوجی طاقت استعمال کریں گے۔اس سے پہلے یاسر عرفات نے 28 اگست 1990ء کو کویت میں صدام حسین سے ملاقات کے بعد یہ فارمولا پیش کیا کہ کویت میں چھ ماہ تک عراقی فوجیوں کی جگہ عرب ممالک کے دستے تعینات کیے جائیں اور وہاں انتخابات کرا دیئے جائیں۔

صدر بش نے 12 جنوری 1991ء کو فون پر روس کے صدر گورباچوف سے مذاکرات کرنے کے علاوہ روسی سفیر کے ساتھ ایک ملاقات میں خلیج کی تازہ صورت حال کا جائزہ لیا۔گورباچوف نے صدر بش کے سامنے جنگ بند کرنے کے لئے چند تجاویز پیش کیں۔اس سلسلے میں 9 جنوری کو جنیوا میں امن مذاکرات ہوئے جو ناکام ہو گئے۔جس کے بعد امریکی سینٹ نے صدر بش کو 47 کے مقابلے میں 52 ووٹوں سے عراق کے خلاف طاقت کا استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

ایران عراق کا پہلا ہمسایہ ملک تھا جو تقریباً دس سال تک صدام حسین کی ہٹ دھرمی کا شکار رہا۔اپریل 1991ء میں ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے صدام حسین پر

زور دیا تھا کہ وہ عراق کی بہتری کے لئے اقتدار سے الگ ہو جائیں اور اپنے گناہوں میں اضافہ نہ کریں۔ لیکن صدام حسین نے حکمت عملی سے ایران کا غصہ کم کرنے کے لئے ایران کے جنگی قیدی رہا کر دیئے اور کسی حد تک انہوں نے دبے الفاظ میں ان سے اپنی زیادتیوں کی معافی بھی مانگ لی۔ یہی وجہ تھی کہ ایران نے کئی مرتبہ عراق پر سلامتی کونسل کی طرف سے لگنے والی پابندیوں کی خلاف ورزی کی۔

مسلم عوام کو امریکی جارحیت کی مخالفت کی وجوہات جاننے کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے ماضی قریب کے رویئے پر غور کرنا پڑے گا۔ مسلم دنیا کے اندر اس وقت سب سے زیادہ جو سوال اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ آخر امریکہ اور اس کے حواری کویت ہی کو آزاد کرانے کے لئے کیوں آگے بڑھے۔ انہیں فلسطینی عوام کی محکومی کیوں نظر نہ آئی؟ وہ کشمیری مسلمانوں کو بزور طاقت غلام بنائے رکھنے کی بھارتی پالیسی کے خلاف ایک لفظ تک کہنا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ امیر عرب ریاستوں کے وسائل مجتمع کر کے ایک خوفناک لڑائی لڑنے والی قوتوں نے ہی عربوں کو دھوکا دے کر ان کے ارضی سینے پر اسرائیل کی صیہونی ریاست قائم کرائی تھی۔

اب اگر یہ طاقتیں بظاہر ایک عرب اور مسلمان ریاست کو آزاد کرانے کے لئے میدان عمل میں آئی تھیں تو لازماً ان کے خفیہ عزائم ہونگے۔ وہ تیل کے سرچشموں پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے اور یہاں پر ہمیشہ کے لئے اپنا فوجی تسلط قائم کرنا چاہتی تھیں۔ وہ پسند نہیں کرتیں کہ اس خطے میں عربوں یا مسلمانوں کی کوئی ریاست یا مملکت اس قدر طاقت پکڑ جائے کہ وہ ان کے عالمی مقاصد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔ لہٰذا وہ عراق کی ابھرتی ہوئی علاقائی عرب اور مسلم طاقت سے خوفزدہ ہو کر اسے ابھی سے ختم کر دینا چاہتی تھیں۔

جارج بش سینئر اور ان کے حواریوں کی طرف سے صدام کو دھمکیاں دینے اور بڑھکیں لگانے کے پیچھے یہ مقصد بھی کارفرما تھا کہ جارج بش صدام حسین کو ختم کر کے مشرق وسطیٰ پر اپنا نیا ورلڈ آرڈر مسلط کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ امریکی عوام کے ہیرو کے طور پر سامنے آئیں اور وہ امریکی قوم کے منہ سے یہ نعرہ سننا چاہتے تھے کہ جارج بش ابراہیم

لنکن کے بعد امریکی تاریخ کے سب سے عظیم اور بہادر صدر ہیں چنانچہ اپنی اس خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مشرق وسطیٰ میں ہٹلر کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔انہوں نے امریکی فوجی ہیڈکوارٹر پینٹاگون سے اپنے جرنیلوں کو بلایا ان جرنیلوں نے کہا جناب صدر آپ فاتح بنیں گے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں عراق کو شکست دینے کے لئے صرف دس دن کی لڑائی کی ضرورت ہوگی۔ہمارے صرف ایک ہزار فوجیوں کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا،مصر کویت،سعودی عرب،عراق،لیبیا اور شام ہماری عمر کے لئے آپ کے قدموں میں ہوں گے۔

جارج بش نے اپنے جرنیلوں سے یہ بھی مشورہ کیا کہ حملے کی صورت میں ہمارے خلاف کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے؟ تو اس کے جرنیلوں نے کہا کہ مسلمان ہمارے خلاف نعرے لگائیں گے اور تیسری دنیا کی رائے عامہ ہمارے خلاف ہو جائے گی۔اس رائے عامہ کو اپنے حق میں لے جانے کے لئے ہمیں اسرائیل کو اس راستے پر لگانا چاہئے کہ وہ ہمارے حکم پر غزہ کے مقبوضہ علاقے کو خالی کر دے اور فلسطینیوں کے لئے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کرنے پر راضی ہو جائے۔

چنانچہ جارج بش نے اسرائیل کو غزہ کی پٹی خالی کرنے کے لئے کہا،سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کرایا اور اقوام متحدہ کی پوری مشینری کو عراق کے خلاف استعمال کیا اور سلامتی کونسل میں یہ ڈیڈ لائن مقرر کرادی کہ عراق پندرہ جنوری تک کویت خالی کر دے ورنہ اس کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی۔دوسری طرف جارج بش نے شام کے سربراہ حافظ الاسد کو لالچ دیا کہ عراق کا ایک حصہ شام کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ایک حصہ ترکی کے سپرد کیا جائے گا۔لبنان کا کنٹرول بھی شام کے ہاتھوں میں دے دیا جائے گا۔اسرائیل سے شام کی گولان کی پہاڑیاں بھی چھڑالی جائیں گی۔اس طرح جارج بش نے اٹھائیس ملکوں کی حمایت حاصل کر لی۔

اس وقت پوری دنیا کی رائے عامہ جنگ کے خلاف تھی اور عراق کے خلاف صرف پابندیاں لگانے کے حق میں تھی۔اس دوران صدر بش مذاکرات کرنے کا ڈرامہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے لیکن اندرون خانہ حیلے بہانے سے یہ پالیسی بھی چل رہی تھی

کہ مذاکرات ہونے ہی نہ پائیں۔ سلامتی کونسل کے صدر نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ سلامتی کونسل میں ہونے والی میٹنگ کی ناکامی کی ذمہ دار وہ قوتیں ہیں جو عراق پر بہر طور جنگ مسلط کرنا چاہتی ہیں۔

صدر بش نے 12 جنوری 1991ء کو فون پر روس کے صدر گورباچوف سے مذاکرات کرنے کے علاوہ روسی سفیر کے ساتھ ایک ملاقات میں خلیج کی تازہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ گورباچوف نے صدر بش کے سامنے جنگ بند کرنے کے لئے چند تجاویز پیش کیں۔ اس سلسلے میں 9 جنوری کو جنیوا میں امن مذاکرات ہوئے جو ناکام ہو گئے۔ امن کی آخری کوشش کے طور پر اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری بغداد پہنچے لیکن جنگ روکنے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ جس کے بعد 14 جنوری کو عراقی پارلیمنٹ نے صدام حسین کو امریکہ کے ساتھ مفاہمت نہ کرنے کا مکمل اختیار دے دیا اور کہا کہ صدام حسین جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔ صدر صدام حسین نے حکم دیا کہ عراق کے قومی پرچم پر فوری طور پر ,,اللہ اکبر،، کے الفاظ لکھ دیئے جائیں۔ پارلیمنٹ میں صدام حسین کے لئے پندرہ منٹ تک تالیاں بجائی گئیں۔

بالآخر خلیج میں موت نے صفیں باندھ لیں، امریکی طیارہ بردار جہازوں نے کویت اور عراق میں ایٹمی تنصیبات کو نشانے پر رکھ لیا، اسرائیلی طیارے فضا میں اڑنے لگے اور 17 جنوری 1991ء کو امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے اس منصوبے کو ,,اپریشن ڈیزرٹ اسٹارم،، کا نام دیا۔ اس روز صدر بش نے اس جارحیت کے بارے میں کہا کہ ہمارا پختہ ارادہ ہے کہ ہم صدام کی ایٹمی بم کی صلاحیت تباہ کر دیں۔ ہم اس کے کیمیکل ہتھیاروں کی قوت کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ صدام حسین کی آرٹلری اور ٹینکوں کی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا بھر کے اخبارات اور امریکی جنگی حکمت عملی کے ماہرین اس بات پر متفق تھے کہ امریکہ عراق کی اقتصادی اور فوجی قوت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔

صدام حسین نے فوجوں کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ امریکہ کی بار بار وارننگ کے جواب میں صدام حسین نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین کو امریکی فوجوں کا

قبرستان بنا دیں گے۔انہوں نے جارحانہ انداز میں کہا کہ امریکہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ان جارحانہ بیانات اور حکمت عملی نے صدام حسین کو بہت کچھ سوچنے کا موقع فراہم کیا۔کویت پر قبضہ کے بعد امریکہ کی سی آئی اے سمیت دیگر خفیہ ایجنسیاں چار روز تک غور وفکر کرتی رہیں۔

سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے جارج بش کو ایک بریفنگ میں یہ بھی بتایا کہ صدام حسین عراق کو عرب سپر پاور بنانے کے نہ صرف خواب دیکھ رہے ہیں بلکہ اس پر 1980ء سے عمل کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔جبکہ کویت پر حملے کا جواز سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے یہ پیش کیا کہ عراق عالمی منڈیوں میں تیل کی قیمت بڑھانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔اس اجلاس میں جارج بش کی طرف سے یہ حکمت عملی اپنانے کی منظوری دی گئی کہ ,,عراقی فوج میں انتشار پھیلایا جائے،عراق کی معیشت کو متاثر کیا جائے،اسلحہ کی سپلائی بند کی جائے اور صدام حسین کے اندورن ملک اور بیرون ملک مخالفین کی بھر پور مدد کی جائے۔،،

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے سولہ گھنٹوں میں عراق پر پندرہ سو حملے کئے اس کے جواب میں 18 جنوری کو عراق نے اسرائیل پر حملہ کر کے تل ابیب میں تباہی مچا دی۔امریکہ نے اسرائیل کو جنگ میں کودنے سے منع کر دیا۔امریکہ کو خطرہ تھا کہ (اس کے نزدیک) دہشت گردی کے خلاف ہونے والی یہ جنگ صلیبی جنگ نہ بن جائے اور مسلمان ممالک کی ہمدردیاں صدام حسین کی طرف منتقل ہو جائیں۔

26 جنوری کو روس نے انتباہ کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی سلامتی کونسل کی قراردادوں میں مقرر کردہ حدود کے اندر رہیں۔اس نے بغداد کی تباہی اور پر امن شہریو ں کی زندگی کے لئے بڑھتے ہوئے خطرے پر تشویش کا اظہار کیا۔

15 فروری کو عراق نے کویت سے نکلنے کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیا۔18 فروری کو روس کے صدر گورباچوف نے عراقی وزیر خارجہ کو جنگ کے خاتمہ کے لئے ایک امن منصوبہ پیش کیا جس میں بحران کو سیاسی ذرائع سے حل کرنے کے لئے بعض تجاویز دیں،روس نے یہ دیکھ کر کہ عراق کی ہمت جواب دے رہی ہے اور یہ کہ امریکہ

زمینی حملے کر کے عراقی فوجیوں کا قتل عام کرنے والا ہے تو اس نے امن منصوبہ پیش کر کے اسے مزید تباہی سے بچانے کی کوشش کی ،لیکن ان تجاویز کو بش نے مسترد کر دیا۔

اب یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ امریکہ کویت سے عراقی فوجیں نکالنے کے علاوہ صدر صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ بھی چاہتا ہے۔درحقیقت امریکہ اس علاقے کا چودھری بن کر مشرق وسطیٰ میں من مانی کاروائیاں کرنا چاہتا تھا۔روس اور اردن کو امریکہ کے ان عزائم کا علم تھا ،یہ دونوں ممالک نہیں چاہتے تھے کہ امریکہ کا خلیج کے علاقے میں غلبہ رہے۔اس لئے یہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ایران نے بھی ماسکو کا رخ کیا ،عراق نے بھی اپنے وزیر خارجہ کو ماسکو بھیجا۔اس طرح ماسکو سفارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

روس کی خواہش اور کوشش تھی کہ اس کا دیرینہ ساتھی عراق جس کے ساتھ اس نے **1972**ء میں دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا تھا امریکہ کی مزید زیادتیوں سے بچ جائے۔لیکن امریکہ روس کی اس خواہش کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا ،اس کا کہنا تھا کہ اس نے عراق کو پوری طرح شکنجے میں جکڑ لیا ہوا ہے ،صدر بش تو کھلم کھلا کہہ رہے تھے کہ وہ صدام حسین کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ اس وقت امریکہ کے لئے اصل مسئلہ کویت سے عراقی افواج کا انخلاء نہیں بلکہ صدام حسین کو اقتدار سے ہٹا کر عراق میں اپنی پسند کی حکومت قائم کرنا تھا۔لہٰذا اس بات کا پورا امکان موجود تھا کہ امریکہ امن منصوبہ قبول نہیں کرے گا۔اس کے بعد روس نے عراق کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔چنانچہ اگلے روز لاکھوں اتحادی فوجی عراق اور کویت پر ٹوٹ پڑے چنانچہ چار روز کی خون ریز لڑائی کے بعد صدام حسین نے کویت خالی کرنے کا حکم دے دیا۔اس روز انہوں نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ،،عراقیو!فتح کی خوشی مناؤ،تم نے تیس ملکوں کے اتحاد کا مقابلہ کیا ،پوری دنیا کے مقابلے پر ڈٹے رہے ہماری عظیم جدوجہد اور جہاد کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔،،

امریکی صدر جارج بش نے کویت پر عراقی قبضے کے بعد ایک اہم سوال یہ اٹھایا کہ اگر عراق کی طرف سے جوہری سامان تلف نہ کیا گیا تو اس کے ایسے ٹھکانوں کو نشانہ

بنایا جائے گا جہاں ایٹمی اسلحہ تیار ہو رہا ہے۔ اس جنگ میں امریکہ کو سلامتی کونسل کے مستقل اراکین اور دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں سے اس کے علاوہ دو یعنی برطانیہ اور فرانس کی عملی حمایت حاصل تھی ۔اور وہ اسکے ساتھ براہ راست لڑائی میں شریک تھیں۔ چوتھا ملک سپر طاقت نمبر دو یعنی روس اگرچہ اس معرکہ خاک وخون میں ملوث نہیں لیکن سلامتی کونسل کی جس قرارداد نمبر 678 کے تحت اس قتال کو شروع کیا گیا تھا اسے اس کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ پانچواں ملک عوامی جمہوریہ چین جو نہ تو اس جنگ میں براہ راست حصہ لے رہا تھا اور نہ ہی اس نے مذکورہ بالا قرارداد کے حق میں ووٹ دیا اگرچہ مخالفت بھی نہیں کی۔

عالم عرب اور تیسری دنیا کے جو ممالک امریکہ کا ساتھ دے رہے تھے ان میں سعودی عرب مصر شام اور ترکی نمایاں تھے۔ پاکستانی فوج اگرچہ براہ راست امریکی افواج کے پہلو بہ پہلو نہیں لڑی لیکن اس کے دستے تنازعے کے آغاز پر ہی حکومت سعودی عرب کی درخواست پر وہاں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کی سعودی عرب میں موجودگی سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا جھکاؤ عراق مخالف قوتوں کی جانب تھا۔ اس کے برعکس عراق یہ جنگ تن تنہا لڑ رہا تھا۔ کسی ملک کی فوج نے اس کی سپاہ کے ساتھ مل کر اتحادی افواج کا مقابلہ نہیں کیا تھا۔

خلیجی جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ٹنوں کے حساب سے عراق پر ایٹمی بارود برسایا تھا جس کے نتیجے میں امریکہ اور اس کے دفاعی ادارے پینٹا گون کا خیال تھا کہ عراق کی ایٹمی قوت کو تباہ کر دیا گیا ہے لیکن عراق کے ایٹمی سائنس دانوں نے جب یہ انکشاف کیا کہ ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا تو سب سے زیادہ امریکہ ہی کو ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی جنگی حکمت عملی اس انکشاف کے بعد ناکام ہو گئی تھی ۔ امریکہ کے جنگی جرائم کے بارے میں تحقیق کرنے والے عالمی ٹریبونل کے کوارڈینیٹر مسٹر ڈورس نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ عراق پر امریکی حملہ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اس صدی کا سب سے بڑا جرم ہے۔

28 فروری کو جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔عراق کا امریکہ کے ساتھ باقاعدہ امن معاہدہ نہیں ہوا بلکہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 686 کے مطابق عراق سے سلوک کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

(الف) عراق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تمام قراردادوں پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

(ب) عراق جنگ کی ذمہ داری قبول کرتا ہے،کویت کے نقصانات اوراور دیگر قریبی عرب ریاستوں کے نقصانات کا ذمہ دار ہے۔

(ج) عراق جلد از جلد کویت کو اس کے نقصانات کا معاوضہ دینے کا پابند ہے۔

(د) جنیوا کنونشن کے تحت عراق کو تمام جنگی قیدی واپس کرنے ہوں گے۔

(ر) عراق کو کویت پر قبضے کے دوران تعمیر کی گئی دفاعی تنصیبات اور بارودی سرنگوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنی ہوں گی۔

بظاہر یہ تمام شرائط ناگوار یا ناقابل عمل نہیں تھیں لیکن اس کی پہلی شرط کہ عراق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تمام قراردادوں پر عمل کرنے کا پابند ہے،ایک ایسا مبہم فیصلہ تھا جسے استعمال کرتے ہوئے امریکہ اور اس کے حواری عراق پر سخت سے سخت پابندیاں عائد کرنے پر تلے رہے۔چنانچہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کی آڑ میں عرصہ دراز تک تیل برائے خوراک کی پالیسی کے تحت عراق کا تیل اونے پونے داموں عالمی منڈی میں فروخت ہوتا رہا۔اس سلسلے میں اجلاس ویانا میں ہوتے رہے لیکن ارباب اختیار اور اعلیٰ عہدے داروں کی ڈوریں واشنگٹن سے ہلائی جاتی تھیں۔اقوام متحدہ کی جانب سے ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام اور معائنے کے نام پر امریکی اور اسرائیلی انٹیلی جنس کے افسران عراق کی دفاعی تنصیبات کا کئی مرتبہ پوسٹ مارٹم کر چکے تھے۔اس سلسلے میں عالمی ادارے کے افسران کی رپورٹوں کو بھی خاطر میں نہ لایا گیا۔

ڈیٹن امن معاہدہ

یوگوسلاویہ ٹوٹا تو بوسنیا نے یوگوسلاویہ سے علیحدگی اور آزادی کا اعلان کیا جسے اقوام متحدہ اور اقوام عالم نے تسلیم کرلیا۔ بلکہ 22 مئی 1992ء کو ایک قرارداد کے تحت آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر اقوام متحدہ نے اسے سند عطا کی۔ اس کے باوجود سرب نوجوانوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف جارحیت جاری رکھی اور مسلمان اہل بوسنیا کو اجتماعی قبروں میں دفن کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کے پیوند خاک ہو جانے کے بعد بوسنیا کے بحران کو ختم کرنے کے لئے عالمی برادری نے جولائی 1993ء میں ایک سمجھوتہ کرادیا جس میں کہا گیا تھا کہ:

(الف) بوسنیا کی مسلم، سرب اور کروٹ ریاستوں کو ایک ڈھیلی ڈھالی وحدت کی شکل دی جائے گی۔

(ب) سمجھوتے کے تحت مسلمانوں کو صرف 29 فیصد علاقہ ملے گا حالانکہ اس کی آبادی کا تناسب 45 فیصد سے بھی زائد تھا۔ باقی علاقہ سربوں اور کروٹوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جو کہ انہیں ان کی دہشت گردی اور انسانیت سوز سنگین جرائم پر انعام دینے کے مترادف تھا۔

بوسنیا میں تین سال کی جدوجہد میں مسلمانوں نے اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ بعض مسلمان ممالک کی سرد مہری کے باوجود انہوں نے صبر استقامت کا مظاہرہ کیا۔ 14 دسمبر 1995ء کو بوسنیا کے صدر عالی جاہ عزت بیگوچ، سربیا کے صدر سیوسیوک اور کروشیا کے صدر فرانجو کے درمیان جو معاہدہ امن طے پایا اس کے تحت سربوں کو وہ بہت سے قصبے واپس مل جائیں گے جو ان سے جنگ کے دوران چھین لئے گئے تھے۔ سرائیوو کا شہر مکمل طور پر مسلمانوں مسلمانوں اور کروٹس کی فیڈریشن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جنگی جرائم میں ملوث افراد کو سرکاری عہدے نہیں دیئے جائیں گے۔ امن معاہدے پر عمل

...ر آمد کرانے کے لئے نیٹو کے تحت بوسنیا میں 60000 فوجی متعین کئے جائیں گے جن میں امریکہ کے 25000 فوجی بھی شامل ہوں گے۔ کلنٹن انتظامیہ بوسنیا کے مسلمانوں کو ہتھیار اور فوجی تربیت مہیا کرے گی اور اقوام متحدہ بلغراد پر سے اقتصادی پابندیاں ختم کرنے پر غور کرے گی۔

معاہدے پر دستخط ہونے کے ساتھ ہی بظاہر آگ اگلتی ہوئی بندوقیں خاموش رہ گئیں لیکن اس کے ساتھ ہی سرد جنگ شروع ہوگئی اس سرد لڑائی نے بڑی اور چھوٹی طاقتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ از سرنو اپنی سیاسی اور فوجی حکمت عملیوں کا تعین کریں۔ مثلاً بوسنیا میں جو قیام امن کا منصوبہ تیار کیا گیا اس میں پاکستان ترکی اور اردن کو شامل نہیں کیا گیا۔ بوسنیا کے بعض مسلمان گروپس کو بھی اس سے اختلاف تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ نیٹو کے رکن ممالک نے بوسنیا پر اپنا حل مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور عالم اسلام کے حلقوں میں یہ بات محسوس کی جا رہی تھی کہ پاکستان، ترکی اور اردن کو بوسنیا کے اس امن منصوبے سے الگ رکھ کر بوسنیا کی مسلمان ریاست کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں جب کہ وہاں صرف نیٹو کی افواج متعین ہوں گی اور پاکستان، ترکی اور اردن کے فوجی دستے وہاں نہیں ہوں گے۔

یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کے بعد جب مختلف ریاستیں وجود میں آئیں اور ان کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو سرب درندوں نے اپنی وسیع تر سلطنت کا خواب پورا کرنے کے لئے بوسنیائی عوام پر مظالم کی انتہا کر دی۔ خصوصاً خواتین کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اب بھی ساڑھے پانچ ہزار افراد لاپتہ تھے۔ امریکی اخبارات نے ایک سرب فوجی درندے کا انٹرویو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ جس نے اڑھائی سو بوسنیائی مسلمانوں کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ امریکہ کے پاس سرب درندگی کے ثبوت سٹلائٹ سے حاصل کی گئی تصویروں کی صورت میں بھی موجود تھے۔ ان تمام زیادتیوں کے باوجود بڑی طاقتوں نے ایک ابتداء میں مصالحانہ کاوش میں سنجیدگی اختیار نہ کی تو اس کا ایک سبب یہ تھا کہ کہیں بوسنیائی مسلمان یورپ میں مستحکم نہ ہو جائیں۔

مغربی طاقتوں کی کوشش تھی کہ بوسنیائی مسلمانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر

اس چھوٹی سی ریاست کے مزید ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ جب بوسنیائی افواج نے سر
سے اپنے چھینے ہوئے علاقے واپس لینا شروع کر دیئے تو یورپی ممالک اور امریکہ نے
اپنی مصالحت کی کوششوں کو تیز کر دیا۔ چنانچہ بوسنیا پر سے ہتھیاروں سے پابندی اٹھالی گئی
اور اب ڈیٹن معاہدے کے تحت بوسنیا میں مکمل جنگ بندی عمل میں آ گئی۔ نیٹو کے اشتراک
سے یہاں 60000 کثیر ملکی فوج تعینات کی گئی حوالوں سے افواج کی تعیناتی کا مسئلہ
بھی شکوک و شبہات کا موضوع بنا رہا، کیوں کہ جتنی بڑی تعداد میں افواج امریکہ،
برطانیہ، جرمنی اور روس سے تعینات کی جا رہی تھیں کسی بھی مسلمان ملک سے اتنی بڑی
تعداد میں فوجی نہیں لئے جا رہے تھے۔

دوسری طرف اسلامی کانفرنس نے بوسنیا کی فوجی امداد کا اعلان کیا اور تمام مسلمان
ممالک سے اپیل کی کہ وہ بوسنیائی مسلمانوں کی دل کھول کر امداد کریں۔ پاکستان بھی نہیں
چاہتا کہ بوسنیا کے مسلمان مغربی ممالک کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جائیں، اس ضمن میں
پاکستان نے ہر اس کوشش کی حمایت کی جس کا مقصد یورپ کے قلب میں مسلمان ریاست
کے وجود کو مستحکم کرنا تھا۔

بوسنیا کے امن معاہدے کے حوالے سے جو موضوعات زیر بحث تھے ان میں سب
سے نمایاں پہلو امریکی افواج کی بوسنیا روانگی تھا اس مسئلے پر سب سے پہلے تو کانگریس کے
184 ارکان نے صدر کلنٹن کے منصوبے کی مخالفت کر دی تاہم صدر کو امریکی فوج دنیا کے
کسی علاقے میں بھیجنے کے لئے کانگریس کی منظوری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ کانگریس
کے ارکان کی مخالفت کے باوجود امریکی فوج کے دستے بوسنیا پہنچنا شروع ہو گئے جس پر تبصرہ
کرتے ہوئے امریکی فوجی مبصر کرنل ڈیوہیک ورتھ نے ہفت روزہ ''نیوز ویک'' میں اپنے
خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''کانگریس کو یہ آئیڈیا پسند نہیں اور نہ ہی اسے امریکی عوام پسند کرتے
> ہیں لیکن لگتا ہے کہ اس بار کرسمس کا تہوار ہمارے فوجی اس جہنم میں
> گزاریں گے ہمارے بیس ہزار فوجی اپنا وقت شمالی بوسنیا کے دور
> افتادہ قصبے تزلہ میں بسر کریں گے جو مجھے پنسلوانیہ کے ایک قصبے کی یاد

دلاتا ہے جہاں کوئلے کی کانیں ہیں۔ یہاں ہر وقت کوئلے سے اٹے ہوئے سیاہ بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ ہر شے پر کوئلے کی سیاہی چڑھی ہے حتیٰ کہ سورج کی روشنی بھی چھپ جاتی ہے۔ گلیاں خاک اور کیچڑ میں اٹی ہوئی ہیں، تزلہ کے تینوں سینما گھر بند پڑے ہیں جونہی آپ شہر کی طرف نکلتے ہیں جہاں زیادہ تر لڑائی لڑی گئی وہاں آپ کو گولیوں سے چھلنی دیواریں نظر آتی ہیں یا پھر شکستہ مکانوں کے ڈھانچے ہیں۔ امریکی عوام حیران ہیں کہ آخر کار وہ کونسی ایسی بات تھی جس پر صدر کلنٹن نے امریکی فوجیوں کو بوسنیا بھیجنے کا فیصلہ کیا حالانکہ بوسنیا امریکی خون کے ایک قطرے کے برابر بھی نہیں ہے۔ امریکی صدر کلنٹن ٹی وی پر دھواں دھار تقریر کے باوجود امریکہ میں عوام کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ کانگریس کو امریکی صدر کے اس اقدام کی بھرپور مخالفت کرنی چاہئے۔''

تزلہ میں امریکی فوجیوں کی آمد بھی کچھ کم ڈرامائی نہیں تھی، کرنل ہیک ورتھ کے الفاظ میں:

''تزلہ کے ملٹری ائیر پورٹ کے فرنٹ گیٹ پر ہمارا چھوٹا سا گروپ نیم تاریکی میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا ہم یوں منتظر تھے جیسے کچھ بھی واقع ہو سکتا ہو، آخر کار اقوام متحدہ کی ایک بکتر بند گاڑی اندھیرے میں نمودار ہوئی کیمرے کی روشنیوں میں تین سویڈش فوجی ہتھیار سنبھالے یوں نکلے جیسے حملہ کرنے والے ہوں۔ یہ منظر ریمبو کی کسی فلم سے ملتا جلتا تھا اور لگتا تھا ابھی سٹالون کسی خوفناک ہتھیار کے ساتھ نمودار ہوگا لیکن اس کی بجائے امریکی فضائیہ اور آرمی کے دو کرنل اپنے دوسرے فوجیوں کے ساتھ باہر آئے، ان فوجی افسروں کے بقول ان کا مشن ہوائی اڈے کا معائنہ کر کے اسے اس قابل بنانا تھا کہ یہاں 12 مہینوں میں سی 130 اور دوسرے ہزاروں جہاز 20000 فوجیوں کے ساتھ لینڈ کر سکیں۔''

یوں تو پورے یورپ میں سردی شدت سے پڑتی ہے لیکن بوسنیا کے پہاڑی سلسلوں سے چلنے والی برف آلود ہوائیں پورے وجود کو منجمد کر دیتی ہیں یہی وجہ تھی کہ بوسنیا میں سردی کو امریکی افواج کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔ سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں لباس اور ہتھیاروں کی جس قسم کی جذیات سے مسلح کیا گیا ان کی تعداد 18 سے زیادہ بنتی تھی۔ بوسنیا میں فریقین نے لڑائی کے دوران 60 لاکھ سے زائد بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور ان میں سے زیادہ تر ٹینک شکن سرنگیں تھیں جن کا سراغ لگانا بہت مشکل تھا۔ امریکی افواج نے ان کا سراغ لگانے کے لئے خصوصی طور پر تربیت یافتہ کتے استعمال کئے۔ امریکی فوج کے مبصرین کے مطابق ٹینک شکن سرنگوں کے علاوہ امریکہ کو ایک ہزار سے زیادہ مسلمان مجاہدین کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو یہاں سرگرم عمل تھے۔ اس کے علاوہ مقامی ملیشیا بھی تھی جو آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی اور جنرل رانکو ملاڈک بھی یہاں موجود تھا جو مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے کی وجہ سے ایک درندہ صفت کمانڈر مشہور تھا۔ وہ سربوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا جبکہ مختلف حلقوں نے اسے جنگی مجرم قرار دیا تھا۔ بوسنیا میں بیس لاکھ پناہ گزین بھی موجود تھے جو اپنے گھروں میں دوبارہ آنے کے لئے بے چین تھے ان حالات میں مبصرین نے بوسنیا کو امریکہ کے لئے ایک نیا ویت نام قرار دیا۔
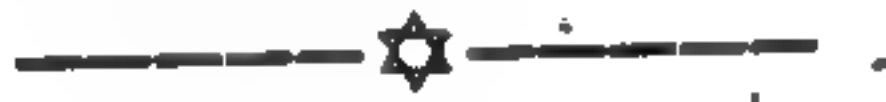
بون امن کانفرنس (امریکہ اور افغانستان)

اسامہ بن لادن کا نام امریکیوں اور اسرائیلیوں کے لئے خوف اور دہشت کی علامت ہے جبکہ مسلم دنیا میں یہی نام ہیرو ازم جہاد اور صیہونی پنجہ سے نجات کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مغرب اسامہ کو شیطان مانتا ہے جبکہ مسلمان اسے مجاہد کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو اسلام کی سربلندی کے لئے دولت کی فراوانی کے باوجود اپنے لئے دنیاوی آسائشیں حرام کر چکا ہے۔ اسامہ کے والد کا نام شیخ محمد بن عواد بن لادن ہے کعبۃ اللہ اور روضہ رسول کی مقدس مساجد کی تعمیر میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لندن کے ایک جریدے ''القدس العربی'' کے چیف ایڈیٹر عبدالباری عطوان کا اسامہ کے متعلق کہنا ہے:

> ''میں نے اسامہ کے ساتھ ایک پورا دن بسر کیا۔ میں نے اسے نہایت شریف النفس پایا، وہ جھوٹ نہیں بولتا اور لگی لپٹی رکھے بغیر انتہائی تیقن سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی آواز بے حد پرسکون اور پر اخلاق ہے، وہ اخروی زندگی کی فلاح کے لئے سرگرم عمل ہے اور دنیاوی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اگر آپ اس سے ملیں گے تو آپ اس کی طبیعت میں ایک پرگداز اداسی محسوس کریں گے۔ اس اداسی کی وجہ یہ ہے کہ وہ جہاد افغانستان کے دوران رتبہ شہادت پر فائز نہ ہو سکا۔ میں تو اس کے اخلاق اور عادات و خصائل کا قائل ہو گیا ہوں''

اسامہ بن لادن ایسی افسانوی شخصیت اس وقت عالمی پریس کا موضوع بن گئی جب **1979**ء میں روس نے افغانستان پر حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی۔ اسامہ عرب ممالک سے اپنے ہزاروں مداحوں اور پیروکاروں سمیت جنگ میں شریک ہو گئے۔ **1985**ء کی مدت تک انہوں نے اس جنگ میں جنگجوئی کے وہ کارنامے انجام دیئے کہ وہ افغانستان اور

عرب دنیا کے لئے ایک دیو مالائی کردار کی حیثیت اختیار کر گئے۔ 1990ء میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تو اسامہ نے سعودی وزیر دفاع کو پیش کش کی تھی کہ وہ عراقیوں کو کویت سے نکال سکتے ہیں بشرطیکہ امریکہ سے مدد نہ لی جائے۔ یہ سن کر سعودی شہزادے نے جب اسامہ بن لادن سے پوچھا کہ وہ عراقی ٹینکوں، ایئر کرافٹ، کیمیکل بموں اور خطرناک ہتھیاروں کا جواب کیسے دے پائیں گے؟ انہوں نے مختصر سا جواب دیا:

,,قوت ایمانی سے انہیں شکست دیں گے،، لیکن سعودی حکومت نے ان کی پیش کش قبول نہیں کی۔ جب روس افغانستان سے چلا گیا تو اپنے خون سے جہاد کی آبیاری کرنے والی مجاہد تنظیموں کے آپس میں اختلافات شروع ہو گئے اور انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ چنانچہ 1991ء میں اسامہ سوڈان چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنا تعارف ملت اسلامیہ کے ایک عظیم خادم کی حیثیت سے کرایا وہاں بھی لوگ انہیں اپنے قومی رہنماؤں سے زیادہ چاہنے لگے۔ لیکن امریکہ کو ان کی یہ ہر دلعزیزی ایک آنکھ نہ بھائی اور امریکہ نے سوڈانی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اسامہ کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ 1996ء میں سوڈان کے صدر جنرل عمر البشیر پر زبردست دباؤ تھا۔ جس کے بعد سوڈان کے صدر نے اسامہ کو بتایا کہ آپ کا سوڈان میں قیام ہماری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسامہ اپنی نگرانی پر مامور امریکی خفیہ ایجنسیوں کے اہلکاروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے افغانستان چلے آئے۔

طالبان نے جب 12 ستمبر 1996ء کو جلال آباد پر قبضہ کیا تو اسامہ بن لادن وہیں تھے۔ 27 ستمبر کو طالبان نے ربانی اور دوستم سے کابل بھی چھین لیا اور دو سال کے مختصر سے عرصہ میں طالبان نے افغانستان کے تقریباً نوے فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ماہرین کا خیال تھا کہ طالبان کو جو حیرت انگیز حد تک کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اخلاقی اعتبار سے دوسرے افغان وار لارڈز سے کہیں بہتر تھے۔ ان کا لوٹ مار کا بھی کوئی ٹریک ریکارڈ نہیں تھا۔ طالبان جب افغانستان میں برسر اقتدار آئے تو امریکہ اور مغرب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ طالبان نے افغانستان سے وہ لوٹ مار اور افراتفری ختم کر دی جو افغان وار لارڈز نے

شروع کر رکھی تھی۔ امریکہ کی جنوبی ایشیا کے امور کی وزیر رابن رافیل نے افغانستان کا دورہ کیا تھا اور کابل میں طالبان قیادت سے مذاکرات کیے تھے۔

مغربی حکومتوں کو طالبان حکومت پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن بعد میں مغربی پریس اور بعض لیڈروں نے اس بات پر اعتراض اٹھایا کہ طالبان نے افغانستان میں شریعت کے نام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں شروع کر دی ہیں۔ عورتوں کی تعلیم پر پابندی، ٹیلی ویژن پر موسیقی کی نشریات پر پابندی اور اس طرح کے اقدامات سے مغربی دنیا میں شور مچ گیا اور مغربی میڈیا اور رائے عامہ کے لیڈر طالبان لیڈر کے مخالف ہو گئے۔ طالبان کے مخالف ممالک جن میں امریکہ، روس، ایران اور دوسرے پڑوسی ملک شامل تھے شمالی اتحاد کی پشت پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے شمالی اتحاد کو اسلحہ اور فوجی امداد دینا شروع کر دی۔

ابتداء میں طالبان اور اسامہ کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا لیکن بہت جلد ان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اسامہ بن لادن ہمیشہ میڈیا پر بات چیت کے خواہش مند رہے تاکہ وہ اپنا پیغام اور سیاسی ایجنڈا پیش کر سکیں۔ کیونکہ ان پر ساری دنیا میں دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث ہونے کے الزامات لگائے جاتے تھے۔ انہوں نے افغانستان سے اپنا پہلا انٹرویو لندن کے ایک اخبار ,,دی انڈیپینڈنٹ،، کے رابرٹ فسک کو دیا جس میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ امریکی، برطانوی اور فرانسیسی فوجیں سعودی عرب سے نکل جائیں۔ اسامہ بن لادن نے دسمبر 1998ء کے بعد کسی ایجنسی کو کوئی انٹرویو نہیں دیا۔ کیونکہ طالبان نے ان کے بولنے پر پابندی لگا رکھی تھی، وہ اسامہ کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے تھے اور اسامہ کا باقی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

ملا عمر کی سرپرستی میں شدت پسندوں کو طالبان میں ہمیشہ برتری حاصل رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی پابندیوں اور امریکہ اور مغرب کی جانب سے طالبان حکومت کو تسلیم نہ کیے جانے کی وجہ سے وہ بے لچک ہو گئے تھے۔ لہٰذا ان کا اقوام متحدہ کے امن مشن کا بائیکاٹ، اقوام متحدہ کی تنظیموں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار اور امدادی کارکنوں پر چیک رکھنے کی پالیسی میں تبدیلی کی کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ جرمنی امریکہ

اور آسٹریلیا کے کارکنوں کو پکڑ کر ان پر عیسائیت کا پرچار کرنے کے الزام میں مقدمے کر طالبان نے دنیا کو ایک مضبوط پیغام بھیجا تھا کہ وہ اسلام مخالف سرگرمیوں کو ہر برداشت نہیں کریں گے۔

اسامہ کی اولین ترجیح یہ رہی ہے کہ سعودی عرب سے امریکی ، برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کو نکالا جائے۔ اسامہ بن لادن یہ استدلال بھی پیش کرتے ہیں کہ کافروں کو دو پاکیزہ ترین جگہوں یعنی مکہ اور مدینہ میں داخلے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جہاں ان فوجی دستوں کی آسان رسائی موجود ہے۔ اس طرح امریکہ نے انہیں جس قدر زیادہ ہدف بنایا وہ مسلمانوں کی نظروں میں اتنے ہی زیادہ ہیرو بنتے چلے گئے۔

11 ستمبر 2001ء کی صبح امریکہ میں چار جہازوں کے اغوا اور امریکہ کی تباہی کی خبر نے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے فروری 1993ء میں امریکی سرمایہ کاریت کی علامت ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہونے والے دھماکے نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ انتہا پسندوں نے امریکہ کے دل پر حملہ کیا تھا۔ ایسے واقعات امریکہ جیسی سپر طاقت کے لئے صرف انسانی اور مادی تباہی نہیں بلکہ یہ اس کی سپر طاقتی کی بے وقعتی اور انتہائی بے بسی کو ظاہر کر گئے۔ ان واقعات کے بعد یہودی لابی کے زیر اثر امریکی میڈیا اسامہ کے بارے میں مختلف زاویوں سے تنقید کرتا رہا۔ افغان سربراہ ملا عمر نے امریکہ پر حملے میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کی پر زور تردید کی اور کہا کہ طالبان ہر ملک کے لئے امن چاہتے ہیں۔

صدر بش نے فوری رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ,,ہم اس حملے کا جواب دیں گے اور حملہ آوروں کا تعاقب کریں گے،،۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ امریکہ یہودی لابی اور انتہا پسند حلقوں کے زیر اثر افغانستان اور فلسطین میں کسی قسم کی اچانک سٹرائیک کی طرف قدم بڑھا دے۔ امریکی حکام نے الزام عائد کیا کہ اس واقعہ میں اسامہ بن لادن کا گروپ ملوث ہے جبکہ اسامہ کے گروپ نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود امریکی حکام اپنے اس موقف پر قائم رہے۔

دنیا میں ابھی تفصیلی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ بھارت نے اسلامی تنظیموں، مجاہدین، اسامہ بن لادن اور پاکستان پر الزام تراشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسا

محسوس ہوتا تھا کہ امریکیوں سے پہلے ہی بھارت یہ فیصلہ دے چکا تھا کہ امریکہ پر ہونے والے منفرد اور حیران کن خودکش حملوں میں اسامہ بن لادن ملوث ہیں۔ امریکہ کے صدر بش نے دہشت گردوں کو پکڑنے کے لئے بیس ارب ڈالر کے فنڈز مختص کر دیئے۔ جبکہ ناٹو اور روس کی حمایت بھی حاصل کر لی گئی۔ روسی حمایت حاصل کرنے کا مشورہ انہیں سابق اسرائیلی وزیر اعظم نے دیا تھا۔ روس کو ساتھ ملانے کا واحد مقصد افغانستان کے خلاف کاروائی کرنا تھا۔ صدر بش جونیئر نے دہشت گردی کی حمایت کرنے والے ممالک کو بھی معاف نہ کرنے کا اعلان کیا۔

ایک امریکی ادارے نے انٹرنیٹ، فیکس اور فون کے ذریعے بھیجے گئے تمام پیغامات کو انٹرسپٹ کیا اور انہیں پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ گذشتہ چند روز میں اس طرح کا کوئی پیغام بھیجا ہی نہیں گیا۔ اسامہ بن لادن کو اس وقت اس اعتبار سے اکیلا قرار دیا جا سکتا تھا کہ ان کا رابطہ بیرونی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ موبائل ٹیلیفون اور ایسے دوسرے آلات کی مدد سے سابق صدر کلنٹن کے دور میں ان کے ٹھکانوں کا پتہ چلا کر میزائلوں سے حملے کئے گئے تھے۔ جس پر وہ ٹیلیفون، فیکس یا انٹرنیٹ کے ذریعے کوئی رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ بیرون ملک بیٹھ کر ان کے لئے اتنی منصوبہ بندی سے کام کرنا مشکل تھا۔ جس کا اعتراف خود غیر ملکی ماہرین اور سیاسی اکابرین نے کیا تھا۔ انہوں نے اس عمل کو نہایت منظم دہشت گردی قرار دیا۔

اسامہ بن لادن کے خلاف ٹھوس شواہد نہ ہونے کے باوجود امریکی انتظامیہ نے انتقامی کاروائی کے لئے تیاری شروع کر دی۔ اس کے علاوہ سعودی عرب نے امریکی افواج کو اپنی سلطنت میں آنے کی اجازت دی تو اسامہ نے سرعام اپنی حکومت کی مذمت کی جس کے بعد سعودی عرب نے اسامہ کو غیر قانونی باشندہ قرار دے کر ان کی شہریت ختم کر دی اور ساتھ ہی ان کے سر کی قیمت بھی مقرر کر دی۔

15 ستمبر 2001ء کو امریکی صدر بش نے امریکی فوج کو حالت جنگ میں قرار دیتے ہوئے اپنی فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا انہوں نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جنہوں نے دہشت گردی کی ہے ہم انہیں تلاش کر لیں گے اور انہیں انصاف کے لئے

سامنے لائیں گے۔ہم صرف دہشت گردوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ انہیں کھلانے والوں اور پناہ دینے والوں کے خلاف بھی کاروائی کریں گے۔دہشت گردوں نے امریکی قوم کی طاقت کو للکارا ہے ۔امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے سی این این پر گفتگو کرتے ہوئے پاکستان کی عوام اور حکومت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ امریکہ نے جو کچھ پاکستان سے مانگا تھا وہ سب کا سب منظور کرلیا گیا ہے۔کولن پاول نے مزید کہا کہ امریکہ دہشت گردوں کے خلاف اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اور نیٹو،اقوام متحدہ،یورپی یونین جیسے عالمی اتحادوں کے ساتھ مل کر اپریشن کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔

امریکی انتظامیہ ایک طرف عالمی اتحاد قائم کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ سفارتی اور فوجی سٹریٹجی کو روس اور پاکستان پر مرکوز رکھے ہوئے تھی،جس کا مقصد افغانستان کے شمال اور جنوب کی جانب نقل وحرکت کا گھیراؤ کرنا تھا۔امریکہ کے نائب وزیر دفاع ولفووٹز نے ممکنہ کاروائی کے بارے میں ایک بریفنگ میں بتایا کہ ایسے لوگوں پر قابو پانا،سپورٹ سسٹم کو ہٹانا معمولی کام نہیں ہے،اس لیے اس کے خلاف منظم اور مسلسل مہم چلائی جائے گی۔اس میں زیادہ تر اہم بات اسامہ بن لادن کی ایمپائر پر حملہ میں ربط پیدا کرنا اور طالبان سے افغانستان کو آزاد کرانا ہے۔

امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے کہا کہ طالبان کے پاس اب صرف دو راستے بچے ہیں،وہ اسامہ کو افغانستان سے نکال دیں یا پھر سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ہمیں طالبان کی طرف سے ہاں یا ناں میں جواب چاہیے۔امریکہ دہشت گردوں کے خلاف صرف وارننگ نہیں دے رہا بلکہ واضح اور دوٹوک اقدامات کئے جائیں گے۔امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ نے کہا کہ پچاس ہزار سے زائد ریزرو فوجی جنگ کے لئے مکمل طور پر تیار ہیں اور امریکی صدر کے اشارے کے منتظر ہیں،جیسے ہی امریکی صدر کی طرف سے انہیں کوئی ہدایت ملی وہ کاروائی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔انہوں نے کہا کہ دہشت گرد میزائلوں یا فضائی بمباری سے قابو نہیں آئیں گے۔انہوں نے اعتراف کیا کہ اس میں امریکی جانیں بھی جائیں گی لیکن ہم اپنے طرز زندگی کی بقاء کے لئے جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔

امریکہ نے افغانستان پر حملے کے لئے بھرپور جنگ تیاریاں شروع کر

دیں۔ پینٹاگون نے ایک اور طیارہ بردار بحری جہاز روزویلٹ کو بھی خلیج فارس میں پہنچنے کا حکم دے دیا، مزید 300 ایف 16 اور ایف 15 امریکی لڑاکا طیارے اور 35000 ریزرو فوجی سعودی عرب، بحرین اور دوسری خلیجی ریاستوں اور خلیج فارس میں موجود اپنے اڈوں اور بحری بیڑوں کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ گائیڈڈ میزائلوں سے لیس امریکی بحری جہاز بھی جاپان سے خلیج فارس کی طرف روانہ ہو گیا۔ کارل ولسن اور انٹرپرائیز نامی 2 امریکی بحری بیڑے پہلے ہی خلیج اور بحیرہ عرب میں موجود تھے۔ سعودی عرب، بحرین اور بحیرہ عرب اور خلیج فارس میں موجود امریکی فوجوں کو بھی ہائی الرٹ کا حکم دے دیا گیا۔

امریکی وزیر دفاع نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ امریکہ نے شمالی اتحاد سے بھی رابطہ کر لیا ہے تاکہ طالبان پر حملہ کے لئے ان کی مدد بھی حاصل کی جائے۔ بھارت ایک عرصے سے شمالی اتحاد کی پرورش میں مصروف تھا۔ اس کے عسکری مشیر ازبکستان میں بھی موجود تھے اور خود افغانستان میں بھی شمالی اتحاد کی فوجوں کے ساتھ شریک عمل تھے۔ روس اور ایران بھی شمالی اتحاد کی ہر ممکن مدد کر رہے تھے۔ چنانچہ امریکہ نے بھی یہ آپشن پسند کیا کہ وہ اپنے فوجی دستوں کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے بجائے شمالی اتحاد کی پیٹھ ٹھونکے اور اسے ہر ممکن مالی اور فوجی امداد دے۔ طالبان کو کابل سے بے دخل کرنے کی حکمت عملی اپنانے میں ایک نقطہ جو طے پا چکا تھا اور جس پر امریکہ روس اور بھارت پوری طرح متفق تھے اور ایران کو بھی اعتراض نہیں تھا، وہ یہ تھا کہ طالبان حکومت کا تختہ الٹنا۔ یہ پاکستان کے لئے ایک مشکل فیصلہ تھا کیوں کہ بیس سال پہلے جہاد افغانستان کے وقت پاکستان کو اپنی سرحدوں کے دفاع کے لئے ایک دوست حکومت کی ضرورت تھی۔ طالبان کی تخلیق، پرورش، اور نشو ونما میں پاکستان نے خصوصی دلچسپی لی اور شمالی اتحاد کے مقابلے میں قدم جمائے رکھنے کے لئے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اب اسی شمالی اتحاد کے لئے طالبان کو بے دست و پا کر دینا یا ان کی پسپائی کا تماشہ دیکھنا پاکستان کے لئے آسان کام نہ تھا۔ پاکستان کو یہ بھی تشویش تھی کہ روس اور بھارت کے ہاتھوں میں کھیلنے والا شمالی اتحاد اگر ہماری سرحد پر آ بیٹھا تو پاکستان مشرق و مغرب دونوں طرف سے دباؤ میں آ جائے گا۔ پاکستان نے اپنی تشویش سے امریکہ کو آگاہ کر دیا تھا اور امریکہ نے بھی بعض یقین دہانیاں کرائی تھی۔ امریکہ کی یہ بھی کوشش تھی

کہ طالبان کے اندر بھی اختلافات پیدا کر دیئے جائیں اور کمانڈروں یا صوبائی گورنروں کو خرید لیا جائے۔ ان سارے منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے امریکہ جہاں روس اور بھارت پر انحصار کر رہا تھا وہاں پاکستان پر بھی دباؤ تھا کہ وہ نہ صرف مطلوبہ انٹیلی جنس معلومات فراہم کرے بلکہ مطلوبہ مقاصد کے حصول میں مدد بھی کرے۔

پاکستان کی حکومت تو امریکہ سے ہر قسم کا تعاون کر رہی تھی لیکن پورے ملک میں امریکہ مخالف مظاہرے کیئے گئے۔ شمالی وزیرستان کے ہیڈ کوارٹر میں مذہبی جماعتوں کے امریکہ مخالف مظاہرے کے دوران پہلے دن صدر بش کے پتلے کو کلاشنکوفوں سے چھلنی کر کے نذر آتش کر دیا گیا۔ قبائلی علماء ہی نے یہ اعلان کیا کہ قبائلی علاقہ جات میں نظر آنے والے ہر امریکی کو قتل کر دیا جائے اور جو بھی کسی امریکی کو قتل کرے گا ایسے ہر شخص کو چار لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔

دنیا کے بیشتر ممالک میں کروڑوں لوگوں کے احتجاج کے باوجود 7 اکتوبر 2001ء کی رات کو امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا امریکہ نے اپنے جدید ترین طیارے جن میں 58 ٹو بی قسم کے بمبار طیارے شامل تھے، کے ذریعے ہزاروں ٹن بارود اور کیمیائی مواد پھینکا۔ نیویارک میں جہاں گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں تباہی ہوئی وہاں تین سو افراد نے زبردست مظاہرہ کیا مظاہرین جن میں جذباتی اور امن پسند لوگ شامل تھے "بمباری بند کرو" "جنگ بند کرو" کے نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے افغانستان پر ہونے والی بمباری کو معصوم شہریوں کا قتل عام قرار دیا۔ وائٹ ہاؤس کے باہر بھی سینکڑوں افراد نے مظاہرہ کیا اور امریکی پالیسیوں پر شدید تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ تشدد اور انتقام سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ڈپلومیسی سے کام لیا جائے۔ انڈونیشیا کے اسلامی محاذ گروپ نے امریکی تنصیبات پر حملوں اور امریکیوں سمیت مغربی سفارت کاروں کو ملک سے نکال باہر کرنے کے لئے اپنی حکومت کو دھمکی دے دی۔ محاذ نے حکومت کو تین روز کا الٹی میٹم دے دیا۔ تائیوان کے دارالحکومت میں بھی طلباء نے مظاہرہ کیا اور کہا کہ دہشت گردی جیسے کو تیسا کی پالیسی کے تحت ختم نہیں ہوگی۔

امریکی صدر بش نے ایک پریس کانفرنس میں شرمناک رویہ اپناتے ہوئے اعلان

کیا کہ ہم اپنے اہداف کے حصول تک جنگ جاری رکھیں گے۔ یہ طویل جنگ کا پہلا مرحلہ ہے، اسے ایک دن لگے، ایک ہفتہ، ایک ماہ، ایک سال یا ایک دہائی لگے ہم اسے جاری رکھیں گے۔ ادھر طالبان نے بھی اعلان کیا کہ اب تک کی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بمباری کے باوجود الحمدللہ امیر المومنین ملا محمد عمر اور مجاہد اسلام اسامہ بن لادن بالکل ٹھیک ہیں۔ 10 اکتوبر کی رات امریکہ اور اتحادیوں نے طالبان رہنما ملا محمد عمر کے گھر پر جو طالبان کا اصل ہیڈ کوارٹر تھا اور جسے مختلف سرنگوں کے ذریعے کئی تہہ خانوں سے ملایا گیا تھا تاکہ طالبان خفیہ طور پر اپنے ٹھکانوں میں منصوبہ بندی کر سکیں شدید حملے کر کے تباہ کر دیا۔ اس سے پہلے صبح کے وقت بھی ملا محمد عمر کے گھر پر حملے کئے گئے لیکن ملا عمر حملوں سے صرف چند منٹ پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔

جنگ کے دوران اتحادیوں نے افغان عوام کی وفاداریاں خریدنے کے لئے افغانستان کے متعدد شہروں میں خوراک کے پیکٹ گرائے جس کا مقصد افغان عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ امریکہ افغان عوام کا ہمدرد ہے اور انہیں آزادی دلانے آیا ہے۔ عوام نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور خوراک کے پیکٹوں کو نذر آتش کر دیا۔ سابق سوویت یونین کی تباہی کے بعد دنیا کی واحد رہ جانے والی سپر پاور نے آزاد ملکوں میں من پسند حکومتیں مسلط کرنے کی مہم شروع کر رکھی تھی اور افغانستان اس کا پہلا شکار تھا۔

یہ بات تو طے تھی کہ بالآخر امریکہ ہی فتحیاب ہوگا۔ امریکہ کا زیادہ تر انحصار اپنی جدید ترین ٹیکنالوجی اور ہلاکت خیز بموں پر تھا۔ پندرہ ہزار ٹن وزنی بموں کی مسلسل بارش (کارپٹ بامبنگ) سے شہری آبادیاں بھی تباہ و برباد ہوگئیں۔ طالبان جن کے پاس لڑائی کے روائتی ہتھیار تھے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ طالبان کی فوجی قوت کو خطرناک اور مہلک ترین بموں سے تباہ کیا گیا۔ طالبان فوجی اعتبار سے ختم ہوتے چلے گئے۔ گوریلا وار کے دوران طالبان اب تک سینکڑوں امریکیوں اور اتحادیوں کو جہنم واصل کر چکے اور مزید کرتے رہیں گے۔ افغانستان پر ان کے روائتی حریف شمالی اتحاد اور دوسرے طالبان مخالف عناصر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جدید اور تباہ کن حربی طاقت کی مدد سے کابل سمیت افغانستان کے اکثریتی حصہ پر قابض ہونے کے بعد امریکہ اقوام متحدہ اور دہشت گردی کے

خاتمے کے نام پر تشکیل پانے والی کولیشن مختلف دھڑوں پر مشتمل حکومت مسلط کرنے کے زور و شور سے کام کر رہی تھی۔ جرمنی کے شہر بون میں وہ تمام افغان دھڑے ایک عبوری افغان حکومت کے لئے مذاکرات کرتے رہے۔ اس دوران امریکہ مسلسل نہتے افغان عوام کو بمباری کا نشانہ بناتا رہا۔ دوسری طرف عوام کی جان و مال اور عزت شمالی اتحاد کے جرائم پیشہ عناصر کے رحم و کرم پر تھی جنہیں امریکہ نے ہر طرح کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ مزار شریف بالخصوص قلعہ جنگی کے واقعات پر تو اقوام متحدہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر عالمی اداروں نے بھی احتجاج کیا اور عدالتی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا تھا لیکن امریکہ معاملات دبانے کے چکر میں رہا۔

طالبان کے مقابلے میں جن اقتدار کے بھوکوں کو وسیع البنیاد حکومت کے نام پر اکٹھا کیا گیا ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی اور نہ ہی وہ عوام میں کوئی قدر و قیمت رکھتے تھے۔ جرمنی کے سابق دارالحکومت بون میں ہونے والی بون امن کانفرنس میں کئی دفعہ تعطل پیدا ہوا اور بمشکل تمام اپنے انجام کو پہنچی اور 27 نومبر کو افغان دھڑوں نے وسیع البنیاد عبوری حکومت کے قیام پر اتفاق کر لیا۔ اس دن روزہ امن کانفرنس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں تمام اتحادی شامل تھے لیکن دوسرے فریق طالبان یا ان کی حکومت کا کوئی نمائندہ شریک نہیں تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر جو اعلامیہ جاری ہوا اس کے مطابق:

(1) طالبان اور القاعدہ کے تمام ملکی اور غیر ملکی اثاثے ضبط کر لئے جائیں گے۔

(2) اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک میں ان پر پابندی لگا دی جائے گی۔

(3) انٹر پول کے ذریعے طالبان کے نمائندوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کرائے جائیں گے۔

(4) طالبان مخالف عناصر کی عبوری نگران حکومت قائم کی جائے گی، جس میں کل 29 وزارتوں میں سے 16 وزارتیں شمالی اتحاد کو ملیں گی۔

(5) مکمل امن نہ ہونے تک اقوام متحدہ کی امن فوج کے نام پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو افغانستان میں فوج رکھنے کی اجازت ہو گی۔

(6) امریکہ کو جنگی قیدی (''دہشت گردوں کا غیر قانونی جنگجوؤں'') رکھنے کا اختیار ہو گا۔

حالانکہ یہ وہی دہشت گرد تھے جنہیں امریکہ مجاہدین اور ان کے سربراہ کو مجاہد اعظم قرار دیتا تھا اور ان ہی کی بدولت دنیا میں یک قطبی نظام وجود میں آیا اور امریکہ کا سکہ نافذ ہوا اور آج امریکہ انہیں دہشت گرد کہتا ہے۔ بہر حال اس بون امن کانفرنس کے نتیجے میں 22 دسمبر 2001ء کو حامد کرزئی نے عبوری حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اقتدار حاصل کر لیا۔ آج تین سال گزرنے کے باوجود بھی ابھی تک امریکی خفیہ ایجنسیوں اور جدید تیکنالوجی کے حامل اداروں کی سر توڑ کوششوں کے بعد بھی امریکہ نہ تو ملا عمر کو گرفتار کر سکا اور نہ ہی اسامہ بن لادن کا کوئی سراغ لگا سکا اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

امریکہ عراق معاہدہ

ایک اسرائیلی سائنس دان Vanunu نے جو صیہونی ریاست کے جوہری اسلحہ سازی کے منصوبے کے ساتھ وابستہ تھا اور کسی وجہ سے اسرائیل سے فرار ہو کر لندن پہنچا، اس نے اپنے بیان میں انکشاف کیا کہ اسرائیل نے خفیہ طور پر جوہری اسلحہ تیار کر لیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صیہونی ریاست کے اسلحہ خانے میں دو سو بیس ایٹم بم موجود ہیں۔ اسرائیل کے ایٹم بم دو سو بیس نہ ہوں اگر بیس بھی ہوں تو بھی یہ خطرے کی بات ہے۔ عراق اور شمالی کوریا کی ایٹمی تیاریوں پر امریکہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا لیکن اسے اسرائیل کے ایٹم بم نظر نہیں آئے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی ملک بھی کسی قسم کی قوت کا حامل نہ رہے تا کہ اسرائیل کی اس خطے پر حکمرانی قائم ہو سکے۔ اس لئے ایران بھی اس کی نظروں میں کھٹک رہا ہے۔

امریکہ ماسکو پر مسلسل دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ ایران میں جوہری بجلی گھر تعمیر نہ کرے، لیکن روس اس دباؤ میں نہیں آیا۔ ایران بھی سمجھتا تھا کہ عراق کو نشانہ بنانے پر امریکہ اکتفا نہیں کرے گا اور کسی صورت ایران کو چھوڑا نہیں جائے گا۔ امریکہ کو تو اب موجودہ سعودی عرب بھی قبول نہیں امریکہ کے تھنک ٹینک اسے بھی برائی کا محور قرار دے چکے ہیں۔

عراق کو ایک مرتبہ پھر ایٹمی، کیمیاوی ہتھیاروں کی تیاری کے الزام کا سامنا تھا اور انہیں الزامات کو جواز بنا کر اسے نشانہ بنانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ مگر ان الزامات کے ساتھ ساتھ ہمیں اسرائیلی ایٹمی استعداد پر کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔ شرق الاوسط میں عرب عسکری ٹیکنالوجی کے بارے میں عالمی تفتیشی ادارے چھان بین کی مہمات میں جتے رہتے ہیں لیکن اسرائیل کے سب سے خطرناک ایٹمی پراجیکٹ ''ڈیمونہ'' کے دروازے کبھی بین الاقوامی تفتیشی اداروں کے لئے نہیں کھولے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کی ایٹمی استعداد کار کے متعلق عالمی اداروں کے ریکارڈ میں کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔ مگر

اس صورت حال کو کبھی عالمی اداروں یا استعماریت کے مشترکہ پلیٹ فارم اقوام متحدہ نے دہشت گردی سے تعبیر نہیں کیا۔

اسرائیل ساٹھ کی دہائی سے جب اس نے ''ڈیمونہ'' پراجیکٹ کو مکمل کیا، تباہ کن اور ہلاکت خیز اسلحہ تیار کر رہا ہے۔ اسرائیلی اخبار ''ھارتس'' نے 20 نومبر 1998ء کی اشاعت میں یہ خبر دی تھی کہ اسرائیل نے ایسے جینٹک کیمیاوی ہتھیار تیار کئے ہیں جو صرف عربوں کو نقصان پہنچائیں گے یہودیوں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ اسرائیلیوں نے اس مہلک ہتھیار کی تیاری بائیولوجیکل انسٹی ٹیوٹ ''نیس تسیونا'' کے خفیہ مرکز میں کی ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ ''اسرائیل نے یہ خطرناک کیمیاوی جینیاتی ہتھیار عراقیوں کے ''کیمیاوی ہتھیاروں'' کے جواب میں بنائے ہیں۔ نیس انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے ایک اسرائیلی سائنس دان کے مطابق جینیاتی ہتھیاروں میں عرب اور یہودی جین الگ الگ کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ کیوں کہ عرب اور یہودی دونوں سامی الاصل ہیں مگر اس سلسلے میں عربوں خصوصاً عراقی عربوں کے جینز پر خاص تحقیق کی گئی۔''

اسرائیلیوں کے مطابق شام، عراق، مصر اور ایران کیمیاوی ہتھیار بنانے کی استعداد رکھتے ہیں اور یہ اسرائیل کے لئے کھلا خطرہ ہیں۔ عراق کیمیاوی ہتھیار بنا کر انہیں کامیابی سے چھپا رہا ہے۔ مصر اعصابی گیس کی تیاری میں مہارت رکھتا ہے۔ ایران اپنے ایٹمی منصوبے کو تیزی سے مکمل کر رہا ہے۔ عراق کے بارے میں امریکیوں کو خدشہ تھا کہ اگر عراق پر جنگ مسلط کی گئی تو ممکن ہے عراق کیمیاوی ہتھیاروں سے لیس میزائل اسرائیل پر نہ داغ دے۔ عرب عوام پورے شعور کے ساتھ اب اس بات کا برملا اظہار کر رہے تھے کہ اگر اسرائیل کو جائز اور ناجائز طریقے سے ایٹمی قوت بننے کا حق حاصل ہے تو عراق اور دیگر عرب ملک اس حق سے کیوں محروم ہیں۔ اسرائیلی اور امریکی اخبارات تواتر کے ساتھ عراق کے خلاف گمراہ کن پراپیگنڈہ کر کے امریکہ کو عراق پر حملہ کرنے کی شہہ دیتے رہے ہیں۔

سی آئی اے کی ایک رپورٹ کے مطابق 1998ء تک امریکی اور برطانوی حملوں میں تباہ ہونے والے عراقی میزائل پراجیکٹ پر تیزی سے دوبارہ کام شروع کیا گیا اور جلد ہی کم فاصلے پر مار کرنے والے میزائل تیار کر لئے گئے۔ جن میں ''الصمود'' نامی

میزائل سیال مادے سے چلایا جاتا ہے جبکہ "ابابیل" نامی میزائل کو ٹھوس مادے سے داغا جا
ہے۔ اس کے علاوہ عراق بغیر پائلٹ کے جہاز بنانے میں بھی مہارت حاصل کر چ
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں نے عراق کی سرزمین کا چپہ چپہ چھان مارا
لیکن انہیں اس قسم کا کوئی مواد یا ہتھیار نہیں ملا۔ چیف انسپکٹر ہانس بلکس اور ایٹمی توانائی کی بین
الاقوامی ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل محمد البرادی نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں عراق کے تعاون کا
اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس بات کی تصدیق نہیں کی جاسکتی کہ عراق ایٹمی ہتھیاروں کی
تیاری کا کوئی ٹھوس پروگرام رکھتا ہے یا نہیں۔ گذشتہ دو سال کے درمیان اسلحہ انسپکٹروں کے
ساتھ عراق کا تعاون بھی مثالی رہا ہے۔ نیز یہ کہ اسلحہ انسپکٹروں کو مزید وقت دیا جائے۔ اقوام
متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے بھی انسپکٹروں کے کام جاری رکھنے کی حمایت کی۔

عراق میں اقوام متحدہ کی طرف سے اسلحے کے معائنہ کار ٹیم کی طرف سے
رپورٹ پیش کیے جانے کے بعد اور صدر بش کو آٹھ یورپی ممالک کی طرف سے حاصل
ہونے والی حمایت کے باوجود یورپ میں دراڑیں پڑ گئیں اور سلامتی کونسل بھی عراق
کے مسئلے پر دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ اسپین کے صدر ماریا انز، پرتگال کے
دوراؤ باردسو، اٹلی کے سلویو برلوسکی، برطانیہ کے ٹونی بلیئر، جمہوریہ چیک کے واکلاؤ
ہیول، ہنگری کے پیٹر میڈ گائیسی، پولینڈ کے لیزک ملر اور ڈنمارک کے ایڈرس فورا
سموسن نے صدر بش کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ
اگر اقوام متحدہ صدر صدام حسین کو غیر مسلح ہونے پر مجبور نہیں کرتی تو ہمیں اس عالمی
ادارے کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس قرارداد کے بعد اب بظاہر امریکہ کو عراق پر حملہ آور
ہونے کے لئے اخلاقی معاونت مل گئی تھی لیکن فرانس اور جرمنی کی طرف سے امریکہ کی
یکسر مخالفت کے بعد یورپ میں پھوٹ پڑ گئی، یہاں تک کہ اس دوران ہونے والے
یورپی یونین کے اجلاس میں نہ تو فرانس کو دعوت دی گئی اور نہ ہی جرمنی کو۔ ان دونوں
ممالک کو اخبارات کے ذریعے اجلاس کی کارروائی کا پتہ چلا۔

اکتوبر 2002ء کو یورپی یونین کے ہونے والے اجلاس میں پیرس اور برلن نے
دیگر یورپی یونین کے ممبران سے ایگریکلچرل ایشو پر اختلاف کر کے آپس میں ایک معاہدہ کیا

تھا کہ وہ دنیا کو جنگ سے بچانے کے لئے مشترکہ کوششیں کریں گے۔ ایک طرف جرمنی، فرانس، عرب ممالک، روس، چین اور انڈونیشیا وغیرہ تھے جو ہر ممکن طریقے سے اس جنگ کو روکنے یا ٹالنے کے لئے سرگرداں تھے اور دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ جو جلد از جلد عراق پر حملہ کرنے پر تلے دکھائی دیتے تھے۔

11 ستمبر کے بعد صدر بش نے افغانستان پر حملے کے وقت برملا کہا تھا کہ افغانستان پر حملہ امریکہ کا آخری اقدام نہیں۔ وہ ''دہشت گردی'' کے خاتمے کے لئے دنیا کے ہر کونے میں ''دہشت گردوں'' کا تعاقب کرے گا۔ امریکی وزیر خارجہ مسٹر کولن پاول نے اپنے پانچ فروری کے سلامتی کونسل کے خطاب میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ اگر اقوام متحدہ نے عراق کے مسئلے پر امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو اقوام متحدہ کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ عراق نے مہلک ہتھیار معائنہ کاروں کی عراق آمد سے پہلے ہی چھپا دیئے تھے۔ کولن پاول کا دعویٰ تھا کہ عراق کے پاس اینتھراکس کا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس طرح اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 1441 جس کے تحت عراق کو غیر مسلح کرنے کا حکم جاری ہوا ہے وہ اس کی خلاف ورزی کا مرتکب پایا گیا ہے۔

سلامتی کونسل کے بیشتر ارکان نے کولن پاول کے دعوے کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کے دھمکی آمیز رویئے کو بین الاقوامی اخلاقیات اور اصولوں کے منافی قرار دیا۔ جبکہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے اپنے پارلیمنٹ کے خطاب میں واضح طور پر کہا کہ برطانیہ کو کسی ویٹو کی پرواہ نہیں اگر سلامتی کونسل کے کسی مستقل رکن نے دوسری قرارداد ویٹو کر بھی دی تو بھی برطانیہ عراق پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے۔

ہینس بلیکس متعدد مرتبہ یہ بات دہرا چکے تھے کہ معائنہ کاروں نے کئی جگہ سے نمونے حاصل کئے لیکن ان سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ عراق ممنوعہ اسلحہ تیار کر رہا ہے یا اس نے یہ کہیں منتقل کر دیا ہے۔ اسی طرح انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمشن کے سربراہ البرادی نے سلامتی کونسل میں ہتھیاروں کی تلاش کے حوالے سے اپنے بیان میں کہا کہ ہمیں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ عراق کے پاس کوئی خطرناک قسم کا کوئی ہتھیار موجود ہے یا پھر وہ کوئی خطرناک قسم کا ہتھیار خفیہ یا اعلانیہ تیار کر رہا ہے۔ ہیلنس

بلیکس کی رپورٹ سے صدر بش کو یہ سہولت میسر آگئی تھی کہ وہ رپورٹ کی روشنی میں مرضی سے نتائج حاصل کر کے ساری دنیا سے منوانے پر تل جائے۔ جبکہ عملاً صورت حال یہ کہ رپورٹ کے بعد بھی ساری دنیا دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک طرف وہ ممالک تھے جو عراق پر ممکنہ امریکی حملے کو کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، دوسری طرف امریکہ، برطانیہ اور کسی حد تک آسٹریلیا کا بلاک تھا جو ہر صورت عراق پر حملے کے لئے زور دے رہا تھا۔ اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن بڑی سرگرمی سے اس امر کا جائزہ لے رہا تھا کہ امریکی حملے کے بعد عراق کی خانماں برباد عوام کو کن مصائب و مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فوجی میڈیا نے ان جائزوں کی تفصیلات خصوصی ذرائع سے بیان کیں جن کے مطابق امریکی حملے کے فوراً بعد کم از کم پانچ لاکھ عراقیوں کو طبی امداد کی ضرورت پیش آئے گی۔ تینتیس لاکھ عراقیوں کو خوراک کی کمی کا سامنا ہوگا اور پانچ سال سے کم عمر کے اسی فیصد بچے بھوک اور بیماری سے جاں بلب ہو جائیں گے۔ واضح رہے کہ عراق کی اس وقت کل آبادی دو کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔

ہر ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کی نگہداشت کرے لیکن امریکہ اپنے مفادات کی پاسداری اس طرح کرتا ہے کہ وہ بین الاقوامی قوانین کی ہی پرواہ نہیں کرتا۔ انہیں دنوں امریکہ میں اکتیس صفحات پر مشتمل ''نیشنل سیکورٹی سٹریٹجی'' نامی ایک کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں واضح کر دیا گیا تھا کہ امریکہ پوری دنیا میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ اس کی برابری کرے یا اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

امریکہ اسلامی دنیا کو دہشت گردی کا منبع خیال کرتا ہے۔ صدر بش نے نائن الیون کے بعد اپنی تقریر میں ''کروسیڈ'' (صلیبی جنگ) کا لفظ استعمال کیا تھا اور جب اسلامی دنیا میں اس لفظ کے استعمال پر شدید ردعمل ہوا تو امریکہ اور اس کے ہم خیالوں نے اسے مشکل صورت حال سے نکالنے کی کوشش کی۔ اب امریکہ اپنی پوزیشن کا دفاع یہ کہہ کر کر رہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف اقدامات ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' نہیں بلکہ مسلم تہذیب کے اندر ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے جو کہ نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ پوری دنیا کے لئے خطرہ ہے۔ امریکہ اسلامی دنیا کو اس ابھرتے ہوئے خطرے سے بچانا چاہتا ہے۔ اس طرح امریکہ اسلامی دنیا کے نہ چاہتے ہوئے بھی خود ساختہ منصف بن کر اسلامی دنیا کو خطرے

سے بچانے کے لئے میدان میں کود پڑا۔

امریکہ کے ایوان اقتدار میں جب ''محورش'' کی اصطلاع گھڑی گئی تو اس میں ایران عراق اور لیبیا کے نام شامل تھے۔ چونکہ یہ تینوں اسلامی ممالک ہیں اس لئے اسلامی دنیا میں شدید ردعمل کا اندیشہ تھا لہٰذا لیبیا کا نام خارج کر کے اس میں شمالی کوریا کا نام شامل کیا گیا۔ عراق کو چوں کہ برائی کا محور قرار دیا جا چکا ہے لہٰذا امریکہ دیگر وجوہات کی بنا پر پہلے اس ''برائی'' کو ختم کرے گا اور پھر کسی اور جانب توجہ دے گا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا جنوبی کیلیفورنیا کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں اسلحہ سازی میں تیزی آ گئی تھی۔ پینٹا گون کو اسلحہ سپلائی کرنے والے ٹھیکیداروں نے اپنے انجینئروں کی چھٹیاں منسوخ کر دی اور انہیں زیادہ سے زیادہ وقت تک کام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ کمپنیاں جو پینٹا گون کے لئے جاسوسی کے آلات تیار کر رہی تھیں انہیں کہا گیا کہ وہ طے شدہ وقت سے پہلے اپنی ایجادات کو سامنے لائیں۔

صدر بش نے پہلے امریکی عوام کو ''القائدہ'' سے خوب ڈرایا اور اسے تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا پھر امریکہ نے مغربی دنیا کے جذبات بھڑکانے کے لئے عراق سے متعلق ایک اور شوشہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے عراق پر الزام لگایا کہ اس کا تعلق اسامہ بن لادن کی تنظیم ''القائدہ'' سے ہے۔ اس بارے میں امریکی وزیر خارجہ نے مواد بھی فراہم کر دیا تھا۔ الغرض صدر اور اس کے حواریوں نے امریکی عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے نت نئی کہانیاں گھڑیں۔ اس پروپیگنڈا مہم کے باوجود امریکہ کے عراق پر ممکنہ حملے کے خلاف امریکہ اور برطانیہ سمیت دنیا کے بڑے شہروں میں مظاہرے جاری تھے، حتیٰ کہ چند لوگوں نے یو این او کے بڑے ادارے جنرل اسمبلی ہال کے اندر گھس کر مظاہرہ کیا۔

امریکیوں نے اپنا ہائر کمانڈ ہیڈ کوارٹر قطر کو بنا لیا تھا، عراق کے اردگرد کئی ممالک میں امریکہ نے اپنی فوجی سہولتوں میں اضافہ کر لیا تھا اور یہ سب تیاریاں عراق کو محض ڈرانے کے لئے نہیں بلکہ جنگ کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ اس سب کے باوجود امریکی قیادت سمیت ذرائع ابلاغ اور امریکی عوام پر عراقی صدر صدام حسین کا قابوس اور اس کے خوفناک اور پراسرار اقدامات کا خوف اس قدر تھا کہ واحد سپر طاقت ہونے

کی دعوے دار حکومت اور اس کے عوام و خواص عراق پر خود سے جنگ مسلط کرنے
باوجود اس کی جوابی کارروائیوں سے خوفزدہ تھے۔ حتیٰ کہ امریکی حکومت اور ذرائع
ابلاغ نے صدام کے بارے میں ایسی کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں جن کا حقیقت سے دور کا
بھی واسطہ نہ تھا۔

امریکہ کے جو بھی منصوبے ہوں خدا کا قانون کبھی بھی دنیا پر ایک قوت کا غلبہ نہیں
رکھتا، ایک کے مقابلے میں دوسری طاقت ضرور ہوتی ہے۔ جس طرح روس بغیر کسی جنگ کے
زمین پر آ گیا تھا ایسا ہی حشر امریکہ کا ہوگا۔ کیوں کہ فاتح عالم بننے کے شوق میں اس کی
معیشت کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اپنی اس زوال پذیر معیشت کے لئے ہی وہ دنیا
کے تیل کے ذخائر، اہم گزرگاہوں اور منڈیوں پر قبضہ کرنا اور دنیا کا تنہا حکمران بننا چاہتا
ہے، لیکن ایک طرف مسلم رائے عامہ کی نئی قوت پیدا ہو چکی ہے، دوسری جانب یورپ نئی
سیاسی کروٹ لے رہا ہے۔ یورپ اس کوشش میں ہے کہ امریکی بالادستی سے نجات حاصل
کرنے کے لئے متحد ہو کر امریکہ کے برابر کی قوت ہو جائے اور اس مقصد کے لئے یورپی
یونین کے ذریعے کافی کام کر لیا گیا ہے۔ اس وقت صرف برطانیہ امریکہ کا پٹھو ہے یا مشرقی
یورپ کے وہ ممالک جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے بہت پسماندہ ہیں اور پرانے
یورپ کی باقیات ہیں۔

اب جبکہ نئے یورپ نے جنم لیا ہے تو جرمنی اور فرانس اس کے قائد ہیں اور
امریکہ کا یورپ سے یہ تضاد اب کھل کر سامنے آ چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
بڑھتا چلا جائے گا۔ اسرائیل کے مسئلے پر بھی یورپ اور امریکہ کی پالیسی میں نمایاں فرق
آ چکا ہے۔ امریکہ کی کوشش تھی کہ عالم اسلام کو فتح کرنے کی غرض سے سازگار فضا پیدا ہو
اور اس مقصد کے لئے امریکہ نے ایسا منصوبہ بنایا کہ دنیا میں جنگ صلیب و ہلال کا منظر
سامنے آ جائے اور یورپ عالم اسلام پر امریکی یلغار میں امریکہ کا ساتھ دے۔ لیکن
یورپ کی فضا اس کے برعکس تھی عیسائیت کے تمام مذہبی رہنما اور چرچ عراق پر امریکی
حملے کے خلاف ہم آواز تھے۔

عراق پر جنگ مسلط کرنے کے خلاف دنیا کا ہر امن پسند ملک، تنظیم اور ادارہ

امریکہ کی مخالفت کررہا تھا لیکن امریکہ افغانستان کے بعد ایک بار پھر عراق پر آگ و آہن کی بارش کرنے کے لئے تیار ہورہا تھا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ امریکہ میں اس وقت جو گروہ برسراقتدار تھا وہ 1990ء میں بھی بش جونیئر کے والد بش سینئر کی انتظامیہ میں شامل تھا۔

حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا بھر کے عوام اس ممکنہ جنگ کو رکوانے کے لئے احتجاج کررہے تھے لیکن امریکی اور برطانوی رویے سے صاف ظاہر تھا کہ دونوں ممالک نے عالمی رائے عامہ کو اہمیت نہ دینے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ امریکی صدر اپنی اس جنگی مہم کے لئے حمایت حاصل کرنے کے ضمن میں ایک ہی موقف پر ڈٹے ہوئے تھے کہ امریکہ یہ کاروائی ''دہشت گردی'' کے خاتمے کے لئے کررہا ہے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دنیا بھر سے دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔

16 فروری 2003ء کو دنیا بھر کے ایک کروڑ سے زائد عوام نے امریکہ کے خلاف احتجاج کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ جنگ کے خلاف ہیں اور دنیا بھر میں امن چاہتے ہیں۔ ان مظاہروں سے یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی کہ اس ممکنہ جنگ کو روکا جاسکے گا اور نہ ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ دنیا بھر کے عوام صدر صدام کے حمایتی ہیں لیکن مظاہروں نے یہ ثابت کردیا کہ امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم عوام میں اپنی مقبولیت کھورہے تھے۔ امریکی صدر کی دھمکیوں کے جواب میں عراقی صدر کے بیانات پر عراقی عوام کی طرف سے ایسا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا کہ جس میں صدام کو اقتدار سے الگ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ صدر صدام آج بھی اپنے عوام میں اتنی ہی مقبولیت رکھتے تھے جتنا وہ بیس سال پہلے عوام میں مقبول تھے۔ جو صدر اپنے عوام میں اس قدر مقبولیت کا حامل ہو، امریکہ جیسے مہذب اور جمہوریت کے چیمپئن ملک کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے سربراہ کو اقتدار سے الگ کرنے کی باتیں کرے۔

دوسری طرف امریکی اور برطانوی تحقیقاتی اداروں نے بھی اپنی حکومتوں کو اس بات سے آگاہ کردیا تھا کہ انتہائی کوششوں کے باوجود عراق اور القائدہ کے درمیان تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ان رپورٹوں کے باوجود امریکہ ہر صورت میں 1990ء کے نامکمل اپریشن ''اپریشن ڈیزرٹ سٹار'' کو مکمل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

جہاں تک عوام اور محنت کشوں کا تعلق ہے انہوں نے بڑے بڑے مظاہروں کے ذریعے عراق پر امریکی فوج کشی کی مخالفت میں رائے دی۔ مثلاً برطانیہ، سپین، اٹلی، آسٹریلیا، فرانس اور جرمنی۔ میں جو مظاہرے ہوئے ان کی مثال تاریخ میں ناپید ہے۔ فرانس، جرمنی، بیلجیم اور دیگر کئی مغربی یورپ کے ممالک جو سیاسی شعور کے اعتبار سے امریکہ سے چار سو سال آگے ہیں اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موجودہ امریکی قیادت کی کوئی بھی مہم جوئی یا غلط فیصلہ نا صرف امریکہ کے مستقبل کے لئے کوئی بہت بڑا خطرہ یا کسی بڑے انقلاب کی جانب اٹھنے والا پہلا قدم نہ ہو، جس کے بعد پوری دنیا سے ہی استحصالی طبقات کا مستقل طور پر خاتمہ ہو جائے اور وہ طبقات یا ان کے دانشور جوان حقائق پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں امریکی اقدام کو بہت بڑا خطرہ تصور کرتے ہوئے اقوام متحدہ میں اس امریکی قرار داد کی مخالفت کر رہے تھے اور بات یہاں تک پہنچی کہ فرانس نے آخری قدم اٹھاتے ہوئے یہاں تک دھمکی دی کہ اگر امریکہ اقوام متحدہ میں سلامتی کونسل بمعہ غیر مستقل ممبران 9 ووٹ حاصل کر کے اپنی قرارداد منظور کرا لے تو بھی فرانس اپنا ویٹو کا حق استعمال کرے گا۔

اس صورت حال نے نہ صرف جرمنی کی حوصلہ افزائی کی بلکہ روس اور چین کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کا ذریعہ ثابت ہوا اور ان ممالک نے بھی امریکی قرار داد کی مخالفت میں کھل کر اظہار رائے کیا ورنہ باوجود روسی عوام اور چینی عوام کی جانب سے امریکی فوج کشی کی مخالفت کے روسی اور چینی حکمران طبقات امریکہ سے سودے بازی میں مصروف تھے۔ مگر فرانس کی جرأت اور جرمنی کی فرانس کے لئے مستقل حمایت نے اس صورت حال کو دوسری شکل دے دی۔ اب امریکہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اقوام متحدہ سے اپنے منصوبے کے لئے حمایت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہی نہیں برطانیہ اور خود امریکہ میں امریکی فوج کشی کی مخالفت میں متعدد وزراء، سفیروں اور عہدہ داروں نے استعفے بھی دیئے۔ اس صورت حال کے بعد امریکہ نے اقوام متحدہ میں ہونے والی رائے شماری کو نہ صرف ملتوی کرا دیا بلکہ مجبور ہو کر قرار داد بھی واپس لے لی۔

عراق کی صورت حال کے پیش نظر پاکستان میں بھی عوامی ردعمل ایک فطری سی بات تھی۔ پوری دنیا اور خاص طور پر برطانوی، سپینی، اطالوی، فرانسیسی اور جرمن عوام کی

جانب سے کئے جانے والے مظاہروں نے پوری دنیا کو بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پوری دنیا کے حکمران طبقات کو اس لئے دہلا کر رکھ دیا کہ بھلے یہ باتیں کتنی ہی کریں مگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ عوام وہ قوت ہے جو اگر کچھ کرنے پر آئے تو اسے بڑی سے بڑی فوجی قوت بھی نہیں روک سکتی۔ یہی وہ خوف ہے جو حکمران طبقات اور ان کے بہی خواہ سیاسی گروہوں اور دانشوروں کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے فلسفے اور منصوبوں کو عوامی خواہشات یا ضروریات کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر حملہ کرنے کے لئے 22 مارچ کی تاریخ کا تعین کر رکھا تھا لیکن مقررہ تاریخ سے دو دن قبل انہیں اطلاع ملی کہ عراق کے صدر صدام حسین ایک جگہ پر اہم میٹنگ کر رہے ہیں تو انہوں نے وقت ضائع کئے بغیر اس جگہ پر کروز میزائل داغ دیئے۔ جس کے بعد اتحادیوں کی طرف سے یہ دعوے کئے جاتے رہے کہ صدام حسین اس حملے میں اگر جاں بحق نہیں ہوئے تو زخمی ضرور ہو گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی صدام حسین حملہ ہونے سے چند منٹ پہلے اس مقام سے جا چکے تھے۔

اتحادی کمانڈروں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی نظریں بھی صدام حسین پر جمی ہوئی تھیں خاص کر پاکستان اور عرب ممالک سمیت دنیا بھر کے مسلمان جن کی ہمدردی اس جنگ میں عراق کے ساتھ تھی وہ عراقی مرد آہن کے بارے میں خاصے متفکر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صدام حسین کی سلامتی ہی عراقی مزاحمت کے جاری رہنے کی دلیل ہوگی، ورنہ فدائین کے حوصلے بھی پست ہو سکتے ہیں۔ اردنی انٹیلی جنس کے ذرائع سے یہ خبر سامنے آئی کہ وہ رپورٹ بغداد میں موجود ایک امریکی مخبر نے دی تھی جس کا عراقیوں نے پتہ چلا لیا تھا۔ سی آئی اے حکام کا بھی کہنا تھا کہ ان کا مخبر لاپتہ ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مارا گیا ہو۔ بہر حال صدام حسین کی ہلاکت بارے امریکی دعوے کی قلعی اس وقت کھل گئی جب صرف تین گھنٹے بعد صدام حسین نے عراقی ٹی وی پر خطاب کیا۔

امریکی اور برطانوی طیاروں نے 20 مارچ کی صبح سات بجکر پینتیس منٹ پر عراق پر وحشیانہ بمباری شروع کر دی۔ حملے کے بعد عالمی برادری سراپا احتجاج بن گئی۔ مظاہرین نے بش اور بلیئر کو جنگی مجرم قرار دے کر ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا۔ خود

امریکی شہروں اور خاص طور پر نیو یارک میں سوا لاکھ افراد نے مظاہرے میں شرکت کی۔ بش نے عراق کے خلاف اس فوجی کارروائی کو ''فریڈم آف عراق'' کا نام دیا۔

عراق پر امریکی جارحیت کے ساتھ ہی دنیا بھر کے فکری وار اسٹرٹیجک حلقے اس جنگ کے مابعد اقتصادی، سیاسی اور عسکری اثرات پر غور کرنے پر جت گئے۔ ان میں مغربی تھنک ٹینک بھی شامل تھے اور عالم عرب سے تعلق رکھنے والے ادارے بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

افغانستان اور اس کے بعد عراق پر امریکی و برطانوی جارحیت کے سلسلے میں دو قسم کے سوالات اٹھائے گئے کہ آیا مسلمانوں کے خلاف مغربی جنگیں مذہبی ہیں یا ان کے مفادات کی جنگ ہے؟ دینی طبقات نے اسے بش کی صلیبی جنگ سے تعبیر کیا جبکہ اپنے آپ کو روشن خیال تصور کرنے والے بزرجمہر اسے مغربی مفادات کی جنگ قرار دیتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ماضی میں مغرب نے اپنے مفادات کی خاطر مذہب کو استعمال کیا۔ مغرب نے صلیبی جنگ مذہب کے نام پر لڑی حالانکہ اس جنگ کا بڑا حصہ یورپ کا بحیرہ احمر پر اقتصادی اور عسکری تسلط قائم کرنا تھا۔ اس لئے مغرب کی مجرمانہ روش کو مفادات اور مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

عالم عرب کے معروف اسلامی مفکر فہمی ہویدی نے رابطہ عالم اسلامی کے جریدے ''الرابطہ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ''دہشت گردی کے نام پر اسلامی دنیا پر مغرب کی جانب سے مسلط کردہ جنگ بلاشبہ اپنے اندر سب سے پہلے مذہبی اور اس کے بعد اسلامی دنیا کے وسائل پر تسلط قائم کرنے کی فکر سے معمور ہے۔ امریکی قیادت میں مغربی دنیا اسلامی دنیا سے بری طرح خائف ہے اور اس خوف کو بڑھانے میں عالمی صیہونیت کا بڑا دخل ہے۔ مغرب کے اسلامی دنیا کے خلاف اس رویئے کا اولین سبب دینی ہے اس کے بعد وہ دنیوی مفادات کو اس فکر کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' فہمی ہویدی کی یہ چشم کشا باتیں بظاہر سادہ نظر آتی ہیں مگر اس کے عوامل انتہائی خوفناک ہیں۔

عراق پر امریکی جارحیت کے حوالے سے مسلمانوں کی عظیم دینی درسگاہ اور تحقیقی ادارے جامعۃ الازہر کی جانب سے فتویٰ جاری کیا گیا کہ عراق پر امریکی جارحیت کے ساتھ

ہی مسلمانوں پر جہاد فرض ہو چکا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک صلیبی جنگ ہے۔ الازہر یونیورسٹی کی جانب سے جاری کیے گئے فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ ''عراق پر حملے کو ہر کسی نے غیر ضروری قرار دیا ہے اور اسلامی قوانین کے مطابق جب دشمن کسی بھی مسلمان ریاست کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسے میں ہر مسلمان مرد اور عورت پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ موجودہ صورتحال میں عرب اور دیگر مسلم برادری کو ایک نئی صلیبی جنگ کا سامنا ہے جو ہماری سر زمین، وقار، ایمان اور دین کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔

فتویٰ میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے متحد ہو جائیں اور کسی بھی قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کریں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور اس کا سربلند کرنا جانتا ہے۔'' جامعہ الازہر کے اس فتویٰ کے تناظر میں قاہرہ میں ہزاروں مصری طالب علموں نے امریکہ اور اسرائیل کے خلاف مظاہرے بھی کیے۔

عراق پر امریکی جارحیت کے خلاف تمام عالم عرب میں سب سے زیادہ واضح موقف سعودی عرب کا رہا ہے، جس نے امریکہ کی عراق پر جارحیت روکنے کے لئے دنیا کے مختلف فورموں پر آواز اٹھائی۔ او آئی سی سے لے کر عرب لیگ کی سربراہ اور وزراء خارجہ کانفرنس کے دوران سعودی عرب کھل کر امریکی عزائم کی مذمت کرتا رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس آواز کے ساتھ کسی نے آواز نہیں ملائی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ شرمناک کردار کویت، قطر اور بحرین کا ہے جنہوں نے اپنی سرزمین کو عراق کے خلاف امریکی آپریشنل کمانڈ میں تبدیل کر دیا۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ عراق پر سے جنگ ٹالنے کے لئے ہر ممکن کوشش ہوتی لیکن سیاسی و سفارتی سطح پر کیے جانے والے اقدامات اور اجتماعات کے دوران کویتی نمائندہ عراقی وفد سے الجھنے کی کوشش کرتا رہا، جس کی وجہ سے تلخیاں پیدا ہوئیں اور اتحاد کی امیدیں دم توڑتی گئیں۔

یہود و ہنود کی قیادتوں نے عراق کو تر نوالہ سمجھا تھا مگر وہ ان کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔ مہلک ایٹمی ہتھیاروں کے غرور میں بدحواس بش اور بلیئر کی جدید ترین اور اعلیٰ ٹیکنالوجی سے عبارت ہولناک ہتھیاروں سے لیس افواج کو جنگ کے ابتدائی دنوں میں

مختلف محاذوں پر جس ذلت و رسوائی سے واسطہ پڑا اس سے صرف فوجی قیادت ہی نہیں بوکھلائی بلکہ خود بش اور اس کے حواریوں کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دفاعی ماہرین کے مطابق امریکی و برطانوی افواج نے عراقی عوام کے خلاف جو مہلک نیم ایٹمی ہتھیار استعمال کئے وہ جنگ عظیم دوئم کے بعد اب تک کسی جنگ میں استعمال نہیں ہوئے۔

امریکی فوجی دہشت گردی کے چوتھے روز ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے ایک عالم کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا اور امریکی حکمت عملی کو بدترین ہزیمت کا داغ قرار دیا۔ عراق کے وزیر خارجہ نجی صابری 23 اپریل کو عرب لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے اتحادی فوجوں کو جل دے کر عراق سے قاہرہ پہنچ گئے۔ وہ سوٹ کے بجائے روائتی قبائلی لباس پہن کر ایک عراقی ڈرائیور کی پرائیویٹ ٹیکسی میں دمشق کے راستے قاہرہ پہنچے۔ ٹونی بلیئر کی تعریفوں کے پل باندھنے والے خبر رساں ادارے بی بی سی کا تبصرہ تھا کہ جنگ کے باوجود نجی صابری کا بذریعہ سڑک شام پہنچنا اور وہاں سے عرب لیگ کے وزارتی سطح کے اجلاس میں شرکت کے لئے قاہرہ پہنچ جانا ایک طرح سے امریکہ کی شکست ہے۔ امریکہ کا یہ دعویٰ ہے کہ صدام حسین کی حکومت رفتہ رفتہ اپنے کمانڈروں اور فوج سے کٹتی جا رہی ہے اور صورت حال تیزی سے ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہے، یہ دعویٰ درست نظر نہیں آ رہا۔ پورے عراق کو مسلسل کئی روز سے بمباری کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ایسے حالات میں نجی صابری کا بغداد سے قاہرہ پہنچنا اس بات کی دلیل ہے کہ صدام حسین کا حکومت پر کنٹرول کمزور نہیں ہوا۔

اسی روز عالمی خبر رساں ایجنسی اے ایف پی نے عالمی رائے عامہ کو یہ خبر مہیا کی کہ امریکی وزیر دفاع عراق میں امریکی فوجیوں کی ہلاکت اور 35 کے قید ہونے کی اطلاع پر انتہائی افسردہ ہو گئے۔ ٹیلی ویژن پر لوگوں نے دیکھا کہ افسردہ اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ وزیر دفاع رمزفیلڈ نے کہا کہ امریکی جنگی قیدیوں کے ٹی وی پر نشر کئے جانے والے انٹرویو جنیوا کنونشن کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنیوا کنونشن کے تحت جنگی قیدیوں کی تصاویر نہیں دکھائی جانی چاہئیں۔ ٹونی بلیئر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ان کے گرو بش نے تو عراق کو ''خبردار'' کرانے کے انداز میں کہا کہ امریکی قیدیوں سے انسانی سلوک کیا جائے۔

رمز فیلڈ کا مطلب یہ تھا کہ ان قیدیوں کی ذلت ورسوائی دیکھ کر امریکی قوم میں صف ماتم بچھ جائے گی اور بش کی کرتوتوں پر امریکہ اور برطانیہ میں گلی گلی لوگ لعنتیں بھیجیں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گوانتاناموبے میں قید طالبان اور القاعدہ مجاہدین جنہیں پنجروں میں بند کر کے غیر انسانی برتاؤ کیا گیا ان کی تصاویر امریکہ کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی رہیں اور بش کو اس معاملے میں جنیوا کنونشن کی یاد نہیں آئی۔

ان معرکوں میں عراقی جانبازوں کے مقابلے میں درجنوں امریکی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ پسپائی کے موقع پر اپنے جن زخمیوں کو امریکی فوج واپس لے جا سکی انہیں بذریعہ طیارہ جرمنی میں امریکی فوجی بیس پر لے جانے کا سلسلہ اگلے روز بھی جاری رہا۔ امریکی ترجمان نے اگرچہ زخمی امریکی فوجیوں کی صحیح تعداد بتانے سے انکار کیا لیکن امریکی کمانڈروں نے اس امر کا اعتراف کیا کہ عراق کے جنوب میں نصریہ کے قریب ان کی فوجوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ امریکی فوج کے ایک لیفٹیننٹ جنرل کا کہنا تھا کہ 24 مارچ امریکہ کی فوج کے لئے کٹھن ثابت ہوا ہے۔ ذلت ورسوائی سے دوچار امریکہ نے اس روز بمباری میں شہری آبادیوں کو نشانہ بنایا۔ اسی روز آسٹریلیا بھی جنگ میں کود پڑا اور آسٹریلین سپیشل ایئر سروسز کے 150 اہلکاروں نے جنگی کاروائی میں حصہ لیا۔ اسی روز بحرین میں امریکی بحریہ کے ہیڈ کوارٹر کے قریب خوفناک دھماکہ ہوا۔

جنگ کے دوران جنوبی عراق میں دریائے فرات کے کنارے ناصریہ میں اتحادی فوج کو شدید قسم کے طوفان نے آلیا۔ اس طوفان کے باعث آسمان پر اندھیرہ چھا گیا، اس دوران عراقی گروپ اتحادیوں پر فائرنگ کرتے رہے۔ اس طوفان میں دو امریکی ہیلی کاپٹر تباہ ہو گئے۔ امریکی کمانڈر نے تسلیم کیا کہ بغداد کے قریب ری پبلکن گارڈ پر فضائی حملے کرنے والا امریکی اپاچی ہیلی کاپٹر لاپتہ ہے اس کے عملے کے ارکان کا بھی پتہ نہیں۔ اس روز عراقی ٹیلی ویژن نے دونوں پائلٹوں کو جنگی قیدی کے طور پر پیش کر دیا۔

مختلف محاذوں پر زبردست مزاحمت کے نتیجے میں بھاری نقصان اٹھانے کے بعد امریکی فوج نے بغداد کو ٹارگٹ بنایا۔ امریکی اور برطانوی فوج کی ہائی کمان اس

حقیقت کو پا کر حیران و ششدر تھی کہ کرکوک میں مسلسل 24 گھنٹوں کی بمباری اور بصرہ پر ہزار پونڈ وزنی ہولناک تباہی لانے والے بموں کی بارش کے باوجود ایک بھی عراقی فوجی نے ہتھیار نہیں ڈالے، جبکہ عراقی ملیشیا نے 3 ہیلی کاپٹر مار گرائے۔ بش کی فوجوں نے بغداد، موصل اور دیگر شہروں پر کلسٹر بموں سے وحشیانہ انداز میں شہری آبادیوں پر بمباری کی۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے حوالے سے ایک خبر رساں ایجنسی نے بتایا کہ امریکی اور برطانوی فوجیوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جونہی ہمارے ٹینک عراق کے شہروں میں داخل ہوں گے تو 1944ء کے فرانس کی طرح لوگ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئیں گے، اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے ان کا استقبال کریں گے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اب قدم قدم پر ان کو شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔ ایسی ہی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ناصریہ پر بمباری سے دس شہری شہید ہوئے مگر جب دو امریکی فوجیوں کی لاشیں بھی لائی گئیں تو عراقی شہری اپنا غم بھول کر باغ باغ ہو گئے۔

روس نے مسئلہ کے حل کے لئے ایک تین نکاتی فارمولا پیش کیا، اس فارمولے کے تحت پہلے مرحلے میں عراق میں جنگ بند ہونی چاہیے، اس کے بعد سلامتی کونسل عراق میں اقوام متحدہ کی امن فوج بھیجنے پر غور کرے گی اور آخر میں اسلحہ کے معائنہ کاروں کو عراق جانے کی اجازت دی جائے گی تا کہ وہ یہ دیکھ سکیں آیا عراق میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں کہ نہیں۔ مارچ سے امریکہ نے عراق میں بھی وہی حکمت عملی اپنانے کی کوشش کی جو اس نے افغانستان میں شمالی اتحاد اور طالبان کے مابین اختلافات سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اختیار کی تھی۔ اب وہ عراق کے کردوں کو دانہ ڈال کر جنگ میں شریک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عراقی فوج، ریپبلکن گارڈز اور عوام نے بغداد کو جانے والی چھ میں سے دو شاہراہوں پر خندق کھود دی۔ عراق کے شہری ان اشیاء کو اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے جن سے دشمن کی فوج کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جا سکیں۔

انسانی حقوق اور جمہور کی آزادی کے نام نہاد علمبرداروں نے بغداد اور دوسرے شہروں میں 5 ہزار پونڈ وزنی بنکر شکن بم اور کروز میزائل برسائے مگر اپنے تمام تر بہیمانہ اور

انسانیت سوز حربوں کے باوجود متعدد محاذوں پر ذلت آمیز انداز میں امریکی اور برطانوی فوجوں کو پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا اور عراقیوں نے دشمنوں سے بصرہ ائیر پورٹ چھین کر عراقی پرچم لہرا دیا۔ نجف کے محاذ پر امریکی اور برطانوی فوجیں 50 کلومیٹر پیچھے پسپا ہونے پر مجبور کر دی گئیں۔ اسی روز امریکی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل رک ہاپٹ نے انکشاف کیا کہ عراق جنگ میں مرنے والے اکیس فوجیوں کی لاشیں جرمنی میں رم سٹین کے امریکی اڈے سے خصوصی طیارے کے ذریعے تابوتوں میں بند کر کے ان کے وطن امریکہ اور برطانیہ بھیج دی گئی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عراقی جانبازوں کے ہاتھوں مرنے والے اپنے فوجیوں کی صحیح تعداد پوشیدہ رکھ رہے تھے، کیوں کہ اپنی فوجوں کے جانی نقصان کو منظر عام پر لانے سے انہیں اپنے عوام کی طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا جس کا مقابلہ کرنے کی بش اور بلیئر میں ہمت نہیں تھی۔ اس لئے امریکی جنرل نے یہ تو بتا دیا کہ اکیس لاشوں کو امریکہ اور برطانیہ بھیجا گیا ہے لیکن انہوں نے اس حقیقت کو چھپا لیا کہ مزید بائیس لاشیں اور درجن بھر زخمی بھی جرمنی لائے جا رہے ہیں، جبکہ وہاں کے ہسپتال میں عراق میں زخمی ہونے والے ان کے 25 فوجی پہلے سے زیر علاج تھے۔

دنیا بھر میں امریکی جارحیت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھا، پاکستان میں بھی یوم احتجاج منایا گیا۔ سلامتی کونسل نے اپنے اجلاس میں عراق کے لئے تیل برائے خوراک پروگرام بحال کرنے کی قرارداد منظور کی، لیکن سلامتی کونسل میں منظور کی جانے والی قرارداد میں امریکہ اور برطانیہ کو عراق میں ''قابض قوتیں'' قرار دیا جو ایک ناقابل فہم اقدام تھا یعنی سلامتی کونسل گویا اپنی سلامتی کے لئے بھی امریکہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے کوشاں تھی۔ عراقی عوام اپنے ملک کی سلامتی اور آزادی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے اور امریکہ اور برطانیہ کے بہیمانہ ظلم کا شکار تھے جبکہ سلامتی کونسل نے امریکہ اور برطانیہ کو قابض قوتیں قرار دے کر انہیں لفظوں کی حد تک اس منزل سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی تھی جو ابھی خود امریکہ اور برطانیہ کو بھی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔

عراقی جانبازوں کے ہاتھوں اپنی جنگی حکمت عملی کی دھجیاں اڑتی ہوئی دیکھ کر

امریکہ کی عسکری قیادت اس قدر جھنجھلا چکی تھی کہ اس کے وزیر دفاع رمزفیلڈ نے پینٹاگون میں باقاعدہ ایک پریس کانفرنس میں شام اور ایران کو دھمکی دی اور کہا کہ عراق کو شام کے راستے فوجی ساز و سامان بھیجا گیا ہے جس مین رات کو دیکھنے والی عینکیں بھی شامل ہیں اس سے براہ راست امریکی اور برطانوی فوجیوں کی جانوں کو خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایران سے بھی سینکڑوں انقلابی گارڈز لڑنے کے لئے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں شام کے صدر بشارالاسد نے اس دھمکی کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ جو مرضی کر لے عراق امریکہ کے لئے ویتنام بن جائے گا۔ یہ بغداد کے عوام کی جرأت وشجاعت ہی کی مثال تھی کہ جب یہودو ہنودان پر ایٹم بم کے سوا ہر قسم کے جدید ترین اور خطرناک بموں کی بارش کر رہے تھے تو ایسے میں اس کے نوجوان اپنے وطن کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو کر بغداد کے وسیع وعریض سٹیڈیم میں فٹ بال کا میچ کھیل رہے تھے۔

عراق نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کو مسترد کرنے کا اعلان کیا جس میں عراق کے لئے 2 ارب 20 کروڑ ڈالر کی امداد فراہم کرنے کی منظوری دی گئی تھی جو کہ ''تیل کے بدلے خوراک پروگرام'' کے تحت دی جانی تھی۔ اگرچہ اس کی روس اور شام نے مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ اس سے جنگ کے جواز کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ عراق نے اس قرارداد کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ عراق کا تیل عراقی عوام کی ملکیت ہے کسی کو بھی اس کا انتظام چلانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا انتظام عراق کے پاس ہونا چاہئے۔

جنگ کی وقایع نگاری کرنے والوں کا کہنا تھا کہ عراق نے اس بار جو حکمت عملی اختیار کی تھی اسے امریکی سمجھ نہیں پائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کی ابتداء ہی میں اتحادی فوج کو عراقی مزاحمت سے جو دھچکا لگا ہے اس سے وہ سیخ پا ہیں ایسا لگتا ہے کہ جنگ کی تپش وائٹ ہاؤس میں بھی محسوس کی جارہی ہے۔ اس صورت حال سے بھنا کر بش نے مزید ہلاکت خیز اسلحہ استعمال کرنے کا حکم دے دیا۔ اس اسلحہ میں سب سے اہم وہ کلسٹر بم تھا جسے بموں کی ماں کہا جاتا ہے۔ امریکہ افغانستان کی طرح عراق میں کارپٹ بمباری نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ صدام حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا لہٰذا تباہی کے حوالے سے اس کی حکمت عملی افغانستان سے مختلف تھی۔ وہ عراقی حکومت کے خاتمہ

کے لئے اس کے اہلکاروں اوراس کی حامی افواج کا خاتمہ تو کرنا چاہتا تھا لیکن اپنے تعلقات عراقی عوام سے نہیں بگاڑنا چاہتا تھا تاکہ صدام حسین کے بعد بننے والی حکومت کی مخالفت کم سے کم ہو۔اس صورت حال میں یہ جنگ کب تک جاری رہے گی اس کے بارے میں وائٹ ہاؤس میں کئی مفروضوں پرغور کیا جارہا تھا۔

ناصریہ کی لڑائی کے بعد امریکیوں کے لئے شرمندگی کی جو صورت حال پیدا ہوئی اس پر صدر بش سے لے کر رمزفیلڈ تک جس کا بھی ردعمل آیا اسی نوعیت کا تھا۔یہ امر بھی نہایت دلچسپ تھا کہ بش عراق پر جنگ مسلط کرنے کا حکم دے کر چھٹیاں منانے کے لئے کیمپ ڈیوڈ چلا گیا۔جب صورت حال بدلی تو اس کے لئے واپسی ناگزیر ہوگئی۔واپس آ کر بش نے وائٹ ہاؤس میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ایسا نہیں ہے کہ جنگ میں ہماری کارکردگی بہتر نہیں ہے، ہماری افواج کی کارکردگی نہایت موزوں اور مناسب ہے، اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ،لیکن یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہ جنگ طویل اور ہمارے نقطہ نظر سے مشکل بھی ہوسکتی ہے۔

خود مغربی تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ صدام کے منظر سے ہٹتے ہی عراق میں طوفان بدتمیزی برپا ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ عراق کی آبادی مذہبی اور لسانی اعتبار سے کئی گروہوں میں تقسیم ہے اور یہ گروہ خود اپنے اندر بھی تقسیم در تقسیم ہیں۔ایک اندازے کے مطابق اس وقت عراق سے باہر جو لسانی ،سیاسی اور مذہبی گروپ سرگرم عمل ہیں ان کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے اور جو گروہ عراق میں زیرزمین کام کر رہے ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں اور یہ وہ گروہ ہیں جو مسلح رضا کار بھی رکھتے ہیں۔لہٰذا امریکیوں کا ایک اہم سردرد یہ ہے کہ صدام کے بعد کا سیٹ اپ کیا ہوگا۔

جنگ کے ابتدائی دنوں میں اور بعد میں بھی بش نے کہا تھا کہ صدام کے بعد عراق میں ایک عبوری فوجی حکومت بنے گی ، جس کے سربراہ جنرل ٹومی فرینکس ہوں گے۔جب یہ منصوبہ سامنے آیا تو عراق کے جلاوطن گروپوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ایک گروپ نے یورپ اور امریکہ میں ایک مہم چلادی اور ای میل کے ذریعے بھی یورپ اور امریکہ کی اہم شخصیات کو آگاہ کیا کہ مستقبل میں عراق کی وہ حکومت جو ٹینکوں پر بیٹھ کر بغداد میں آئے گی نہ

عوام کے لئے قابل قبول ہوگی اور نہ زیادہ دیر تک چل سکے گی۔

ایک بین الاقوامی تحقیقاتی ادارے انٹرنیشنل کرائسیس گروپ کے مشرق وسطی کے ڈیسک کے انچارج رابرٹ مالی نے عراق کے حالات کے گہرے مطالعے کے بعد رائے دی کہ صدام کے بعد مقامی لوگوں پر مشتمل ایسی حکومت بنائی جائے جسے فوج کی حمایت حاصل ہو لیکن اس حکومت میں جلا وطن گروپوں کو شامل کرنے کی غلطی نہ کی جائے، کیوں کہ وہ حکومت اور اتحادیوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں گے۔ امریکی حکومت یہ غلطی تو ہرگز نہ کرے کہ وہ اپنے کسی جرنیل کی قیادت میں حکومت بنا ڈالے اس کی مخالفت کثیر الاطراف ہو گی، اولاً اندرون ملک، ثانیاً جلاوطن عراقی، ثالثاً دنیا بھر کی حکومتیں اور عوام۔

کونسل آف فارن افیئرز کے مشرق وسطی کے شعبے کے ماہر جوڈتھ کیر کا کہنا تھا کہ عراقیوں کے بارے میں آپ نے جو اندازے بھی لگائے ہوں وہ اپنی آزادی اور قوم پرستی پر سمجھوتہ کسی قیمت پر نہیں کریں گے۔ اس جنگ کے بعد فتح مند خواہ امریکہ ہی کیوں نہ ہو اسے عراقی عوام کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عراق کے خلاف امریکہ اور برطانیہ کی جارحیت کو پندرہ روز گزرنے کے باوجود اتحادیوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ مغربی میڈیا پورے زور وشور سے فوجی مقاصد میں ناکامی کو ''میڈیا وار'' کے ذریعے کامیابی میں بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تک کی صورت حال نے ثابت کر دیا تھا کہ عراقی عوام سے کی جانے والی توقعات ایک فیصد بھی پوری نہیں ہوئیں۔ ان حالات میں بغداد پر شمال کی طرف سے چڑھائی بہت ضروری ہوگئی تھی لہٰذا شمالی عراق میں کردوں کے زیر کنٹرول علاقے میں 173واں چھاتہ بردار بریگیڈ اتارا گیا۔ اتحادیوں کا دعویٰ تھا کہ ان فوجوں نے ائیر فیلڈ پر قبضہ کر لیا ہے۔ ائیر فیلڈ کا کنٹرول حاصل کر لینے کے بعد اتحادی کارگو طیاروں کے لئے اس علاقے میں تیزی سے فوج اور بھاری ہتھیار اتارنا آسان ہوگیا۔ جس کے بعد شمال سے بغداد کی طرف پیش قدمی ممکن ہوگئی۔

شمال سے حملے میں تاخیر ترکی کی وجہ سے ہوئی جس نے حملے کے لئے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس وقت بڑی تعداد میں ترکی فوج عراق ترک سرحد پر

تیار کھڑی تھی۔ اتحادی ذرائع کا کہنا تھا کہ قبضہ شدہ ائیر فیلڈ پر فرسٹ انفنٹری ڈویژن کے جوان اور ہتھیار پہنچانے کے لئے طیارے روانہ ہو چکے ہیں۔ امریکہ کرد علاقے سے کم از کم ایک ڈویژن فوج جمع کر کے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس فوج کو صدام مخالف کرد باغیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔

امریکی حکومت اور اس کے اتحادی اس بات کا رونا رو رہے تھے کہ عراقی فوجی انہیں دھوکے اور فریب کے جال میں پھنسا کر ٹھکانے لگا رہے ہیں۔ ایک اعلیٰ امریکی فوجی افسر کا کہنا تھا کہ عراقی فوجی سول کپڑوں میں سامنے آ کر سفید پرچم بلند کرتے ہیں جو اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں مگر جب اتحادی فوجی نزدیک آتے ہیں تو سول کپڑوں میں عراقی فوجی انہیں گولیوں سے بھون دیتے ہیں۔ امریکی فوجی افسر کا کہنا تھا کہ یہ فاؤل پلے ہے، حالانکہ اسے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی جو کچھ کر رہے ہیں اور یہ ساری صیہونی قوتیں جس طرح سے مل کر اکیلے عراق پر آگ برسا رہی ہیں کیا وہ فاؤل پلے نہیں ہے؟

امریکی اور برطانوی افواج اس جنگ میں جو جدید ترین ہتھیار استعمال کر رہی تھیں اس سے پہلے کسی جنگ میں استعمال نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اتحادی افواج کھلے میدانوں میں عراقی افواج سے جنگ کرنے سے گریز کر رہی تھیں۔ عراقی عوام کے ہتھیار اٹھا لینے کی بنا پر اب یہ لڑائی چھاپہ مار جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ہر محاذ پر گلی کوچوں اور صحراؤں میں عراقی شہریوں نے اتحادیوں پر کئی کامیاب حملے کئے۔ عراقی عوام نے چھاپہ مار جنگ کی حکمت عملی کے تحت خندقیں کھود کر ان میں پٹرول بھر دیا تھا تا کہ حملہ آور اتحادی فوجوں کو پیش قدمی سے روکا جا سکے۔ امریکہ نے روس پر الزام عائد کیا کہ وہ عراق کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے اور اس طرح اتحادی افواج کی سلامتی کو خطرہ ہے۔ 6 ارب ڈالر رشوت کی پیش کش کے باوجود عراق پر حملے کے لئے ترکی کی سرزمین کا دستیاب نہ ہونا بھی امریکی منصوبہ سازوں کے لئے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔

جنگ کے دوران اتحادی مسلسل اس کوشش میں تھے کہ صدام حسین کو نشانہ بنایا

جائے جہاں بھی ذرا سا شک ہوتا وہاں اندھا دھند بمباری کردی جاتی، صدام کے بیش
صدارتی محل راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ اتحادی کمانڈروں کا خیال تھا کہ صدام حسین اپنے
کسی خصوصی بنکر میں چھپے ہوئے ہیں جو انہوں نے اسی مقصد کے لئے ہی بنوائے
تھے۔ امریکیوں کے لئے ایک پریشانی کی بات یہ بھی تھی کہ عراق قدیم ترین تاریخ کا
آئینہ دار ہے اور یہاں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں زیر زمین سرنگوں کا جال بچھا ہوا
ہے۔ نجف، کربلا اور صدام حسین کے آبائی شہر تکریت کے ساتھ کا قصبہ ایسی سرنگوں کا
گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے ان دنوں میں اتحادی فضائیہ کئی بنکروں کو نشانہ بنا چکی تھی۔
اس مقصد کے لئے ہزاروں پونڈ وزنی بنکر شکن بم استعمال کئے گئے مگر امریکی ماہرین کو یہ
یقین نہیں تھا کہ ان بموں نے ان بنکرز کو مکمل طور پر تباہ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اتحادیوں کا خیال
تھا کہ صدام حسین ایسے ہی کسی بنکر میں پوشیدہ ہیں اور وہیں سے تمام معاملات کنٹرول کر
رہے ہیں۔ عراقی ٹی وی پر دکھائی جانے والی تمام میٹنگز کے بارے میں اتحادیوں کا دعویٰ تھا
کہ یہ پرانی ریکارڈنگز دکھائی جا رہی ہیں جبکہ عراقی ٹی وی کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ یہ میٹنگز نئی
ہیں۔ یہ ابہام اس وقت دور ہوا جب عراق کے صدر صدام حسین کو اچانک عراق کی سڑکوں پر
نکل آئے اور لوگوں سے گھل مل گئے۔ ان کی سڑکوں پر آمد اتنی اچانک تھی کہ وہ جہاں بھی گئے
لوگ انہیں اپنے درمیان پا کر حیران رہ گئے اور ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اپنے اس دورے
کے دوران صدام حسین مسلسل لوگوں کے حوصلے بڑھاتے رہے اور انہیں اس بات پر
اکساتے رہے کہ وہ جارح فوج کی بھرپور مزاحمت کریں۔

صدام حسین کا اس طرح سڑکوں پر نکل آنا اور وہ جس طرح ہشاش بشاش اور پر
سکون نظر آ رہے تھے وہ سب کے لئے حیرانی کا باعث تھا اور خصوصاً اس سے اتحادیوں کو
خاصی پریشانی لاحق ہوگئی کیوں کہ اس سے عراقی عوام کا مورال بلند ہو گیا جبکہ دوسری طرف
اتحادیوں پر اس کا برا نفسیاتی اثر پڑ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ بغداد مسلسل اتحادی
طیاروں اور میزائل حملوں کی زد میں تھا صدام کا یوں باہر نکل آنا اتحادیوں کے لئے مضبوط
اور سخت پیغام تھا کہ وہ خوف زدہ نہیں ہیں بلکہ پورے عزم کے ساتھ اتحادیوں کی مزاحمت کا
ارادہ رکھتے ہیں۔

7 اپریل کی صبح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اتحادی افواج نے بغداد پر قبضے کے لئے فیصلہ کن معرکے کا آغاز کر دیا ہے۔ ایک روز قبل اتحادی فوج کے ایم ون ٹینک اور بریڈ لے بکتر بند گاڑیاں پہلی مرتبہ بغداد شہر میں داخل ہوئی تھیں۔ ایک امریکی کمانڈر نے کہا تھا کہ اس ایکشن کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اتحادی افواج جب چاہیں بغداد میں داخل ہو سکتی ہیں۔ پورا بغداد شہر گزشتہ دو دن سے اتحادی فضائیہ کی شدید بمباری کی زد میں تھا۔ ان بموں کا نشانہ عراقی فوج کی اہم تنصیبات تھیں۔ بصرہ گزشتہ پندرہ سولہ دنوں سے لڑائی کی زد میں تھا اور عراقی فدائین شدید مزاحمت کر رہے تھے چنانچہ اتحادی شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اسی طرح کربلا میں بھی شدید لڑائی جاری تھی۔ شمالی عراق میں اتحادیوں کو کرد باغیوں کی شکل میں مضبوط اتحادی مل گیا تھا۔ اتحادی اب خوش تھے کہ کرد اب شمالی عراق میں افغانستان کے شمالی اتحاد کا سا کام کریں گے، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ امریکی جانی نقصان کم سے کم ہوگا۔ مگر امریکی چھاتہ برداروں کو اس وقت ایک شدید دھچکا لگا جب ان کے ایک قافلے پر امریکی طیارے نے بم گرا دیا جس سے کم از کم 12 فوجی ہلاک ہو گئے۔

عراق پر امریکہ کا قبضہ انہونی بات نہیں تھی تجزیہ نگار اور عسکری ماہرین اس بات کا اندازہ لگا چکے تھے کہ جلد یا بدیر صدام حسین اقتدار میں نہیں رہیں گے اور عراق کے تیل اور تمام معدنی وسائل پر اتحادی فوجوں کا قبضہ ہو جائے گا البتہ اتحادی فوجوں کے ابتدائی حملوں کے بعد صدر صدام حسین کی حکمت عملی ضرور پوری دنیا کے لئے حیران کن تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ بغداد میں معرکہ آراء جنگ ہوگی اور اتحادی فوجوں کے دانت کھٹے ہو جائیں گے یا وہ ایسی مار کھائیں گے کہ آئندہ کسی ملک پر چڑھائی کی ہمت امریکہ صدیوں تک نہیں کر سکے گا مگر حالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ تمام اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جس شدید مزاحمت کی بات کی جا رہی تھی وہ یکلخت ختم ہو گئی اور اتحادی فوجیں غرور و تکبر کے سے انداز میں بغداد کی سڑکوں پر نکل آئیں۔ دراصل صدام حسین نے یکطرفہ طور پر جنگ بندی اور زیر زمین جانے کا فیصلہ کر کے اپنی بعث پارٹی اور ریپبلک گارڈز کو تباہ ہونے سے بچانے کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ اس طرح انہوں نے طویل گوریلا وار شروع کرنے کی

ابتداء بھی کر دی تھی، یہ ایک کامیاب حکمت عملی تھی جس کے نتیجے میں صدام حسین نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ناکوں چنے چبوائے۔اس جنگ کے خاتمے کے بعد امن معاہدہ کیا ہوتا کیوں کہ معاہدہ تو دو قوتوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن یہاں تو صرف فاتح موجود تھا اور سب کچھ اسی کی خواہشات کے تابع تھا۔چنانچہ 23 فروری 2003ء کو عراق میں منعقدہ ایک کانفرنس میں صدام مخالف نمائندے شریک ہوئے جو عرصہ دراز سے امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ان لوگوں پر مشتمل ایک گورننگ کونسل قائم کر دی گئی جن میں سات سیاسی جماعتوں کے علاوہ مختلف مذہبی اور نسلی گروپ شامل تھے۔اس عبوری کونسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ وزراء وسفیروں کا تقرر، بجٹ کی منظوری اور نئے آئین کی تشکیل کے لئے ایک ادارے کا قیام عمل میں لائے۔

------✡------

چار خفیہ معاہدے

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں خود غرض شاطر و مکار بڑی طاقتوں کے درمیان ایسے چار خفیہ معاہدے طے پائے جن کے نتائج و عواقب اور مضمرات نے دنیا کے سیاسی میدان میں اتنے نشیب و فراز پیدا کیے اور وسیع و عریض عالمی نقشے کو مصر میں برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری میکماہن نے اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ خفیہ معاہدے سفید چمڑی والے سوداگر حکمرانوں، انگریز جیسی نزاکت، نفاست، آداب اور رکھ رکھاؤ کے علمبردار فرانسیسیوں، اکھڑ مزاج روسیوں اور اٹلی اور امریکہ کے مابین شکست خوردہ سلطنت ترکیہ کے مفاد پرستانہ حصہ بخری اور عربوں سے کیے گئے مکارانہ وعدوں کو ہاتھی کے دانتوں کے مصداق پورا کرنے کے لئے ترتیب دیئے گئے، لیکن اس طرح کہ مفتوح و معتوب ترک مسلمان تو ان سے بے خبر رکھے ہی گئے لیکن فاتح اور اتحادی عرب مسلمانوں کو بھی ان کے پس پردہ رازوں اور سیاسی مصلحتوں سے مکمل طور پر اندھیرے میں رکھا گیا۔ حالت یہ تھی کہ سائیکس پیکو معاہدہ کے بارے میں عربوں کو چھ ماہ بعد علم ہوا کہ ان سے بالا بالا ایک سنگین معاہدہ ترتیب و تکمیل کے مراحل بھی طے کر چکا ہے۔

جنگ عظیم اول میں ایک طرف نمایاں فریقین جرمنی، ترکی تھے (اٹلی بھی بعد میں ان کے ساتھ رہا) جنہیں محوری طاقتیں کہا جاتا ہے اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے جنہیں اتحادی کا نام دیا گیا ہے۔ پہلی عالمگیر جنگ کی فی الواقع ابتداء اگست 1914ء کو ہوئی لیکن اتحادیوں کے مکر و فریب اور لالچی نظروں کا عالم یہ تھا کہ 1915ء ہی میں ان کے درمیان سمجھوتے اور قول و قرار ہونا شروع ہو گئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان معاہدوں کی بعض شقیں اور کڑیاں ایک دوسرے کی صریح تردید و تکذیب کرتی ہیں بایں ہمہ ان کا مقصد کلی طور پر سلطنت ترکیہ کا انتشار تھا۔

اس زمانے کی سلطنت ترکی کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے بڑی طاقتوں کی اس

میں دلچسپی خالص عسکری نوعیت کی تھی۔ روس ایک عرصے سے اس خطۂ عالم پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے اہم حصوں پر اس کا تسلط ہو اور اس طرح ترک مسلمانوں کو زک پہنچائے اور سلطنت کو ختم کرے۔ برطانیہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ انگریز ترکی کی نہام نہاد حفاظت کی آڑ میں اپنے مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں ڈپلومیسی کا چکر ختم کرنا چاہتے تھے اور اب وہ اپنی روایتی سودے بازیوں میں اپنے ہی اتحادیوں کو بھی پیچھے رکھنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ معاہدوں کی نوعیت فوجی ہونے کے علاوہ انتہائی سیاسی بھی تھی۔ روس قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) اور اہم فوجی مقامات پر کنٹرول چاہتا تھا۔ اتحادیوں نے اٹلی کو محوری گروپ سے دور رکھنے کے لیے اسے سیاسی اور علاقائی مفادات سے بہرہ ور کرنے کے لیے بظاہر بڑے شاندار وعدے کیے تھے جو بلاشبہ ترکی ہی کی قیمت پہ تھے۔ یہی حال یونان کا تھا۔ آخری نمبر پر برطانیہ اور فرانس اپنے اپنے مطالبات کے ضمن میں ہم آہنگی ضروری سمجھتے تھے برطانیہ کو یہ احساس بھی تھا کہ بیدار اور جذبہ قومیت سے سرشار عربوں اور دغا باز یہودیوں سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے۔ چنانچہ ان محلولہ بالا کوائف اور حالات سے بطریق احسن لپٹنے کے لیے بڑی طاقتوں نے آپس میں یہ معاہدے کیے۔

معاہدہ قسطنطنیہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۵ء:

اس میں روس ایک طرف تھا تو برطانیہ اور فرانس دوسری جانب طے یہ پایا کہ قسطنطنیہ باسفورس کا مغربی ساحل بحیرہ مرمارا اور درہ دانیال کے ساتھ دوسرے متعدد اہم ضمنی علاقے روس کو پیش کر دیے جائیں۔ جب کہ جواب میں اس نے ترکی اور ایران وغیرہ سے متعلق برطانوی اور فرانسیسی وعادی کو پذیرائی بخشی۔ قسطنطنیہ کو اتحادیوں کے لیے آزاد بندرگاہ بنایا گیا۔ یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے عرب سمیت مقدس مقامات کو ترکی سے الگ کر کے ایک آزاد مملکت کے تحت کو دیا جائے گا۔

معاہدہ لندن ۲۶ اپریل ۱۹۱۵:

لندن کے مقام پر برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی کے خاص ایلچی ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھے اس معاہدہ میں اٹلی کو خوش کرنا، مقصود تھا کہ اس نے آخر اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اس معاہدہ کا آرٹیکل انتہائی اہم ہے۔ جس میں وضاحت کے ساتھ اٹلی کو سبز باغ دکھائے گئے

اور اس کے حقوق کو تسلیم و قبول کرنے کے لیے ذرا تصریح سے وعدے بھی کیے گئے۔ چنانچہ جب اٹلی نے اپنا اطمینان کر لیا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے ۲۰ اگست ۱۹۱۵ء کو ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

سائیکس پیکو معاہدہ:

سرکاری طور پر یہ معاہدہ حتمی شکل میں ۱۶ مئی ۱۹۱۶ء کو مکمل ہوا۔ جس کا سیدھا سادا مگر بنیادی اور اصل مقصد یہ تھا کہ چونکہ روس اور اٹلی کو تو مندرجہ ذیل بالا دو معاہدوں کے ذریعے مطمئن اور ان کا اعتماد حاصل کیا جا چکا ہے۔ اس لیے فرانس اور برطانیہ کو بھی اس مرحلے پر اپنے اپنے دعاوی کو آخری رنگ دینا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء کے آخر میں اس کے لیے بھی مساعی شروع ہو گئیں۔ برطانیہ نے مصنف، سیاح اور مشرقی سیاسیات کے مستند ماہر سر مارک سائیکس کو اور فرانس نے موسیر الیف جارجز پیکو کو بات چیت کے لیے آگے بڑھایا۔ موسیو پیکو عالمگیر جنگ چھڑنے سے قبل شام میں قونصل جنرل کے طور پر کام کر چکے تھے۔ یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ اس اثنا میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف شریف حسین آف مکہ سے بھی مدد کے حصول کی خاطر گفت و شنید شروع کر دی ہوئی تھی۔ فرانس کے معاملے کی متوقع نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے حقوق و مطالبات پر زور دیا۔ روس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے دونوں متذکرہ برطانوی اور فرانسیسی نمائندے ۱۹۱۶ء نے موسم بہار میں سینٹ پیٹرز برگ (روس) گئے اور اس سے معاہدہ کی منظوری اس نشان زدہ علاقہ وہ آزاد عرب مملکت ہے جس کی سرحدوں کا تعین شریف حسین نے ہنری میکماہن کے نام ۱۴ جولائی ۱۹۱۵ء کے مکتوب میں کیا تھا شکل میں لی کہ روس کے مزید چند مطالبات کو بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن اس معاہدے کو اس حد تک صیغہ راز میں رکھا گیا کہ اٹلی کے علاوہ شریف حسین کو بھی اس کی ہوا نہ لگنے دی گئی۔

معاہدہ کی رو سے طے پایا کہ جنگ میں کامیابی کی شکل میں فرانس کو شام کا ساحلی علاقہ، اڈانا کی ولایت اور دوہرے مخصوص (اور معاہدے کے مطابق) علاقے دیئے جائیں گے۔ جب کہ برطانیہ کو بغداد، حائیفہ اور فلسطین میں عکر کی بندرگاہوں سمیت سارا جنوبی پوٹیمال جائے گا اور فرانسیسی اور برطانوی علاقوں کے درمیان جو خطہ اراضی ہوگا اس پر ایک

آزاد عرب مملکت قائم کی جائے گی سکندریہ کو آزاد بندرگاہ اور فلسطین کو بین الاقوامی درجہ دینے کا فیصلہ بھی اسی خفیہ معاہدے میں تھا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ۱۹۱۷ء کے آغاز میں انتہائی رواداری اور احتیاط برتنے کے باوجود اٹلی کو کسی نہ کسی طرح اس معاہدے کی شرائط کا علم ہو گیا۔ اس نے ایشیائے کوچک میں اپنے مطالبات کے تحفظ کی خاطر دوبارہ ایک ٹھوس واضح اور مدلل معاہدے کا مطالبہ کیا۔ چوتھا معاہدہ ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آخر میں ایک معاہدہ اور بھی ہے جسے کلیمنشر لائیڈ جارج معاہدہ کہا جاتا ہے۔ جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں لندن میں فرانس اور برطانیہ کے وزرائے اعظم کے مابین براہ راست طے پایا۔

شریف حسین آف مکہ (برصغیر کے بعض مسلمان حلقے اس کی ذات کو بڑا ہدف تنقید بناتے ہیں) اور برطانیہ کے مابین علیحدہ طور پر بھی طویل مذاکرات اور خط و کتابت ہوئی۔ وسیع سلطنت عثمانیہ کے تحت عربوں میں نیشلزم کے آثار ۱۹۱۵ء سے بہت پہلے نظر آنے لگے تھے ترکی مین انقلاب ۱۹۰۸ء سے اکثر عرب زعما، ورہنما بھی متاثر ہوئے تھے۔ مگر ان کی ینگ ترک تحریک سے تمام امیدیں بے سود ثابت ہوئیں۔ پھر جب قلیل مدت کے بعد ترکی میں نئے دستور کا اعلان کیا گیا تو عربوں کی آزادی کے لیے مصروف عمل لیڈروں کو سیاسی سرگرمیوں کا جواز مل گیا۔ اس زمانے میں سلطنت عثمانیہ کے عربی صوبوں نے پارلیمنٹ ہیں جو نمائندے بھیجے انہوں نے اپنے حقوق و مفادات کے لیے بڑا کام کیا سیاسی تنظیمیں قائم ہوئیں ان میں دو انجمنیں، الفتاۃ اور العہد خفیہ طور پر دو مختلف جگہوں پر عربوں کی آزادی کے لیے موثر کام کر رہی تھیں۔ حکومت ترکی کو بھی حالات کی نزاکت کا احساس تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں پیرس میں عربوں کی کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس میں حکومتی پارٹی کا بھی ایک نمائندہ شامل ہوا اور عربوں کی قومی تحریک کو تسلیم کر لیا گیا۔ مگر بعض مصلحتوں کے تحت عربوں کو ابھی زیادہ عملی پذیرائی نہیں ہوئی تھی کہ عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انگریزوں کو عربوں کے نئے احساسات کا علم تھا انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا یعنی ترکوں کے خلاف عربوں کی فوجی امداد کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

یہاں اس امر کی تردید ضروری ہے کہ عربوں میں قومی تحریک پیدا کرنے میں ٹی۔ ای۔ لارنس (لارنس آف عریبیا) کا کوئی ہاتھ نہیں وہ انگریز کی بساط سیاست پر محض عربوں کا

اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک شاندار مہرہ تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو برطانوی وزیر جنگ لارڈ کچز نے قاہرہ میں برٹش، ایجنسی کو فوراً ٹیلی گرام بھیجا کہ اگر عرب جنگ میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیں تو برطانیہ ان کی جدوجہد آزادی میں حمایت کرے گا۔ لارڈ کچز کا یہ خفیہ پیغام شریف حسین کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مکہ میں دیا گیا۔

حسین ۱۹۰۸ء سے امریکہ کے خلاف چلا آ رہا تھا۔ حسین کے دولڑکے امیر عبداللہ اور امیر افضل بھی اپنی اپنی جگہ عرب نیشلزم کے لے بڑا فعال کردار ادا کر رہے تھے امیر عبداللہ (جو بعد میں یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو شرق اردن کی مملکت کے بانی بنے) فروری ۱۹۱۴ء میں جب قاہرہ گئے تو انہوں نے لارڈ کچز (جو وزیر جنگ بننے سے قبل اس وقت مصر میں ہائی کمشنر تھا) سے عربوں کی تحریک آزادی کے لیے دوٹوک بات چیت کی جنگ تیز ہونے لگی تو لارڈ کچز نے سوڈان کے گورنر سر رجنالڈ ونگیٹ اور مصر میں اپنے جانشین ہائی کمشنر سر ہنری میکماہن (اس نے جنوری ۱۹۱۵ء میں عہدہ سنبھالا) کو شریف حسین سے مسلسل رابطہ قائم رکھنے کی فوری ہدایت کا حسین کا تیسرا لڑکا فیصل برطانوی چالوں اور ہتھکنڈوں سے محتاط رہنا چاہتا تھا (فیصل نے ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو مملکت عراق میں عنان اقتدار سنبھالی) لیکن واقعات اسی تیزی سے آگے بڑھے کہ معاہدوں تک نوبت جا پہنچی۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ فیصل اصلاً ترکوں کا حامی و مؤید تھا۔ مگر ۱۹۱۵ء کے موسم بہار میں دمشق کا دورہ کرنے کے بعد فیصل نے اپنے نظریات بالکل بدل لیے۔ چنانچہ ایک طرف قاہرہ اور دوسری جانب دمشق میں عربوں نے جنگ میں شرکت کے لیے اور اپنی شرط منوانے کے لیے حتمی اور قطعی معاہدوں کا مطالبہ کیا۔ دمشق میں عرب لیڈروں نے ایک مسودہ شرائط مرتب کر کے اواخر مئی میں جواں سال فیصل کے سپرد کیا کہ اپنے والد شریف حسین تک پہنچا دیں۔ اس مرحلے کے بعد حسین نے ۱۴ جولائی ۱۹۱۵ء (۲ رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ) کو ایک خط کے ذریعے دستاویز دمشق کی روشنی میں برطانوی ہائی کمشنر مقیم قاہرہ کی جنگ میں شرکت کی شرائط لکھ بھیجیں۔

دمشق میں الفتاۃ اور الفہد کے سربراہ اصحاب نے عرب مطالبات پر مبنی جو متذکرہ دستاویز تیار کی تھی وہ بڑی اہم ہے اس کی شرائط یہ تھیں کہ:

☆ برطانیہ ان حدود کے اندر واقع عرب ممالک کی آزادی تسلیم کرے جو (عدن کے سوا) عربوں کی بیان کی ہوئی سرحدوں اور ایشیا کے تمام عرب علاقوں پر مشتمل ہیں۔

☆ معاہدوں کے تحت غیر ملکیوں کو دی گئی تمام مراعات منسوخ کی جائیں۔

☆ برطانیہ اور مستقبل میں ابھرنے والی عرب مملکت کے مابین دفاعی معاہدہ ہو۔

☆ (عربوں کی طرف سے) برطانیہ کو اقتصادی و معاشی ترجیح دی جائے گی۔

شریف حسین کا ۱۴ جولائی کا لکھا ہوا خط قاہرہ میں اگست کی کسی تاریخ کو موصول ہوا، بہر حال برطانوی ہائی کمشنر میکماہن نے دفتر خارجہ کی ہدایت پر ۳۰ اگست ۱۹۵۰ء کو شریف حسین کو جو جواب لکھ بھیجا اس کے بارہ میں تمام غیر جانب دار مبصرین کا کہنا ہے کہ وہ خط معانی و مطالب کے اعتبار سے ابہام کی دبیز تہوں میں لپٹا ہوا ہے اس نے بذات خود نہ کوئی ..... خلاف سازشیں کی جائیں میں عربوں کی نسبت نئی ہرگز نہ رک سکے گی اور ہم اپنے تمام منصوبہ بندی کی گئی تھی پہنچا کر رہیں گے۔ آپ نے کہا کہ تین دن کے بعد اعلان ڈالر کے ایک منصوبہ کی تکمیل کے لیے بحیرہ روم تک گیا تھا۔ اس کے بعد یہ لکھا تھا کہ جنگل سرگرمی کے دوران میں مجوزہ عرب مملکت کے حدوں کے مسئلے پر غور کرنا مشکل ہی سے ممکن ہوگا خصوصاً ایسی صورت ہیں جب کہ ان سرحدوں کے بعض ایسے علاقے ابھی ترکوں کے ماتحت ہیں۔

حسین نے ۹ ستمبر ۱۹۱۵ء (۲۹ شوال ۱۳۳۳ھ) کو خط لکھ کر میکماہن کے لب ولہجہ پر حیرت استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے حتمی وضاحت طلب کی اور بتا دیا کہ برطانیہ کے فیصلہ پر ہی بات چیت کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار ہے، میکماہن اور شریف حسین کے مابین یہ خط و کتابت مجموعی طور آٹھ مراسلات پر مبنی ہے جو مہذب دنیا میں پہلی دفعہ جارج انٹونیس نے اپنی کتاب The Arab Awakening میں دی ہے۔ اس مستفرق نے ان خطوط کا ترجمہ براہ راست عربی سے کیا ہے، برطانوی ہائی کمشنر کا آخری خط قاہرہ سے ۳ جنوری ۱۹۱۶ء کو لکھا گیا اور عربوں نے ۵ جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف اس وقت کھلم کھلا بغاوت کی جب اتحادیوں کو اوپر تلے شکستیں ہو رہی تھیں۔

انگریزوں، فرانسیسیوں اور روسیوں کی باہمی عیاری ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو

صرف انگریز عربوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے خفیہ ملاقاتوں اور تحریری وعدوں میں مصروف..........اس کے ساتھ وہ عربوں کی قطعی لاعلمی میں آپس میں انتہائی خفیہ معاہدے کررہے تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس سلسلے میں عربوں کو بڑی طاقتوں کے جس خفیہ معاہدے نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ سائیکس پیکو معاہدہ (۱۶ مئی ۱۹۱۶ء) ہے اور کوئی بھی ذی عقل وہوش اس معاہدے کو سرسری طور پر دیکھتے ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ سائیکس پیکو معاہدہ میکماہن کے وعدوں کی نفی اور تردید کرتا ہے اور ان علاقوں کو جنہیں برطانیہ متحد کرنے کا اعلان کر چکا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جانا تھا یہی سبب ہے کہ اسے حسین سے مخفی رکھا گیا البتہ مئی ۱۹۱۷ء میں جب سر بارک ایم سائیکس اور جارج پیکو نے جدہ میں شریف حسین سے ملاقات کی تو نہایت سرسری طور پر برائے نام اینگلو فرنچ مفاہمت کا اشارہ دیا گیا، معاہدات کا ذکر تک نہ ہوا۔

معاہدے کو کس شدت اور سختی سے صیغہ راز میں رکھا گیا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگر دسمبر ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب رونما نہ ہوتا تو یہ راز شاید بہت عرصہ تک منصوبہ شہود پر نہ آتا ہوا یوں کہ جب روس میں راز کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور انقلابی گروہ برسر اقتدار آگیا تو اس نے جنگ کے آغاز میں خفیہ معاہدوں کی ان تمام دستاویزات کو شائع کر دیا جو روس وزیر خارجہ سے برآمد ہوئیں ان میں سائیکس پیکر کی دستاویز بھی تھی، ترکی کے حکام نے خفیہ پیامبروں کے توسط سے اس معاہدے کے متن کو شریف حسین تک پہنچایا اور شاطر انگریزوں کی دغابازی اور فریب کا پردہ چاک کیا لیکن اس وقت شریف حسین قریباً چھ ماہ تک معاہدے سے قطعی طور پر لاعلم رہا۔ سائیکس پیکو ایگریمنٹ کو بلا شبہ اپنی نوعیت کا بدترین معاہدہ کہا جاتا ہے جو نہ صرف اتحادیوں کی حرص وہوس کا مظہر ہے بلکہ ڈبل ڈیلنگ کا بھی قابل نفرت شاہکار ہے۔

اس خفیہ معاہدے کی رو سے فرانس برطانیہ اور آخر میں روس کے درمیان سلطنت عثمانیہ کو اس طرح تقسیم کیا جانا تھا کہ ہر ایک کے منہ سے رال ٹپکنا بند ہو جاتی۔ سائیکس پیکر معاہدہ کا ایک انتہائی خطرناک اور ناپاک مقصد یہ تھا کہ ظاہری طور پر عربوں سے کئے گئے وعدوں کو پورا کیا جائے لیکن بباطن ایسی چال چلی جائے کہ ان میں پائیدار اتحاد کا خواب کبھی

شرمندہ تعبیر نہ ہو یعنی ایک متحدہ مضبوط عرب مملکت کی بجائے ایک سے زیادہ عرب طاقتوں کے وجود کو سہارا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عرب مختلف حصوں میں بٹ گئے۔

بات اگر یہیں پہ ختم ہو جاتی تو عرب شائد خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے لیکن بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں ترپ کا ایک اور زبردست کارڈ موجود تھا۔ انگریز ہر قیمت پر جنگ جیتنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ دیکھا جائے تو متذکرہ بالا تمام ظاہر و خفیہ معاہدوں کی آڑ میں انگریز کا دور رس ذہن ہی کارفرما محرک ہے۔ اس نے اگر روس، اٹلی، فرانس اور عربوں کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے مختلف شکلوں میں راغب اور قائل کیا تو جنگ کے بعد وہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی خطے کو سکون اطمینان سے بستا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مسلمانوں سے اسے پرانا بیر ہے، ترپ کا یہ زبردست کارڈ اسلام دشمن اور مسلم آزار یہودی تھے۔

مانچسٹر یونیورسٹی میں کیمسٹری کے ایک یہودی لیکچرار ڈاکٹر شیئم ویزمان نے جنگ کے دوران میں برطانیہ میں نمایاں خدمات انجام دیں جس کے عوض وہ یہودیوں کے لئے ٹھوس مراعات کا طالب ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جدید یہودی تحریک کا اصل بانی تھیوڈور ہرزل ہے جس نے فلسطین کو اپنی قوم کے لئے حاصل کرنے کی امید میں اہم حکمرانوں اور مقتدر شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں وہ سلطان عبدالحمید سے بھی ملا جو ترکی کا سلطان اور فلسطین کا حاکم تھا اور مالی اعانت کا لالچ دے کر یہودیوں کے لئے فلسطین کے عطیہ کی درخواست پیش کی اور کہا ہمارا بے حساب روپیہ عربوں کے سیاسی اضطراب کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے مگر سلطان نے دو ٹوک کہا کہ یہودیوں کو لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس رکھنے دو اگر میری سلطنت ٹکڑے ہوئے تو پھر شائد فلسطین انہیں بلا معاوضہ ہی مل جائے لیکن میری سلطنت کے ٹکڑے میری نعش پر ہی سے گزر کر کیے جا سکتے ہیں۔ میں تقسیم سے اتفاق نہیں کرتا بہر حال یہودی اپنی مسلسل مساعی اور دن رات کی تگ و دو کے بعد انگریزوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دو نومبر 1917ء کو ایک اور شوشہ ”اعلان بالفور“ کی شکل میں سامنے آیا۔

لارڈ اے جے بالفور ان دنوں برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا اس اعلان میں بھی سر مارک سائیکس نے نمایاں حصہ لیا۔ اعلان بالفور نے یہودیوں کو وہ چیز دی جس کے

لئے وہ عرصے سے کوشاں تھے یعنی قانونی ضمانت کے تحت ایک اعلانیہ طور پر مسلمہ وطن ۔عربوں کو جب اس نئے جال کا علم ہوا تو انہوں نے اس پر بڑا اویلا مچایا شریف حسین نے اس کی وضاحت طلب کی لیکن جو ہونا تھا ہو کر رہا یہی وہ اعلان ہے جس کے مطابق بالآخر مختلف مراحل طے کرتا ہوا فلسطین میں یہودیوں کا موعودہ وطن **14** مئی **1948**ء کو باقاعدہ متشکل ہوا۔اعلان بالفور کی زبان مفہوم کے لحاظ سے اس قدر غیر واضح اور مفاد پرستانہ ہے کہ خود برطانوی ارباب حکومت وسیاست نے اس کی متعدد اور متضاد تاویلیں کی ہیں ۔انہوں نے عربوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس کے بعد کئی معاہدے اور دستاویزات تیار کیں لیکن ہر ایک ڈپلومیسی کی دبیز تہیں چڑھائی گئیں ،اور اس طرح عربوں کو جو چوکے انہوں نے شاطرانہ چالوں سے لگائے ان کے مضمرات آج پوری شدومد سے مشرق وسطیٰ میں نظر آتے ہیں۔

------✡------

فلسطین اسرائیل معاہدے

1095ء میں جب صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا تو عیسائی حکمرانوں نے بیت المقدس پر دوبارہ قبضے کی کوششیں شروع کر دیں پیٹر راہب نے یورپی اقوام کو اپنے ساتھ ملا کر بیت المقدس پر قبضے کے لئے ابھارا۔ اس وقت بیت المقدس مصر کے قبضے میں تھا لیکن صلیبیوں نے 15 جولائی 1099ء کو اس پر قبضہ کر کے قتل عام کی انتہا کر دی۔ بالآخر مصر کا سلطان صلاح الدین ایوبی جو 1171ء میں وزیر اعظم بنا نے عیسائی حکومت کا خاتمہ کر کے بیت المقدس کو آزاد کرایا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی فلسطین کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھیننے کے لئے یورپی اقوام کی یلغاریں جاری رہیں لیکن مصر کے مملوک سلاطین الملک المعظم، رکن الدین بیبرس اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہدوں نے دشمن کو ہر بار ناکام لوٹایا۔ سولہویں صدی میں نامور ترک سلطان سلیمان نے فلسطین کو شام، حجاز اور مصر سمیت فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کیا۔ اٹھارھویں صدی کے خاتمے پر نپولین نے فلسطین کا رخ کیا، وہ عراق کے راستے جنوبی ہند کے مسلمان فرمانروا ٹیپو سلطان کے ساتھ مل کر برطانوی سلطنت کی شاہ رگ کاٹنا چاہتا تھا۔ انگریز نے عثمانی سلطان سے درخواست کی کہ اگر آپ ہمیں مصر فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں تو ہم عثمانی سلطنت کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے نپولین سے لڑنے کو تیار ہیں۔ ترکوں اور انگریزوں نے مل کر نپولین کو عکہ میں شکست دی اور جب یہ علاقے فرانسیسی فوج سے خالی ہو گئے تو انگریزوں نے سکندریہ پر قبضہ جما لیا۔ مصریوں نے اس قبضے کے خلاف احتجاج کیا لیکن جلد ہی پورے مصر پر یونین جیک لہرانے لگا۔

1881ء میں زار روس الیگزنڈر دوم کے قتل اور اس قتل کی منصوبہ بندی میں ملوث بعض یہودیوں کے نام سامنے آنے کے بعد پورے روس میں یہودیوں کے خلاف ایک مہم کا آغاز ہو گیا تھا۔ الیگزینڈر سوئم کے دور میں یہودی روس میں ان تمام مراعات سے محروم کر دیئے گئے جو اس کے والد نے انہیں دی ہوئی تھیں۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہودی

غربت اور نسلی امتیاز کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر روس سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔
1881ء اور 1914ء میں جنگ عظیم اول کے شروع ہونے کے درمیانی عرصہ میں تقریباً ستائیس لاکھ پچاس ہزار یہودی جن میں زیادہ تعداد روس سے ہجرت کرنے والے یہودیوں کی تھی امریکہ، کینیڈا اور ارجنٹائن میں آباد ہو گئے۔ ان مہاجرین کی بہت کم تعداد جن میں دو تین فیصد یہودی شامل تھے جو فلسطین میں آباد ہوئے۔ 1492ء میں اسپین سے نکالے جانے والے یہودیوں کے بعد اپنی مقدس سرزمین پر پہنچنے والے یہودیوں کی یہ سب سے بڑی تعداد تھی۔ اس دوران پچپن سے ستر ہزار کی تعداد میں یہودی فلسطین آئے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اپنے روائتی مذہبی شہروں مین آباد ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔ ان میں سے بعض افراد فلسطین کی سخت زندگی اور غربت کی وجہ سے فلسطین سے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جو لوگ فلسطین میں باقی رہ گئے انہیں آج کے جدید اسرائیل کا بانی کہا جا سکتا ہے۔

جدید اسرائیل کے بانی تھیوڈر ہرزل نے جواب سے تقریباً ایک صدی قبل اپنے ایک مشہور پمفلٹ میں یہودی ریاست کے احیاء کا نظریہ پیش کر چکا تھا 1897ء میں باسل میں یہودیوں کی جو پہلی کانفرنس منعقد کی اس میں روس میں آباد یہودیوں نے سب سے زیادہ شرکت کی۔ اس کانگریس میں پہلی بار فلسطین میں ایک وطن کے قیام کی بات کی گئی۔ کانگریس کے انعقاد کے چند روز بعد ہرزل نے اپنی ڈائری میں لکھا: ''اگر میں باسل کانگریس کی روداد کو چند الفاظ میں بیان کروں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ باسل میں میں نے یہودی ریاست کو پا لیا ہے۔ آج میں یہ بات کہتا ہوں تو ساری دنیا میں مذاق کا نشانہ بن سکتا ہوں مگر پانچ سال بعد، ہو سکتا ہے کہ پچاس سال بعد ہر شخص میرے نظریئے سے اتفاق کرے۔''

ہرزل کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی مگر اس نے صیہونی ریاست کے قیام کے سلسلے میں جو بعض دیگر نظریات قائم کئے تھے وہ درست ثابت نہیں ہوئے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک یہودی ریاست کا قیام خود عربوں کے لئے اتنا مفید ثابت ہوگا کہ وہ اس کے قیام کا خیر مقدم کریں گے۔ اس یہودی ریاست کو فوج رکھنے کی بہت کم ضرورت ہوگی۔ اس کے ان خیالات کے برعکس اسرائیل کو ہر وقت اپنی تلوار نیام سے باہر رکھنا پڑتی ہے۔ ہرزل

نے یہودیوں کی مکمل آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ بھی اس اعتبار سے پورا نہیں ہوا۔
اسرائیل کو فلسطین میں بھی نو آبادیات کا سامنا کرنا پڑا۔

ہرزل کو اسرائیل کے قیام کی اپنی ابتدائی کوششوں کے دوران ایک اہم عرب رہنما کی جانب سے ایک انتباہی خط ملا تھا سلطنت عثمانیہ کی پہلی پارلیمنٹ کے ایک رکن اور یروشلم کے سابق میئر یوف دیا الخالدی نے پیرس کے چیف ربی زوڈک کاہن کے ذریعے خط بھیجا تھا اس خط میں کہا گیا تھا کہ صیہونیت کی حیثیت محض ایک خیال اور نظریئے سے زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ فلسطین سلطنت عثمانیہ کا جزو لاینفک ہے اور یہاں لاکھوں ایسے افراد آباد ہیں جو یہودی نہیں ہیں۔ یہ افراد ایک صیہونی ریاست کے قیام کی یقیناً مخالفت کریں گے۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا کہ دولت کے ذریعے فلسطین کو خریدا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے اپنی خط کے آخر میں لکھا: ''خدا کے واسطے فلسطین میں امن قائم رہنے دو۔''

اس وقت تک فلسطین میں یہودی آباد کاروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا یہودیوں نے یہاں زرعی کالونیاں قائم کرنا شروع کر دی تھیں۔ روسی آباد کاروں نے 1882ء میں جافا کے جنوب میں Rishon Le Zoin کے نام سے اس قسم کی پہلی کالونی قائم کی اور صرف پانچ سال کے عرصے میں ایسی مزید نو کالونیاں یہاں قائم ہو گئیں۔ اس دوران یہودیوں اور عربوں کے درمیان تصادم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جس کے دوران کئی اموات بھی ہوئیں۔ 1907ء میں فلسطینی یہودیوں نے اپنے دفاع میں کئی گروپ قائم کر لیے تھے۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر یہودیوں کو برطانوی حکومت کے کئی افراد کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی اسی دوران 1903ء میں برطانوی حکومت کے ساتھ یہودیوں کا ایک تنازع بھی سامنے آیا۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی یہودیوں کو برطانیہ کی جانب سے یوگنڈا میں اپنے لیے ایک علیحدہ وطن قائم کرنے کی پیش کش کی گئی۔ ترکی نے اس دوران جرمنی، آسٹریلیا، اور ہنگری کی حکومتوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انگریز نے صحرائے سینا پار کر کے فلسطین دمشق اور انطاکیہ کے راستے استنبول پر قبضے کا منصوبہ بنایا لیکن عربوں کے بغیر کامیابی ناممکن تھی۔ چنانچہ عربوں کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر دیں تو

جنگ کے بعد انہیں ایک ایسی عرب ریاست کا مالک بنا دیا جائے گا جس کی سرحدیں فلسطین سے عدن تک پھیلی ہوئی ہوں گی۔ اس وقت مصر کو انگریز کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے ترک لشکر کے ہراول دستے غزہ تک آ پہنچے تھے۔ دوسری طرف کرنل لارنس کے اشارے پر برطانوی فوج کے دستے عراق میں اترے اور انہوں نے حجاز کی ریلوے لائن اڑا کر ترکوں کی نقل و حمل کا ذریعہ درہم برہم کر دیا۔ 2 نومبر 1917ء کو برطانوی افواج نے مصر کے راستے فلسطین کی جانب پیش قدمی کی۔ برطانوی وزیر خارجہ اے جے بلفور نے ایک موقع پر ایک مختصر مگر تاریخی نوعیت کا بیان جاری کیا اس بیان میں کہا گیا تھا کہ:

''ہز مجسٹی کی حکومت کی یہ رائے ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی حکومت قائم کی جائے، برطانیہ اس مقصد کے حصول کے لئے کوششیں کرے گا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھی جانی چاہیے کہ فلسطین میں آباد غیر یہودی افراد کے شہری اور مذہبی حقوق کے سلسلے میں کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جائے گی۔ اسی طرح یہودی دیگر ممالک میں جو سیاسی اور دیگر حقوق حاصل کر رہے ہیں وہی حقوق انہیں یہاں بھی حاصل رہیں گے۔''

اس اعلان کے ایک ماہ بعد جنرل سر ایڈمنڈ ایلن بائی یروشلم میں داخل ہو گئے۔ انگلستان، جنوبی افریقہ، ہندوستان، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لشکر فلسطین پہنچے اور بیت المقدس پر یونین جیک لہرا دیا۔ یہ فوج ابھی دمشق میں داخل ہوئی ہی تھی کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں یہودی سائنسدانوں نے اس شرط پر اتحادیوں کا ہاتھ بٹایا کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنایا جائے۔۔۔۔ مگر انگریز نے عربوں سے کیا ہوا وعدہ پس پشت ڈال کر یہودیوں سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور بین الاقوامی انتساب کے بہانے فلسطین پر بلا شرکت غیرے قبضہ کر کے یہودیوں کی آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔

برطانیہ نے اس دوران یہودیوں اور سلطنت ہاشمیہ سے مختلف اور متضاد نوعیت کے وعدے کئے سلطنت ہاشمی نے عرب میں ترکوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ 1920ء میں ہونے والی سان ریمو کانفرنس نے بلفور اعلامئے کی منظوری دی جس کے تحت برطانیہ کو فلسطین اور میسوپوٹیمیا پر حکومت کا اختیار دیا گیا۔ فرانس کو ان علاقوں پر تسلط کا اختیار دیا گیا جو آج لبنان اور شام کہلاتے ہیں۔

1920ء تک عرب دنیا کے ایک بڑے حصے پر انتشار پھیل چکا تھا فرانس نے سلطنت ہاشمیہ کے شہزادہ فیصل کو دمشق سے نکال دیا تھا اور ان کا ایک متحدہ عرب مملکت پر حکومت کا خواب پورا نہیں ہو سکا تھا۔ ان کے بھائی عبداللہ نے دو ہزار مسلح قبائلیوں کے ساتھ شمال کی جانب پیش قدمی کی، برطانیہ اس موقعہ پر فرانس کے ساتھ کسی قسم کا تصادم نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے عبداللہ کو ایک نئے علاقے کا حکمران تسلیم کرلیا اور اس علاقے کو ''ٹرانس جارڈن'' (موجودہ اردن) کا نام دیا۔ یہ علاقہ دریائے اردن کے مشرق میں واقع تھا اور فلسطین کے ایک تہائی رقبے پر مشتمل تھا۔ اسی دوران شہزادہ فیصل عراق کے بادشاہ بن گئے تھے۔ صیہونی عزائم پر اس وقت اوس پڑ گئی جب دریائے لیطان کا علاقہ لبنان کو اور گولان کی پہاڑیوں کا علاقہ اس وقت شام کو دے دیا گیا جب 1920ء میں فلسطین کی سرحدوں کا از سر نو تعین کیا گیا۔

فلسطین کے مستقبل کے سوال پر عرب ملکوں میں کافی بے چینی پائی جاتی تھی، اس لئے برطانیہ نے 1920ء، 1921ء، 1929ء اور 1936ء میں کوشش کی کہ یہودی تارکین وطن کم سے کم تعداد میں اس علاقے میں آئیں۔ اسی دوران یہودیوں نے اپنی ایک خود مختار مملکت اور ''ہیگونا'' کے نام سے اپنی ایک دفاعی فوجی ملیشیا بھی قائم کر لی تھی۔ دوسری جنگ عظیم تک یہودیوں کی تعداد فلسطین کی کل آبادی کے ایک تہائی کے برابر ہو چکی تھی۔

اس بالا دستی کے خلاف فلسطینی عربوں نے 1930ء سے 1936ء تک چار بار بغاوت کی۔ عربوں کو دبانے کے لئے ایک لاکھ گورا فوج فلسطین پہنچ گئی اور پورا ملک قیدی کیمپ بن گیا۔ بیس ہزار عرب شہید ہوئے اور دس لاکھ سے زائد قید خانوں میں ڈال دیئے گئے۔ عربوں کے گھر مسمار کر دیئے گئے اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی کو جلاوطن کر دیا گیا اور انہیں شام میں پناہ لینی پڑی۔ اس مقصد کے لئے برطانیہ کو ہیگونا کی مدد بھی حاصل رہی۔ عربوں سے دہشت پسند صیہونیوں کی مستقل کش مکش نے فلسطین کو ایک ایسا آتش فشاں بنا دیا جو کسی وقت بھی پھٹ کر پورے عالم اسلام کو شعلوں میں لپیٹ سکتا تھا۔

1937ء میں لارڈ ولیم پیلی کی سربراہی میں قائم کی جانے والی ایک کمیٹی نے سفارش کی کہ فلسطین کے پانچویں حصے کے مساوی رقبے پر یہودیوں کی حکومت قائم کی جائے

عرب علاقے ٹرانس جارڈن میں ضم کر دیئے جائیں اور یروشلم، بیت اللحم اور جافا کے علاقے برطانوی تسلط میں ہی رہنے دیئے جائیں۔ رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ آبادیوں کا ایک دوسرے کے علاقوں میں تبادلہ کر دیا جائے۔ یہودیوں نے اس منصوبے کو بادل نخواستہ قبول کر لیا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ سرحدوں کے تعین کے دوران ان کے علاقوں میں توسیع کی جائے۔ یہودیوں نے اس منصوبے کا اعلان ہوتے ہی راتوں رات اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں عربوں نے اس منصوبے کو یکسر مسترد کر دیا جس کی وجہ سے انہیں مسلح یہودی گروپوں کی جانب سے حملوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی برطانیہ کو اس بات کا خدشہ محسوس ہوا کہ اسے اس جنگ میں عرب دنیا کی زیادہ حمایت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ برطانیہ نے ایک منصوبے کے تحت 1939ء میں ایک وائٹ پیپر شائع کیا جس کے تحت یہودیوں پر پانچ سال کے لئے فلسطین آنے پر پابندی لگا دی گئی ان میں وہ یہودی بھی شامل تھے جو نازیوں کے مظالم کی وجہ سے فرار ہو رہے تھے۔ اس وائٹ پیپر میں کہا گیا کہ یہودیوں کی مزید امیگریشن کی اجازت عربوں کی مرضی اور منظوری کے بعد دی جائے گی۔ برطانیہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ یہودیوں کی علیحدہ ریاست کی منظوری عرب ریاستوں کی رضامندی کے بعد اس سال میں دی جائے گی۔ برطانیہ کے ان اعلانات سے یہودیوں کو اپنے تمام منصوبے خاک میں ملتے نظر آئے اور عرب ممالک برطانیہ کے ان اعلانات سے بھی مطمئن نہیں تھے اس لئے مفتی اعظم فلسطین نے ہٹلر کے ساتھ اتحاد کا اعلان کر دیا۔

یہودیوں نے اس موقع پر شدید احتجاج کیا اور برطانیہ کے خلاف ہڑتال کی ہیگونا اور یہودیوں کے دیگر زیر زمین گروپوں نے غیر قانونی طور پر یہودی تارکین وطن کو لانے کے لئے جہازوں کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ 1941ء تک اس علاقے میں برطانیہ کی پوزیشن کافی خراب ہو چکی تھی اسی دور میں برطانیہ اور یہودیوں کے درمیان ایک مرتبہ پھر فوجی تعاون کا آغاز ہوا اور یہودیوں نے اس جنگ سے پورا فائدہ اٹھایا اور لاکھوں صیہونی نوجوان امریکی اور برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر فوجی تربیت حاصل کرنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنوں نے اکتوبر 1942ء میں الامین کے علاقے سے نئے

حملوں کا آغاز کیا اور برطانیہ کو فلسطین کے حوالے سے ایک بار پھر نئے خطرات کا سامنا پڑا۔ برطانیہ کو اب اس بات کا خطرہ تھا کہ عربوں کے ضبط تحمل کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے۔ اس خطرے کے پیش نظر برطانیہ کی ہدایت پر صہونی تنظیم "ہیگونا" ایک بار پھر زیر زمین چلی گئی۔

1944ء کے اوائل میں زبردست تباہی اور مصائب کے ساتھ ہی دو زیر زمین یہودی گروپ "ارگون" اور "ایسٹرن" برطانیہ کے لئے سخت تشویش کا باعث بن گئے۔ ان گروپوں نے علاقے سے برطانوی تسلط کے خاتمے کے لئے جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ان گروپوں نے حکومتی اور پولیس کے دفاتر کو بموں سے اڑا دیا۔ انہوں نے برطانوی فوجی تنصیبات پر حملے کئے اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں برطانیہ کے وزیر مملکت لارڈ میونی کو قتل کر دیا۔ اس دوران یہودیوں کی مسلح مزاحمتی تنظیم ہیگونا نے انتہا پسند یہودیوں کی تلاش کے سلسلے میں برطانیہ کی مدد کی۔

جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد برطانیہ کی لیبر پارٹی کی حکومت نے یہودیوں کو اپنی بقا کے لئے ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا، اسی دوران یہودی تنظیموں کی جانب سے فلسطین میں برطانوی تنصیبات، دفاتر اور پلوں پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں غیر قانونی یہودی تارکین وطن کو لے کر جہاز فلسطین پہنچتے رہے اور انہوں نے برطانوی ناکہ بندی کو ناکام بنا دیا۔ یہ یہودی مسلح تھے انہوں نے پورے ملک میں لوٹ مار اور قتل عام کا بازار گرم کر کے خوف و ہراس پھیلا دیا اور عربوں کو جان و مال کی قربانیاں دینا پڑیں۔ فروری 1947ء میں برطانوی حکومت نے بظاہر فلسطین کے مسئلے سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے اس نے اقوام متحدہ سے کہا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ فلسطین کے مسئلے کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔

اسی سال کے نومبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو تقسیم کر دیا جائے اور اس کے پچپن فیصد حصے پر مشتمل ایک صہیونی ریاست قائم کی جائے اور ایک آزاد عرب ملک کو اقتصادی یونین میں شامل کیا جائے۔ اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ یروشلم اور بیت اللحم کے لئے ایک بین الاقوامی ٹرسٹی شپ قائم کی جائے۔ عرب ملکوں نے ان تجاویز کو فوری طور پر مسترد کر دیا اور اس سلسلے میں دیئے جانے والے ووٹ کو غیر موثر قرار دیا۔

اقوام متحدہ میں فلسطین کو تقسیم کیے جانے کے حق میں جانے والے ووٹ کے فوری بعد فلسطین میں ہنگاموں کا آغاز ہو گیا مقامی طور پر مختلف شہروں میں لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ عربوں نے گلیل اور نگیو کی نو آبادیوں، اور یروشلم کو یہودیوں کے علاقوں سے کاٹنے اور جافا اور ایکری کے ساحلی علاقوں کے علاوہ گلیل کے ایک بڑے حصے کا کنٹرول سنبھالنے کا اعلان کر دیا۔ جس میں طبریہ اور سفید کے علاقے بھی شامل تھے۔ فلسطینی مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد اس دوران یہودیوں کے زیر تسلط علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس دوران یروشلم کے مضافات میں ڈیر ینیسن نامی علاقے پر قبضے کے لئے لڑائی کے دوران فلسطینی شہریوں کے قتل عام کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی صیہونیوں نے بھی اسرائیل کی آزاد ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جسے امریکہ سمیت پوری مغربی دنیا نے فوراً تسلیم کر لیا۔ عربوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور شام، لبنان، اردن، مصر اور سعودی عرب کی فوجیں اسرائیل کی سرحد میں داخل ہو گئیں۔ ادھر اسرائیل کی حفاظت کے لئے امریکی ٹینک اور طیارے پہنچ گئے۔ اس جنگ میں اگرچہ اسرائیلی اسلحہ کی برتری اور عربوں میں اچھی قیادت کے فقدان کے باعث عربوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ جنگ تین ہفتوں تک جاری رہی اور اسرائیل غزہ کی پٹی پر بھی قبضہ نہیں کر سکا۔

پچھلے ایک ہزار سال میں مصر و فلسطین کے درمیان گہرا تعلق قائم رہا ہے۔ فلسطین کو صلیبی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے میں مصر کے حکمران ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ 1948ء میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جو جنگ لڑی گئی اس میں صدر ناصر میجر کی حیثیت سے شریک تھے۔ وہ دو بار زخمی ہوئے۔ جب گولہ بارود سے لدے جہاز نہر سویز سے گزر کر اسرائیلی بندرگاہوں کا رخ کرتے تو ان کے زخم تازہ ہو جاتے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے 1956ء میں نہر سویز پر مصر کی بالادستی قائم کر کے اسے اسرائلی جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ دسمبر تک اسرائیلی فوجیں سینا اور ال عریش تک پہنچ گئیں مگر انہیں برطانیہ کی اس دھمکی کے بعد واپس ہونا پڑا کہ وہ اس جنگ میں مصر کی مدد کرے گا۔ چنانچہ فروری 1949ء میں مصر اور اسرائیل کے درمیان ایک سمجھوتے پر دستخط ہوئے، اسی دوران اسرائیل کے ساتھ ٹرانس جارڈن، لبنان اور شام سے بھی سمجھوتے ہوئے۔

اردن اور اسرائیل نے یروشلم کو تقسیم کر لیا اور شاہ عبداللہ نے اپنی افواج کو صرف اپنے علاقوں تک محدود کر لیا۔ ڈیوڈ بن گوریان اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اس دوران شاہ عبداللہ نے اسرائیل کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا کہ انہیں مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے درمیان ایک راہ داری فراہم کی جائے۔ شاہ عبداللہ کو یہ معاہدہ بہت مہنگا پڑا اور انہیں ایک فلسطینی نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ اقوام متحدہ نے اسرائیل کو جتنی زمین دینے کا اعلان کیا تھا اس نے اس سے ایک تہائی سے زائد زمین پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیل نے اس دوران یورپ خصوصا مشرقی یورپ سے آنے والے اڑسٹھ لاکھ ستر ہزار یہودیوں کو اسرائیل میں بسایا اور تقریباً سات لاکھ عربوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جانا پڑا۔

عرب ملکوں کی افواج کو اسرائیل کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے بعد بھی علاقے میں کشیدگی کم نہیں ہوئی۔ سرحدی خلاف ورزیوں کے بعد مختلف علاقوں میں چھاپہ مار طرز کی لڑائیاں بھی شروع ہو گئیں۔ 1953ء میں خصوصاً اردن کے ایک گاؤں میں اسرائیلیوں کے ہاتھوں 69 شہریوں کے قتل کے بعد جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے شامل تھے حالات بہت خراب ہو گئے۔ مصر نے چیکوسلواکیہ سے بڑی تعداد میں ہتھیار لینے کا اعلان کیا جب کہ فرانس نے اسرائیل کو جدید ہتھیاروں سے مسلح کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومیانے کا اعلان کیا تو اسرائیل نے اس کے خلاف برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا۔ منصوبے کے تحت اسرائیل کی جانب سے سینا پر حملہ کیا جانا تھا تا کہ فرانس اور برطانیہ کو علاقے میں مداخلت کا جواز مل سکے۔ تاہم اس مرحلے پر امریکہ نے مداخلت کی اور اس حملے کو اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی قرار دیا۔ اسرائیل کو سینا کے علاقے میں پیچھے ہٹنا پڑا اور برطانیہ اور فرانس نے بھی نہر سویز کے علاقے سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔

اپریل 1967ء میں ایک اسرائیلی ٹریکٹر متنازعہ علاقے کے کھیت میں گھس گیا اس موقع پر شام کے توپ خانے نے گولہ باری کا آغاز کیا۔ شام کے مورچے اسرائیلی ٹینکوں کے نشانے سے دور تھے اس لئے فضائیہ کی امداد طلب کر لی گئی۔ اس لڑائی میں اسرائیل نے شام کے چھ طیارے مار گرائے۔ اس وقت عرب دنیا کا سب سے طاقتور ملک مصر یمن کی

خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا اس لئے وہ شام کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ یہ جنگ چھ روز تک جاری رہی اور اس دوران دریائے اردن کے پانی کی تقسیم کے مسئلے پر بھی اسرائیل، اردن اور شام کے درمیان تنازع پیدا ہو گیا اور مصر نے سینا کے علاقے میں شرم الشیخ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ فرانس کے صدر چارلس ڈیگال نے بھی اس دوران اسرائیلی پالیسیوں سے ناراض ہو کر اس کی فوجی امداد بند کر دی۔ ادھر اردن نے مصر اور عراق کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ کر لیا۔ عرب رہنماؤں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اسرائیل کا نام و نشان ہمیشہ کے لئے مٹا دیں گے۔ تیران کے پہاڑی علاقوں کا تنازع اسرائیل اور مصر کے درمیان چل رہا تھا اس نے بھی اس دوران شدت اختیار کر لی۔ اسرائیلی طیاروں نے اچانک مصر کے نو فضائی اڈوں پر حملہ کر کے تین سو طیارے تباہ کر دیئے۔ اسی دوران اردن بھی جنگ میں کود پڑا مگر اسرائیل کی منظم اور طاقت ور فضائیہ کے سامنے اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ اسرائیل کی بہت بڑی کامیابیاں تھیں اس نے چھ روز کی جنگ میں اپنے سے تین گناہ زیادہ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیل میں اس کامیابی پر زبردست جشن منایا گیا اور فلسطینی علاقوں میں اسرائیل کی نو آبادیوں کے قیام کا سلسلہ زور و شور کے ساتھ شروع ہو گیا۔

1959ء میں یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں نے ''الفتح'' کے نام سے ایک گروپ تشکیل دیا اور اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ فلسطین کی آزادی کے مسئلے کو مصری حکومت کے سپرد کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ یاسر عرفات ان دنوں کویت میں ایک سول انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں میں سے بیشتر افراد کا تعلق مختلف ممالک سے تھا۔ اس سے قبل 1953ء میں یاسر عرفات ایک طالب علم کی حیثیت سے قاہرہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے خون سے مصری رہنماؤں کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی تھی: ''فلسطین کو فراموش نہ کریں''۔ الفتح نے ''ہمارا فلسطین'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس میں عرب رہنماؤں کی فلسطین کے مسئلے پر بے حسی پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ الفتح کا اس بات پر یقین تھا کہ 1962ء میں جس طرح الجزائر نے فرانسیسی تسلط سے نجات حاصل کی تھی اسی طرح فلسطین کو بھی آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ الفتح کو اسرائیل کے خلاف اپنی ابتدائی جدوجہد اور حملوں میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا

پہلا کارکن اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ اردن کی سرحدی فوجوں کی فائرنگ سے شہید ہوا۔ الفتح نے مغربی کنارے کے علاقوں کو اپنی چھاپہ مار جنگ کا مرکز بنایا۔

1964ء میں تنظیم آزادی فلسطین قائم ہوئی اور یاسر عرفات کو اس کا پہلا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر ایک منشور کی بھی منظوری دی گئی جس میں کہا گیا کہ مسلح جدوجہد سے ہی فلسطین کو آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ 1970ء میں شاہ حسین نے مسلح فلسطینیوں کو کچلنے کا حکم دیا اس دوران ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور اس واقعے کو سیاہ ستمبر کا نام دیا گیا۔ اس موقع پر شام نے فلسطینیوں کی حمایت کی کوشش کی مگر اردن کے ٹینکوں نے شام کی افواج کا راستہ روک دیا۔

1967ء سے عرب ممالک اور اسرائیل سرد جنگ کا شکار تھے اسرائیل نے اپنی افواج کو جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح کر دیا تھا۔ ستمبر 1970ء میں جمال عبدالناصر کا انتقال ہوگیا اور ان کے پیش رو انور سادات نے مصر سے تمام روسی مشیروں کو نکال دیا۔ اسرائیل کو اس فیصلے سے کافی تقویت ملی مگر 6 اکتوبر 1973ء کو مصر اور شام نے غیر متوقع طور پر اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اسرائیل اس حملے کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ نہر سویز کے علاقے میں اسرائیل کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر امریکہ نے اسرائیل کی اور روس نے مصر کی کھل کر مدد کی اور اس طرح یہ جنگ بڑی طاقتوں کی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں تیل کا بحران پیدا ہوگیا اور عربوں نے تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔

1974ء میں عرب ملکوں نے پی ایل او کو فلسطینیوں کی واحد جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرلیا اور یاسر عرفات کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کے لئے مدعو کیا گیا۔ 1967ء کی جنگ کی وجہ سے اسرائیل کو سیاسی طور پر شدید نقصان ہوا۔ دسمبر 1973ء میں لیبر پارٹی معمولی اکثریت سے کامیاب ہوئی مگر وزیراعظم گولڈا میئر نے 1974ء میں استعفیٰ دے دیا۔ ان کے بعد آئزک رابن وزیراعظم بنے مگر اسرائیل بدستور سیاسی اور اقتصادی انتشار کا شکار رہا۔ 1973ء کی جنگ کے بعد اسرائیل اور عرب ملکوں کے درمیان امن کے امکانات کی تلاش کا آغاز ہوگیا تھا۔

3 جون 1982ء کی شب لندن میں اسرائیل کے سفیر شلوموآرگوڈ ورچیسٹر ہوٹل

کے باہر چہل قدمی کر رہے تھے کہ نامعلوم شخص نے ان کے سر میں گولی مار کر انہیں شدید زخمی کر دیا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس سروس فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ یہ ابوندال کی سربراہی میں قائم ایک فلسطینی تنظیم کا کام ہے۔ اسرائیلی کابینہ نے مہینوں کی سوچ بچار کے بعد اس واقعے کی ذمہ داری تنظیم آزادی فلسطین پر ڈال دی۔ اسرائیل نے اس واقعے کے بعد شام اور لبنان کے خلاف ایک فوجی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اسرائیل نے شام کے خلاف جنگ میں اس کے تقریباً سو طیارے تباہ کر دیئے اس کے بعد اسرائیل کی جانب سے بیروت پر تقریباً دو ماہ تک بمباری کا سلسلہ جاری رہا اس بم باری کے نتیجے میں پی ایل او کو شام اور لبنان سے نکلنا پڑا۔ امریکہ، فرانس اور اٹلی کے فوجیوں نے اس ضمن میں ''امن فوج'' کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ اسرائیل نے اس دوران بیروت کے مغربی حصے پر قبضہ کر لیا تھا جو مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ اسرائیلیوں نے صابرہ اور شتیلا کے کیمپوں میں بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام کیا، ان افراد کو فلسطینی مجاہد ہونے کے شبے میں قتل کیا گیا تھا۔ قتل عام کا سلسلہ تین روز جاری رہا اور اس دوران عورتوں اور بچوں کو بھی انتہائی بے رحمی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس قتل عام کے دوران تقریباً چار ہزار فلسطینی اسرائیلی فوجیوں کا نشانہ بنے۔

8 دسمبر 1987ء کو چار فلسطینی کارکن ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ان کی ہلاکت کے فوری بعد یہ افواہ پھیلائی گئی کہ اسرائیلیوں نے ان افراد کو جان بوجھ کر ہلاک کیا ہے غزہ کی پٹی کے علاقے میں اس واقعے کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے۔ یہ ہنگامے جلد ہی پورے مغربی کنارے کے علاقے میں پھیل گئے۔ اسرائیل اور خود پی ایل او کے حکام ان ہنگاموں کا اصل سبب معلوم نہیں کر سکے تھے۔ یہ ہنگامے ان واقعات کا نکتہ آغاز تھے جو **1990ء** سے تقریباً روزانہ پیش آ رہے تھے۔ اب فلسطینی علاقوں میں ہنگامے، ہڑتال اور بائیکاٹ روز مرہ کا معمول بن گیا۔ ان ہنگاموں نے اب مسلح جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔ اسرائیلی فوجیوں پر پتھراؤ کرتے ہوئے فلسطینی بچوں کی تصاویر اکثر اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اسرائیلی فوجی مقبوضہ علاقوں میں خدمات انجام دینے سے کترانے لگے ہیں۔ **1990ء** میں عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو یہ واقعہ پی ایل او کے لئے ایک خاص مسئلہ بن گیا۔ تحریک آزادی فلسطین کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ عراق کی

پالیسیوں کی حمایت جاری رکھے یا پھر مصر اور خلیج کے دیگر ملکوں کی طرح امریکہ کی حمایت کرے۔ اس موقع پر یاسر عرفات نے یہ موقف اختیار کیا کہ فلسطینی بھی ان ہی مسائل کا شکار ہیں جن کا عراق کو سامنا ہے۔ اس موقف کی وجہ سے یاسر عرفات کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور خلیج کے ملکوں نے پی ایل او کے فنڈ روک لئے۔ اسی زمانے میں یاسر عرفات نے اسرائیل کے ساتھ خفیہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا اور ایک امن سمجھوتے کی ابتداء ہوئی۔

اعلان واشنگٹن (ستمبر 1993ء)

یہ 5 جون 1967ء کا دن تھا اسرائیل کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آئزک رابن کی زیر نگرانی یہودی فوجوں نے مصر اور شام پر حملہ کر دیا نیز نہتے فلسطینیوں کے کیمپوں پر زبردست بمباری کی۔ تنظیم آزادی فلسطین نے اس جنگ میں مصر اور شام کی مدد کی تاہم دیگر اسلامی ممالک کی اکثریت نے اسرائیل کے خلاف صرف زبانی احتجاج کیا اور امریکہ کے خوف سے مصر اور شام کی کوئی فوجی امداد نہ کی۔ یہودی افواج نے صرف چھ دن کے اندر مشرقی یروشلم، صحرائے سینا، غزہ اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ 6 اکتوبر 1973ء کو مصر اور شام نے اپنے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے لئے اسرائیل پر حملہ کیا اس وقت کے پاکستانی وزیراعظم بھٹو اور لیبیا کے کرنل قذافی نے اسرائیل کے خلاف حملے میں مصر اور شام کی مدد کی تاہم بہت سے امیر اور مضبوط اسلامی ممالک نے اسرائیل کے خلاف جنگ میں عملی طور پر حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح عالم اسلام نے بیت المقدس کی آزادی کا ایک سنہرا موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ یہ جنگ تقریباً اڑھائی ہفتے جاری رہنے کے بعد ختم ہو گئی اور مصر و شام اپنے مقبوضہ علاقے واپس لینے میں ناکام رہے۔

پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا اہتمام کیا اور تمام اسلامی ممالک کے سربراہان نے یاسر عرفات کی موجودگی میں بیت المقدس کی آزادی کا عہد کیا۔ سعودی عرب اور لیبیا نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام شروع کرنے کے لئے مالی مدد دی پاکستان کا ایٹمی پروگرام صرف پاکستان کے لئے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے شروع کیا گیا تھا چنانچہ ایک سازش کے تحت پہلے تو سعودی عرب کے سربراہ شاہ فیصل کو قتل کروایا گیا اور اس کے بعد پاکستان کے وزیراعظم بھٹو کو اقتدار سے فارغ کر دیا گیا۔ جس کے بعد اکثر اسلامی ممالک کے سربراہ خوف میں مبتلا ہو گئے اور یہی وجہ تھی کہ مصر کے صدر انور سادات 19 نومبر کو اسرائیل جا پہنچے اور اسرائیلی

حکومت کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ امریکی صدر جمی کارٹر کی کوششوں سے مصر اور اسرائیل کے درمیان کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ طے پا گیا جس کی پی ایل او سمیت تمام اسلامی ممالک نے مخالفت کی بلکہ پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات نے تمام اسلامی ممالک سے اپیل کی کہ وہ مصر پر دباؤ ڈالنے کے لئے مصر سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیں۔ لیکن اسلامی ممالک کے سربراہان کے ذہنوں پر امریکہ کا خوف مسلط تھا اور یاسر عرفات کی اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

اسرائیل نے امریکہ کی مدد سے پی ایل او کو تنہا کر دیا اور بہت سے اسلامی ممالک نے فلسطینی مہاجرین کو اپنے ملکوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ یاسر عرفات نے اپنا ہیڈ کوارٹر بیروت میں بنا رکھا تھا اور اسرائیل نے جون 1982ء میں لبنان پر حملہ کر دیا یاسر عرفات نے عالم اسلام سے مدد کی اپیل کی اور بیت المقدس کی آزادی کے عہد یاد دلائے لیکن پاکستان سمیت کسی بڑے اسلامی ملک نے لبنان میں محصور فلسطینیوں کی مدد نہ کی۔ فلسطینیوں کی گوریلا تنظیم پی ایل او نے تین ماہ تک اسرائیل کی مضبوط فوج سمیت لبنان کی عیسائی ملیشیا کا مقابلہ کیا اور آخر 31 اگست 1982ء کو یاسر عرفات اپنے 15 ہزار ساتھیوں کے ہمراہ بیروت چھوڑ گئے کیوں کہ ان کی وہاں موجودگی بے گناہ لبنانیوں کے قتل کا باعث بن رہی تھی۔ اسی دوران اسرائیل نے بیروت کے نواح میں فلسطینیوں کے کیمپوں پر حملہ کر کے 1500 نہتے فلسطینیوں کو قتل کر دیا یاسر عرفات نے عالم اسلام کی بے بسی پر روتے ہوئے شکوہ کیا تھا اور کہا کہ اکثر اسلامی ممالک کا رویہ دوغلا ہے وہ بیت المقدس کو آزاد بھی کرانا چاہتے ہیں اور فلسطینیوں کی مدد بھی نہیں کرتے۔

اگست 1990ء میں جب عراق امریکہ جنگ شروع ہوئی تو پی ایل او نے کھل کر عراق کا ساتھ دیا جبکہ پاکستان سمیت دیگر اسلامی ملکوں نے اپنی فوجیں سعودی عرب بھیجیں جہاں سے عراق پر حملے کئے گئے۔ امریکہ کے کہنے پر اسلامی ممالک نے عراق کے ساتھ اقتصادی روابط ختم کر دیئے اور اس کے ساتھ پی ایل او کے اثاثے بھی منجمد کر دیئے۔ جب صدام کی طرف سے اسرائیل پر سکڈ میزائل پھینکے جا رہے تھے تو صرف یاسر عرفات کی طرف سے عراق کی حمایت کی جا رہی تھی اور باقی تمام ممالک خاموش تھے۔ اگر عراق امریکہ جنگ کے دوران کم

ازکم شام، اردن، لیبیا اور کچھ دیگر عرب ممالک اسرائیل پر حملے کی صرف دھمکی دے دیتے تو جنگ بند ہو جاتی مگر ایسا نہ ہوا اور جنگ میں عراق کو شکست ہو گئی۔

عراق امریکہ جنگ کے بعد ہی یاسر عرفات نے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کا فیصلہ کرلیا۔ 30 ستمبر 1991ء کو سپین کے شہر میڈرڈ میں اسرائیل اور پی ایل او، شام، لبنان، اور اردن کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے ان مذاکرات نے اس وقت فیصلہ کن رنگ اختیار کرنا شروع کیا جب اسرائیل میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی اور 1967ء کے فاتح اسحٰق رابن اسرائیل کے وزیر اعظم بن گئے۔ انہوں نے پہلی دفعہ ناروے کے وزیر خارجہ جان جورجن ہولسٹ کے ذریعہ پی ایل او کو پیش کش کی کہ اگر پی ایل او کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرلیا جائے تو اسرائیل بھی پی ایل او کو تسلیم کرلے گا۔

پی ایل او کی نمائندہ حنان اشراوی نے موقف اختیار کیا کہ اسرائیل کو پی ایل او کے ساتھ ساتھ پی ایل او کی جلاوطن حکومت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا جو غزہ کی پٹی، دریائے اردن کے مغربی کنارے اور جریکو کی حدود میں مقبول ہے۔ تاہم یہ طے پایا کہ اسرائیل پی ایل او کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام پر متفق ہے تاہم وہاں اقوام متحدہ کی نگرانی میں انتخابات ہوں گے۔ اس موقع پر پی ایل او نے ایک اور شرط پیش کی کہ وہ بیت المقدس سے دستبردار نہ ہوگی لہٰذا فیصلہ ہوا کہ دونوں فریقین 2 سال تک بیت المقدس کے مسئلے پر خاموش رہیں گے۔

پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان نو ماہ کے خفیہ مذاکرات کے نتیجے میں فریقین پر امریکہ کی آشیر باد اور زبردست دباؤ کے نتیجے میں 23 ستمبر 1993ء کو ایک سمجھوتہ طے پا گیا جس پر واشنگٹن کے وائٹ ہاؤس میں صدر کلنٹن کی موجودگی میں یاسر عرفات اور اسحٰق رابن نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کے تحت پی ایل او کی خودمختاری تسلیم کرلی گئی۔ ہیبرون سے اسرائیلی فوج کی واپسی قسطوں میں ہوگی اور اس فوج کا ایک معقول حصہ وہیں رہے گا کیوں کہ ساڑھے چار سو اسرائیلی آبادکاروں کا تحفظ ان کی ذمہ داری ہے۔ سترہ شقوں اور چار ذیلی شقوں پر مشتمل یہ معاہدہ بہت ہی حساس اور اہمیت کا حامل ہے اس کے خاص نکات اس طرح ہیں:

☆ اسرائیل 365 مربع کلو میٹر پر محیط اور سات لاکھ ستر ہزار فلسطینیوں پر مشتمل غزہ کی پٹی اور 20 لاکھ آبادی کے علاقے جریکو کو خالی کر دے گا چار ماہ کے اندر اندر فلسطینی ان علاقوں کا انتظام سنبھال لیں گے جبکہ اسرائیل پر ان کی صرف خارجی حفاظت کی ذمہ داری ہوگی۔ فلسطینی زندگی کے تمام شعبوں کا انتظام وانصرام خود سنبھالیں گے اور اس کے ساتھ ہی مختلف شعبوں میں مثلاً تعلیم، صحت، سماجی بھلائی کے کام اور ٹیکسوں کے نظام میں فلسطینیوں کی داخلی خود مختاری کا دور شروع ہوگا۔ سیاحت کے شعبے کا انتظام فلسطینیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے علاقے میں اس عبوری اور عارضی داخلی خود مختاری کا طے شدہ عرصہ پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوگا۔

☆ اس معاہدے پر دستخط کے نو ماہ کے اندر عبوری خود مختاری کے لئے علاقے میں انتخابات کا انعقاد ہوگا۔

☆ عبوری خود مختاری کے دو سال گزرنے کے بعد مقبوضہ فلسطینی علاقوں کے سٹیٹس کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

☆ غزہ اور جریکو کے علاقوں سے اسرائیلی فوج کا انخلاء معاہدہ پر دستخط ہونے کے دو ماہ بعد شروع ہوگا۔ باقی علاقوں سے اسرائیلی فوج باہمی طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنا انخلاء شروع کرے گی۔

☆ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے پر بسنے والے اسرائیلیوں کی حفاظت فلسطینی کریں گے۔

☆ اسرائیل مقبوضہ علاقوں کی بیرونی اور خارجی خطرات کے خلاف حفاظت کرے گا اور ان علاقوں میں رہنے والے اسرائیلیوں کی بھی ممکنہ خطرات سے بچائے گا۔

☆ یروشلم کی حیثیت کے بارے میں فیصلہ معاہدے کے آخری مراحل تک موخر کر دیا جائے گا۔

☆ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے درمیان ایک محفوظ علاقے کے قیام کو یقینی بنایا جائے گا۔

☆ فلسطینی مہاجرین اپنے اپنے علاقوں میں جا سکیں گے جس کا پروگرام فلسطین، اسرائیل، مصر اور اردن آپس میں طے کریں گے۔

☆ آپس کے تمام اختلافات فلسطینیوں اور اسرائیلیوں پر مشتمل ایک کمیٹی کے ذریعے

حل کئے جائیں گے یا اس معاملہ میں کسی تیسرے فریق کی ثالثی قبول کی جائے گی۔

اس تاریخی معاہدے پر دستخط کرتے ہی پوری دنیا میں بالعموم اور مسلم دنیا میں بالخصوص ایک ہلچل سی مچ گئی اور مختلف ملکوں کی طرف سے یاسر عرفات اور اسحٰق رابن کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور دونوں کو ''غدار'' کہا گیا۔ اسرائیلی وزیراعظم نے مدافعت میں کہا کہ یہ معاہدہ ایک کڑوی گولی تھا جو ہمیں نگلنا پڑی۔ یاسر عرفات نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ہم نے اسرائیل کے آگے ہتھیار پھینک دیئے ہیں میں مستقبل میں ایک ہمہ گیر فلسطینی ریاست کے قیام کا وجود دیکھ رہا ہوں جلد ہی فلسطینی یروشلم کی دیواروں، میناروں اور عبادت گھروں پر اپنا جھنڈا لہرائیں گے۔

آزادی کے نام پر ہونے والے اس بھیانک مذاق کو جسے امریکہ کی پشت پناہی حاصل تھی ساری دنیا کے الیکٹرانک میڈیا پر نمایاں کوریج دی گئی اور صدر کلنٹن کو امن عالم کا چیمپئن بنا کر پیش کیا گیا جب قاہرہ میں یاسر عرفات ایک ضخیم دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد اس تاریخی معاہدے کو امن عالم کی طرف ایک مثبت قدم اور اپنی شاندار فتح بتا رہے تھے عین اس وقت مقبوضہ فلسطین میں اسرائیلی فوجی مسلمانوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اور جس کے نتیجے میں 23 ستمبر 1993ء میں واشنگٹن میں اس بنیادی سمجھوتے پر سرکاری طور پر دستخط ہوئے۔ پھر اس معاہدے کی تجدید کے لئے فروری 1994ء میں مذاکرات کا دور ابھی جاری تھا کہ 25 فروری 1994ء کو ہبرون (الخلیل) کے علاقے میں ایک سانحہ پیش آگیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے۔

———✡———
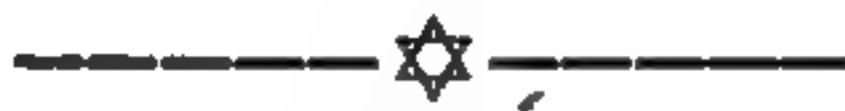
اعلان قاہرہ

25 فروری کے سانحہ میں یروشلم کے تقریباً تیس میل دوزواقعہ مسجد ابراہیمی میں نماز جمعہ ادا کرتے ہوئے فلسطینی مسلمانوں پر ایک یہودی آباد کار نے مشین گن کی گولیوں سے بارش کردی۔ چالیس سے زائد فلسطینی شہید ہو گئے اور حرم ابراہیمی اپنے نمازیوں کے خون سے نہا گیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ہونے والے مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے۔ اس کے ایک ماہ بعد سلامتی کونسل نے قرارداد مذمت منظور کی اور طے پایا کہ الخلیل اور اس کے گرد و پیش کے علاقوں میں امن عامہ کی نگرانی کے لئے بین الاقوامی فوج کے دستے تعینات کئے جائیں گے۔ جس کے بعد مذاکرات کا دوبارہ آغاز ہوا۔ 4 مئی 1994ء کو مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں تنظیم آزادی فلسطین کے چیئرمین یاسر عرفات اور اسرائیل کے وزیر اعظم اسحٰق رابن نے دستخط کر کے اقتصادی معاہدے کے باقاعدہ نفاذ اور ان پر عمل درآمد کے آغاز کا عہد نامہ طے کیا۔ اس موقعہ پر مصر کے صدر حسنی مبارک، امریکہ کے وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر اور روس کے وزیر خارجہ آندرے کزریف بطور گواہ موجود تھے۔ اس معاہدے کے تحت مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں سے جریکو شہر اور غزہ کی پٹی میں اہل فلسطین کے لئے محدود خود مختاری کے دور کا آغاز ہو جائے گا اور ان علاقوں پر اسرائیلی فوج کی جگہ فلسطینی پولیس لے لے گی۔

اگرچہ یہ دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک دستاویز ہے لیکن یہ بھی فریقین اور عالمی طاقتوں کی نمائندگی کرنے والے با اختیار گواہوں کے دستخطوں کے باوجود متفقہ علیہ دستاویز نہیں۔ عین آخری مرحلے پر اس پر بھی اختلافات پیدا ہو گئے اور 4 مئی کو دستخط کرنے کی تقریب تاخیر کا شکار ہو گئی۔ یاسر عرفات کو اس میں دیئے گئے جریکو شہر کے نقشے پر اعتراض تھا اسرائیل اس قدیم تاریخی اور مقبوضہ فلسطینی شہر کے 54 مربع کلومیٹر کے حصے سے زائد علاقے کو فلسطینی نظامت کے زیر اختیار دینے پر تیار نہیں تھا جبکہ اصل شہر کی حدود اڑھائی سو

مربع کلومیٹر سے زیادہ علاقے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یاسر عرفات نے کم از کم ڈیڑھ سو مربع کلو میٹر کے رقبہ پر اپنے انتظام واہتمام کا مطالبہ کیا۔ آخر امریکی وزیر خارجہ کی اس یقین دہانی پر کہ حتمی نقشہ تصور نہیں ہوگا اور اس پر مذاکرات جاری رہیں گے۔ چنانچہ یاسر عرفات نے نقشوں کے بارے میں اپنا اختلافی نوٹ لکھانے کے بعد دستخط کر دیئے۔

اس کے علاوہ جن دو امور پر سمجھوتہ طے نہیں پایا ان میں سے ایک یہ ہے کہ جریکو (دریائے اردن کا مغربی کنارہ) اور اردن کی سرحدوں کے علاقے والے پلوں اور ان پر قائم چوکیوں کی نگرانی کون کرے گا؟ اسرائیل کا اصرار تھا کہ یہ کام وہ خود ہی کرتے رہیں گے۔ جبکہ فلسطینیوں کا کہنا تھا کہ اسے مل کر کرنا چاہئے۔ تیسرا مسئلہ ان فلسطینی قیدیوں کی تعداد کا تعین تھا جنہیں اسرائیل نے معاہدے کے نفاذ کے بعد رہا کر دینا تھا۔ ان تینوں امور کے بارے میں یہ ہوا کہ ان پر فریقین کے مذاکرات جاری رہیں گے۔

ضمنی معاہدے کی حیثیت سے **29** اپریل **1994**ء کو فلسطین اسرائیل اقتصادی تعاون کی جس مفاہمت کا اعلان ہوا اس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

(ا) فریقین ایک ہی نوعیت کی درآمدی پالیسی اختیار کریں گے، تاہم باہمی رضامندی سے فلسطینی نظامت درآمدی ٹیکس سے اپنی ضرورت کے مطابق ردوبدل کر سکتی ہے۔

(ب) فلسطینی نظامت ایک بااختیار مالیاتی ادارہ قائم کرے گی جو اس کے علاقوں میں بینکوں اور مالیاتی نظام کو کنٹرول کرے گا۔ یہ ادارہ بیرونی زرمبادلہ کے ذخائر کی نگرانی کرے گا اور ان سے متعلقہ ضروری قواعد وضوابط کا نفاذ بھی اس کی ذمہ داری ہوگی۔

(ج) فریقین فلسطینی کرنسی کے اجراء کے امکانات پر باہمی صلح مشورہ اور مذاکرات جاری رکھیں گے تاہم اتنی دیر تک اسرائیلی شیکل ہی سے فلسطینی علاقوں میں کرنسی کا کام لیا جائے گا۔

(ح) فلسطینی ٹیکس کا محکمہ افراد اور کمپنیوں پر انکم ٹیکس کے اجراء، پراپرٹی ٹیکس اور میونسپل ٹیکس کے نفاذ اور اسے اکٹھا کرنے کی ذمہ داری سنبھالے گا۔

(د) حکومت اسرائیل فلسطینی نظامت کو ان ٹیکس سے حاصل شدہ رقم کا **75** فیصد لوٹا دیا

کرے گی جو وہ اسرائیل کی حدود کے اندر ملازمت کرنے والے فلسطینیوں تنخواہوں سے وضع کرتی ہے۔

(ر) فلسطینی نظامت اپنے علاقے میں اسرائیل کی مانند VAT ٹیکس نافذ کرے گی البتہ اس کی شرح کو وہ 17 فیصد کے بجائے 15 اور 16 فیصد تک رکھ سکتی ہے۔

(س) فلسطینی علاقوں سے اسرائیلی حدود کے اندر زرعی پیداوار کی اشیاء کی نقل وحمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی ماسوائے آلو، ٹماٹر، انڈے اور برائلر چکن کے جن کا کوٹہ مقرر کیا جائے گا۔ صنعتی اشیاء کی نقل وحمل اور خرید وفروخت پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

یقیناً یہ قدم فلسطینی ریاست کے قیام کی جانب ایک قدم تھا لیکن یہ معاہدہ زبانی جمع خرچ تک ہی محدود رہا اور اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی اس کے بعد 28 ستمبر 1995ء کو وہائٹ ہاؤس امریکہ میں ایک اور معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت فلسطینیوں کو اردن کے مغربی کنارے کے بارے میں حق خود ارادیت دیا گیا اور سمجھوتے پر یاسر عرفات اور اسحاق رابن نے دستخط کیے۔ اس سمجھوتے کا اسرائیل کی سیاست پر یہ اثر ہوا کہ 5 نومبر 1995ء کو اسحاق رابن جب ایک امن ریلی سے خطاب کرنے کے بعد واپس جارہے تھے ایک انتہا پسند یہودی نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسحاق رابن کی ہلاکت کے ساتھ ہی یہ امن معاہدے اپنی موت آپ مر گئے۔ اس کے بعد 15 جولائی 1997ء کو ایک اور معاہدہ ہوا جسے "معاہدہ اقلیل" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں اسرائیل سے گزارشات اور فریادیں کی گئیں جو عملاً نافذ نہ ہوسکیں۔

وائی رائیو

پھر امریکہ بہادر کی طبعیت میں جوش آیا اور فلسطینیوں کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے ایک اور معاہدے پر دستخط کیے گئے جسے معاہدہ وائی رائیو (Why Rive) کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ نو روزہ مذاکرات کے بعد 23 اکتوبر 1998ء کو ہوا۔ اس معاہدے کے لئے امریکہ کے صدر بل کلنٹن، یاسر عرفات اور اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو نے میری لینڈ (امریکہ) میں ملاقات کی اور اس معاہدے میں طے پایا کہ:

(ا) اسرائیلی افواج فی الحال مغربی کنارے کے تیرہ فیصد علاقے سے انخلاء کریں گی۔

(ب) فلسطینی اتھارٹی مسلح شدت پسندوں (جہادیوں) کے خلاف کاروائی کرے گی اور پی ایل او اپنے منشور سے اسرائیل کی تباہی کی شق حذف کرنے کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرے گی۔

(ج) فلسطینی اتھارٹی اسرائیل کے خلاف دہشت گردی اور جرائم کی روک تھام میں ہر ممکن مدد کرے گی۔

(د) فلسطینی دہشت گرد جہادی تنظیموں کو غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔

(ر) فلسطینی اتھارٹی دہشت گردی کے خاتمے کے لئے غیر قانونی اسلحے پر پابندی لگائے گی، فلسطین کی طرف سے ایک باقاعدہ منظم منصوبے کے تحت ایسے تمام غیر قانونی ہتھیاروں کو جمع کیا جائے گا جو دہشت گردی کا باعث بنتے ہیں اس ضمن میں امریکہ فلسطین کی مدد کرے گا۔

(س) فلسطینی اتھارٹی اپنی پولیس کی ایک مکمل فہرست اسرائیل کو فراہم کرے گی۔

(ع) اگر فلسطینی اتھارٹی ان تمام شرائط پر راضی ہونے کے ساتھ خوش اسلوبی سے عمل پیرا ہوتی ہے تو اسرائیل کی حکومت افواج کی واپسی اور نئی یہودی بستیاں آباد کرنے پابندی جیسے اقدام کرے گی۔

یہ وہ اعلیٰ وارفع مقاصد تھے جو امریکہ کے صدر کے ذہن کی اختراع تھے اور جس میں 27 مرتبہ لفظ ''دہشت گرد'' کو فلسطینی اتھارٹی اور فلسطینی مجاہدین سے منسوب کیا گیا۔

معاہدہ شرم الشیخ

اس معاہدے کے بعد امریکہ نے ایک اور معاہدہ 4 ستمبر 1999ء کو کرایا گیارہ دفعات اور کئی ضمنیوں پر مبنی اس معاہدے کو "معاہدہ شرم الشیخ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس پر اسرائیلی وزیر اعظم ایہود بارک اور فلسطینی اتھارٹی کے صدر یاسر عرفات نے دستخط کئے۔ گواہوں میں مصر کے صدر حسنی مبارک، اردن کے شاہ عبداللہ اور امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ میڈ لین البرائٹ شامل تھیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ 1998ء میں Wyh River کے معاہدے میں اسرائیلی فوج کی واپسی کا فیصلہ ہوا تھا اور 1999ء میں شرم الشیخ کے مذاکرات میں اس کی توثیق کی گئی تھی لیکن ہنوز اسرائیلی فوجیں فلسطین میں دندناتی پھر رہی ہیں۔ یکے بعد دیگرے ڈھکوسلوں پر مبنی معاہدے ہوئے مگر عمل درآمد کسی پر نہ ہو سکا۔ 5 نومبر 2002ء کو نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریئے میں لکھا تھا: "فلسطین کی سرزمین اب منصوبوں کے کھنڈرات سے سجی ہوئی ہے جس کی پیش بینی پر امن انضمام کی صورت کی گئی تھی۔" دو سال قبل یروشلم کی بریزیٹ یونیورسٹی نے ایک سروے کرایا تھا جس میں 92 فیصد لوگوں نے مسئلہ فلسطین کے ضمن میں امن معاہدوں میں امریکہ کی ثالثی کو مسترد کر دیا تھا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ تمام معاہدات میں امریکہ نے ثالثی کا کردار ادا کیا اور دنیا جانتی ہے کہ امریکہ نے بزور طاقت اپنے حکم سے فلسطینیوں کو کس قدر جھکایا ہے۔ پی ایل او کے منشور سے اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کی شق حذف کرائی گئی۔ اسرائیل سے امن معاہدے کی سب سے بڑی مخالف تنظیم حماس کے خلاف خود فلسطینی اتھارٹی کے زیر انتظام اپریشن کرایا گیا۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس "مشن بیت" موساد اور امریکی سی آئی اے اور فلسطینی انٹیلی جنس بیورو کے درمیان معلومات کے تبادلے کا معاہدہ کرایا گیا اور "قیام امن" کی خاطر یاسر عرفات سب قبول کرتے رہے کیوں کہ ٹوٹی ہوئی کشتی اور طوفانی لہریں ہوں تو ایسے میں ناخدا کرے تو کیا کرے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ خطے میں امن وسلامتی کا ایک نیا دور شروع ہوتا مگر قطع نظر اس کے فلسطین کے لئے عالمی طاقتیں (بالخصوص امریکہ) یہی بولیاں بول رہی ہیں کہ مقبوضہ علاقوں میں مکمل امن کی ذمے داری صرف اور صرف فلسطین پر عائد ہوتی ہے اور اسرائیل اس سے بری الذمہ ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے امریکی صدر بش نے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اپنے پنڈورا بکس میں سے ایک نیا ''امن فارمولا'' نکالا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یاسر عرفات کو ان کے منصب سے ہٹانا ضروری ہے کیوں کہ اب وہ بات کرنے کے قابل نہیں رہے۔ فلسطینی ریاست میں جمہوریت نظر آنی چاہئے اور اس طرح مزید تین سال گزر جانے پر فلسطین کی آزاد ریاست معرض وجود میں لائی جاسکتی ہے۔ امریکہ نے جو روڈ میپ فلسطینی اور اسرائیلی قیادت کے حوالے کیا تھا اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا جو معاہدوں کا نکلتا آیا ہے یعنی اسرائیل نے اس پر بھی عملدرآمد سے انکار کر دیا۔ چنانچہ فلسطینی آج بھی اسرائیل کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

یاسر عرفات کے وفات پانے کے بعد اب اسرائیلی وزیراعظم نے فلسطین کی نئی قیادت کے ساتھ مذاکرات کا عندیہ دیا ہے اور صدر بش اور ٹونی بلیئر نے بھی ایک مرتبہ پھر فلسطینی ریاست کے قیام کا خواب دکھایا ہے جو بظاہر تو خوش آئند ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اسرائیل اور امریکہ کے یہ وعدے ایفا بھی ہوں گے یا نہیں کم از کم تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام کا خواب معاہدوں اور وعدوں سے پورا نہیں ہوگا۔

———✡———

معاہدہ امرتسر

تاریخ کشمیر پر نگاہ دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کشمیری عوام کے جسموں سے بہتا ہوا لہو دراصل ایک معاہدے کے گھاؤ کا مرعون منت ہے وہ سیاہ معاہدہ جو'' معاہدہ امرتسر'' کے نام سے مشہور ہے۔ 1819ء تک کشمیر پر مسلمانوں کی حکومت رہی بعدازاں یہ علاقہ سکھوں کے تسلط میں چلا گیا۔ سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ 1845ء سے 1846ء کے نتیجے میں کشمیر کو تاوان جنگ کے طور پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 16 مارچ 1846ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت کشمیر کو اپنی فوج کے ایک ہندو ڈوگرہ افسر مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں 75 لاکھ روپے (نانک شاہی سکہ رائج الوقت) کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ گلاب سنگھ اور اس کے ساتھی ڈوگروں نے جنگ میں سکھوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔

معاہدے کے تحت ڈوگرہ خاندان پر یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ تاج برطانیہ کی مرضی کے بغیر کشمیر کی سرحدوں میں تغیر نہیں کر سکے گا۔ ایک عرصے تک ڈوگرہ حکمران کشمیر پر حکمرانی کرتے رہے اور بالآخر تقسیم ہند کے وقت ڈوگرہ خاندان، بھارت اور برطانیہ نے ایسی پالیسی اختیار کی جس کی وجہ سے کشمیری عوام آج تک ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

✡

پاک بھارت آبپاشی کے معاہدے

پانی صرف معیشت ہی کی بنیادی اکائی نہیں بلکہ ہماری زندگی کی بقا کے لئے بھی انتہائی اہم ہے۔گلوبل وارمنگ تھیوری کے زیر اثر کرۂ ارض پر رونما ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیوں اور دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث پانی کی شدید قلت ایک خوفناک صورت حال میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔دنیا میں پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تقابل میں مسلسل وقوع پذیر ہونے والی آبی قلت اور بقائے حیات کے لئے اس کی اشد اہمیت کے پیش نظر ماہرین نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ مستقبل میں جنگیں پانی کے مسئلے پر ہوں گی۔پاکستان کی آبی ضروریات اس امر کی متقاضی دکھائی دیتی ہیں کہ ہمیں نہ صرف اپنے حصے کا دریائی پانی بلا روک ٹوک نہ ملے بلکہ دستیاب پانی کے ایک ایک قطرے کو زرعی اور اقتصادی استحکام کی خاطر بروئے کار لانے کے لئے پانی کی ذخیرہ جاتی استعداد میں قابل عمل حد تک اضافہ بھی کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے فوری نوعیت کے حامل منصوبوں کے ساتھ ساتھ طویل المعیاد منصوبے ترتیب دیئے جائیں۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے اس نوزائیدہ مملکت کے لئے جو مسائل پیدا کئے ان میں پانی کا مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا۔برصغیر کی تقسیم کے وقت بھارت اور پاکستان کے درمیان دو اہم مسائل تھے یعنی کشمیر اور سندھ طاس کے پانی کی تقسیم۔پاکستان اور بھارت میں سندھ طاس کے پانی کے جھگڑے نے کئی رنگ بدلے ہیں۔کشمیر کا مسئلہ تو بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے لیکن پانی کا مسئلہ ایک فنی اور اقتصادی مسئلہ تھا جس نے بھارت کے غیر منصفانہ رویئے کی وجہ سے ایک تلخی اور دیرینہ عداوت کی شکل اختیار کرلی۔

دریائے سندھ کا شمار اپنے پانچ بڑے معاون دریاؤں کے ساتھ دنیا کے قدیم دریائی نظاموں میں ہوتا ہے۔اس میں ضم ہونے والے یہ پانچ معاون دریا دریائے سندھ کی ضخامت کو بڑھاتے ہوئے اسے بہت بڑا دریا بناتے ہیں۔اس کی اسی وجہ خاصیت کی بنا

پر انگریزوں نے آبپاشی کا ایک وسیع و عریض نظام قائم کیا تھا۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے نظام آبپاشی کی ترقی پچھلے ڈیڑھ سو برس کی انتھک کوششوں کا ثمر ہے ۔ دریائے سندھ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے تحت فروغ پانے والا آبپاشی کا نظام دنیا میں سب سے بڑا نظام قرار دیا جاتا ہے جو کروڑوں ایکڑ زمین کی تشنہ لبی کو سیراب کرتے ہوئے اسے قابل کاشت بناتا ہے۔ اس کی سیرابی کی استعداد مجموعی طور پر مصر اور سوڈان کے اس رقبے سے کئی گنا زیادہ ہے جسے دریائے نیل سے سیراب کیا جاتا ہے۔ گویا اس کے پانی کا سالانہ بہاؤ دریائے نیل کے دوگنا اور دریائے دجلہ وفرات کے مجموعی بہاؤ سے تین گناہ زیادہ ہے۔ دریائے سندھ میں پانی کی انتہائی گنجائش اتنی زیادہ ہے کہ اس سے فرانس یا امریکی ریاست ٹیکساس کا پورا علاقہ ایک فٹ گہرائی میں ڈوب سکتا ہے۔

1947ء میں برصغیر کی تقسیم کے وقت صوبہ پنجاب کو سندھ کے دریاؤں کے نظام کے عین درمیان میں سے تقسیم کر دیا گیا۔ پاکستان کے حصے میں دریاؤں کے بہاؤ کی طرف کا علاقہ آیا جبکہ دو اہم ہیڈ ورکس مادھوپور اور فیروز پور بھارت کے قبضے میں چلے گئے جن سے مغربی پاکستان میں **10** لاکھ ایکڑ سے زائد اراضی کے لئے پانی کی فراہمی کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ یہ دریا بھارت اور پاکستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو زیر آب لاتے تھے۔ بہاؤ کے اوپر کی طرف جو اس کے علاقے سے گزر کر آتا ہے بھارت پاکستان کو اس پانی سے محروم کر سکتا تھا۔ بھارت نے باؤنڈری کمشن کو برصغیر کی تقسیم کے وقت پانی کے حصوں کے بٹوارے سے متعلق یقین دلایا تھا کہ نئے انتظامات مکمل ہونے تک جو نظام بھی موجود ہے اس کا احترام کیا جائے گا خواہ ہیڈ ورکس کسی بھی ملک کی حدود میں واقع ہو۔

———✡———

نہری پانی کا معاہدہ

بھارت نے باؤنڈری کمشن کو نئے انتظامات مکمل ہونے تک موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کی یقین دہانی کرانے کے باوجود یکم اپریل 1948ء کو بھارت نے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے پاکستان کے لئے پانی کی فراہمی روک دی۔ اس بھارتی اقدام سے پاکستان میں معیشت کی بنیاد یعنی زراعت کی تباہی اور وسیع اراضی بنجر ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ ان پانچ ہفتوں میں مغربی پاکستان میں 15 لاکھ ایکڑ اراضی کو پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے فصلوں کی تباہی کی وجہ سے فصلوں کی تباہی کی صورت میں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جس پر پاکستان کی حکومت تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں پہلی مرتبہ پاک بھارت مذاکرات کی ابتداء ہوئی۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلا باقاعدہ معاہدہ 4 مئی 1948ء کو طے پایا جسے نہری پانی کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی طرف سے معاہدے پر اس وقت کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد، سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ نے دستخط کئے اور بھارت کی طرف سے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، این وی گیڈگل اور سردار سورن سنگھ نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کی تفصیل اس طرح ہے:

☆ مشرقی اور مغربی پاکستان کی حکومتوں کے درمیان باری دوآب اور دیپال پور کی نہروں میں آب رسانی سے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ حکومت مشرقی پنجاب کا استدلال یہ ہے کہ تقسیم پنجاب کے حکم اور ثالث کے ایوارڈ کے تحت مشرقی پنجاب کے تمام دریاؤں کے پانی کے حقوق مشرقی پنجاب کو ہی حاصل ہیں لیکن مغربی پنجاب کی حکومت اس موقف کے خلاف ہے اور اس کی رائے میں ثالث کے تحت اور بین الاقوامی قانون اور مساوات کے لحاظ سے ان دریاؤں کے پانی کو استعمال کرنے کا حق مغربی پاکستان کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

☆ مشرقی پنجاب کی حکومت نے ان نہروں کے ذریعے پانی کی فراہمی بعض شرائط پر پھر سے شروع کر دی ہے ان میں سے دو شرائط پر حکومت مغربی پنجاب کو اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک تو ماقبل پیرا گراف کے مطابق پٹہ کی ادائیگی ہے اور دوسری شرائط مادھو پور ہیڈ ورکس اور چھوٹی نہروں کی تعمیر کے خرچ سے متعلق ہے اور مشرقی و مغربی پنجاب کی حکومتوں کے مابین اس جھگڑے کے تصفیہ کے سلسلے میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس جھگڑے کا دوستی اور خیر سگالی کے جذبے کے تحت سمجھوتہ ہونا چاہئے۔ حکومت مشرقی پنجاب حکومت مغربی پنجاب کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے دریاؤں کا پانی اچانک بند نہیں کرے گی۔ جب تک کہ مغربی پنجاب کی حکومت اس سلسلے میں متبادل وسائل پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی وہ اپنے دریاؤں کو نہیں روکے گی۔

☆ حکومت مغربی پنجاب اپنی جانب سے مشرقی پنجاب کی حکومت کی اس تشویش کو تسلیم کرتی ہے جو اسے مغربی پنجاب کے مقابلہ میں کم ترقی یافتہ اور کم پانی والے علاقوں سے متعلق لاحق ہے۔ اس لئے قانونی سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں حکومتیں عملی طور پر اس مسئلہ کو اس بنیاد پر حل کرنے کی خواہاں ہیں کہ مشرقی پنجاب کی حکومت تدریجاً ان نہروں میں پانی کی بہم رسانی کم کرے تاکہ مغربی پنجاب کی حکومت کو وسائل وضع کرنے کے لئے مناسب وقت مل سکے۔

☆ مغربی پنجاب کی حکومت اس پر رضامند ہو گئی ہے کہ وہ فوراً بھارتی وزیر اعظم کی جانب سے مقرر کی ہوئی رقم ریزرو بینک آف انڈیا کے پاس جمع کرا دے۔ حکومت ہند اس رقم سے غیر متنازعہ حصہ فوری طور پر مشرقی پنجاب کی جانب سے فراہم کردہ پانی کی قیمت کے اندازے، پانی کے وسائل کے فنی سروے اور اسے ان نہروں میں استعمال کرنے کا جائزہ لینے کے بعد دونوں حکومتیں اپنے اپنے نمائندوں کے ذریعہ مذاکرات پر بھی رضامند ہو گئیں۔ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں مذکورہ بالا شرائط تسلیم کرتی ہیں اور دوستانہ حل کی متمنی ہیں۔

یہ وہ معاہدہ تھا جس نے پاکستان کو دریاؤں سے محروم کر دیا جس کے نتیجے میں

1952ء میں شدید غذائی بحران پیدا ہوا۔ یہ ایک خفیہ معاہدہ تھا جس کی تفصیلات پاکستانی اخبارات میں شائع نہیں کی گئی تھیں اس کا انکشاف 1952ء میں اس وقت ہوا جب غذائی بحران پر بحث کے لئے حزب اختلاف نے ایک تحریک التوا پیش کی۔ نواب افتخار حسین خان ممدوٹ نے حزب اختلاف کے سربراہ کی حیثیت سے بحث کا آغاز کیا اور میاں ممتاز دولتانہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے 1948ء میں یہ معاہدہ کیا تھا جس میں انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ ہندوستان کے دریاؤں سے جو پانی ہمیں مل رہا ہے اس پر ہمارا کوئی حق نہیں جتنا پانی ہم ان دریاؤں سے لیں گے اس کی قیمت ادا کریں گے۔ اس وقت بھارت نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں خود پانی کی قلت کا سامنا ہے لہٰذا ہم آپ کو پانی نہیں دے سکتے اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہمیں اپنے وسائل وضع کرنے کے لئے چھ سال کی مہلت دے دیں۔ الغرض اس معاہدے کے تحت راوی، ستلج اور بیاس پر جو پاکستان کی ایک تہائی زمین کو سیراب کرتے تھے بھارت کا حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا۔

معاہدہ سندھ طاس

نہری پانی کے معاہدے کے نتیجے میں پانی کی فراہمی تو بحال ہوگئی مگر بھارت نے پانی کی بندش کو پاکستان کے ساتھ مذاکرات کے لئے ایک اہم ہتھیار کے طور استعمال کرنے کا جارحانہ رویہ جاری رکھا۔ عالمی بینک نے یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے 1951ء میں اپنی خدمات پیش کیں مگر جنرل محمد ایوب خان کے اقتدار میں آنے تک کوئی مثبت پیش رفت نہ ہوسکی۔

مئی 1954ء میں وادیٔ سندھ کے پانی کی تقسیم پر پاکستان کی عالمی بینک کے ساتھ الجھنیں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں اور اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس مسئلے کا کوئی باقاعدہ حل نکالا جائے کیوں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ کسی بھی وقت سنگین صورت اختیار کرسکتا ہے اس دوران 24 اپریل 1959ء کو پاکستانی صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اچانک بھارت اور پاکستان کے مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کردی جس کا بھارت میں غلط مطلب لیا گیا۔ چنانچہ بھارتی وزیراعظم نے لوک سبھا سے خطاب میں کہا کہ ہم ہرگز کسی بھی ملک سے فوجی اشتراک نہیں کریں گے خواہ حالات کیسے بھی خراب کیوں نہ ہوجائیں۔

پانی کے مسئلے پر مذاکرات کرنے کے لیے صدر ایوب یکم ستمبر 1960ء کو نئی دہلی گئے اور 19 ستمبر تا 23 ستمبر 1960ء پنڈت نہرو نے پاکستان کا دورہ کیا۔ 21 ستمبر کو مری میں صدر ایوب اور پنڈت نہرو کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں ''معاہدہ طاسندھ'' عمل میں آیا، جس کو آج بھی ایک متنازع حیثیت حاصل ہے اور پاکستان میں پانی کی کمیابی کا شاخسانہ اسی معاہدے کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس وقت سندھ کے نمائندوں نے اس معاہدے کی سخت ترین مخالفت کی تھی لیکن چوں کہ پاکستان کی سول و ملٹری بیورو کریسی پر عالمی بینک کے اس وقت کے صدر یوجین بلیک کا دباؤ تھا اس لئے

پاکستان اس معاہدے پر دستخط پر مجبور ہوا۔

پاکستان کو طاس سندھ معاہدے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا مسئلہ کشمیر بھی سندھ طاس معاہدے سے وابستہ ہے۔ بھارت کے دفائی تجزیاتی ادارے طاس سندھ معاہدے کو منسوخ کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ کارگل کے بحران میں بھارت میں فوجی اور سیاسی سطح پر طاس سندھ معاہدے کو منسوخ کرنے پر غور کیا گیا تھا اس معاہدے کے تحت بھارت کسی وقت بھی پاکستان کے دریاؤں کے پانی کو روک کر پاکستان کے ذرعی نظام کو تباہ کر سکتا ہے۔ بھارت پانی کے ہتھیار کو سٹرٹیجک مقاصد کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ پاکستانی ماہرین کا کہنا ہے کہ طاس سندھ معاہدہ بھارت کے پاس ایک ایسی کنجی ہے جس کی بنیاد پر وہ پورے زرعی نظام کو تلپٹ کر سکتا ہے۔ معاہدے کے خاص نکات یہ تھے:

☆ معاہدے میں اس امر کی تشریح کر دی گئی ہے کہ بھارت بلا کسی بندش کے مشرقی دریاؤں کا پانی استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پاکستان مشرقی دریاؤں کے پانی کو بالکل استعمال میں نہیں لا سکتا۔ ستلج اور راوی بھارت میں داخل ہونے سے بیشتر کچھ دور تک پاکستان میں بہتے ہیں چنانچہ معاہدے کے مطابق پاکستان ان دریاؤں کا پانی گزرنے والے علاقوں میں زراعت کے علاوہ دوسرے استعمالات کا بھی حق رکھتا ہے۔ لیکن معاہدہ پاکستان پر یہ بندش عائد کرتا ہے کہ ان دریاؤں کے بہاؤ کو اس وقت تک بالکل نہ چھیڑے جب تک یہ کلیتاً پاکستان میں داخل نہ ہو جائیں۔

☆ معاہدے میں ان مقامات کی وضاحت کر دی گئی ہے جن مقامات پر یہ دریا بالکل پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ ستلج کے سلسلے میں نیو جاستہ کا مقام ہے جو سلیمان کی سے اوپر واقع ہے دریائے راوی کے سلسلے میں بمبن والا راوی، بیدیال، دیپال پور ربط۔

☆ مغربی دریا چناب، جہلم اور سندھ اپنے بالائی علاقوں میں بھارت کے کنٹرول سے گزرتے ہیں، بھارت ان پر کسی قسم کا ڈیم تعمیر نہیں کرے گا، نیز پاکستان اور بھارت دریاؤں کے قدرتی بہاؤ کے مطابق کام کریں گے تا کہ شکایت کا

موقع پیدا نہ ہو۔

عالمی بینک کی ثالثی میں طے پانے والے اس معاہدے کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے دریاؤں پر کوئی منصوبہ شروع نہیں کرسکتا اور نہ ہی ایسا منصوبہ بنا سکتا ہے جس سے پانی کی آمد اور اخراج کی یکساں شرح برقرار نہ رہے اور اس کا بہاؤ متاثر ہو۔ اس معاہدے کے مطابق بھارت بجلی یا توانائی کے لئے پاور ہاؤس تو تعمیر کرسکتا ہے لیکن اسے پانی کے بہاؤ کو متاثر نہ ہونے اور پاکستان کو پیشگی اطلاع دیئے جانے سے مشروط کیا گیا ہے۔

سندھ طاس معاہدے کے بارے میں اس وقت پاکستان کے اندر دو مختلف قسم کی آراء پائی جاتی ہیں عمومی تاثر یہی ہے کہ اس معاہدے سے پاکستان کے لئے تین مغربی دریاؤں سے پانی کی بلا رکاوٹ فراہمی قریب قریب یقینی ہوگئی اور پانی کے معاملے پر بھارت کے ساتھ مسلسل چلی آرہی چپقلش بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ اس کے برعکس بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ سندھ طاس معاہدے کے مندرجات کے برخلاف بھارت ان دنوں مقبوضہ کشمیر میں دریائے جہلم پر وولر بیراج اور دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم کی تکمیل کے درپے ہے۔ لہٰذا سندھ طاس معاہدہ سراسر پاکستان کے لئے خسارے کا سودا ہے۔

وولر بیراج منصوبہ:

وولر جھیل مقبوضہ کشمیر میں دریائے جہلم کا سب سے بڑا قدرتی ڈیم ہے۔ دریائے جہلم وادی کشمیر کے جنوب کی طرف ویری ناگ نامی چشمے سے نکلتا ہے اور یہ مقام چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد دریائے جہلم سرینگر شہر میں داخل ہوتا ہے۔ راستے میں کئی چھوٹے بڑے معاون ندی نالے اس میں مدغم ہوتے ہیں اور سرینگر شہر پہنچنے تک یہ ایک بڑے دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سری نگر شہر کے قریب ڈھل جھیل کا وافر پانی بھی اس دریا میں شامل ہو جاتا ہے جہاں اسے کنٹرول کرنے کے لئے آہنی گیٹ نصب ہے اور پھر یہی دریائے جہلم سرینگر سے تقریباً دس میل نیچے وولر جھیل میں جا ملتا ہے۔ دریائے جہلم اس جھیل میں شمال کی طرف سے داخل ہوتا ہے اور جنوب کی طرف سوپور اور بارہ مولا سے گزرتا ہوا آزاد کشمیر کے علاقے مظفر آباد میں داخل ہوتا ہے مظفر آباد سے دریائے جہلم آزاد کشمیر کے ضلع میرپور کی طرف آتا

ہے اور منگلہ ڈیم کا مخزن بنتا ہے۔

بھارت نے 1984ء کے دوران مقبوضہ کشمیر میں سری نگر سے سوپور کی طرف 52 کلومیٹر دور جھیل وولر سے پانی کے اخراج کو روکنے کے لئے بیراج کی تعمیر کی کوششوں کا آغاز کیا۔ یہ ایک بڑا منصوبہ ہے جس میں تین لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ اس بیراج کے ڈیزائن میں 18 فٹ بلند 8 سپل ویز شامل ہیں۔ بیراج کی تعمیر سے بھارت دراصل سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ سندھ طاس معاہدے کی رو سے Main جہلم کی ابتداء ویری ناگ سے سمجھی جائے گی۔ لفظ Main کی اصطلاح میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی دریا کے تمام چینل، شاخیں اور ان دریاؤں کو ملانے والی جھیلیں جو اس دریا کے اصل پاٹ کا حصہ ہوں۔ Main کی تشریح کے مطابق اصل پاٹ کا حصہ سمجھی جائیں گی۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وولر جھیل کا پانی پاکستان کا ہے، بھارت اس پر بیراج تعمیر کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

وولر جھیل کی حیثیت جہلم کے دونوں حصوں کو ملانے والی جھیل کی ہے اور آرٹیکل۔ 1 کے مطابق وولر جھیل کی دریائے جہلم سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں البتہ دریائے جہلم میں گرنے والے نالوں پر بھارت کا حق ہے کیوں کہ آرٹیکل۔ 1 کی تشریح 4 کے مطابق مددگار نالوں کو اصل پاٹ میں شامل نہیں کیا گیا۔ دریائے جہلم جو مظفر آباد میں دومیل کے مقام پر دریائے جہلم میں گرتا ہے دراصل بھارت کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ دریائے نیلم کا پانی اوپر ہی اوپر سے وولر جھیل میں ڈال کر وولر بیراج کے ذریعے اسے اپنے استعمال میں لائے لیکن سندھ طاس معاہدے کی رو سے بھارت کو یہ حق حاصل نہیں، اس لئے کہ وولر جھیل اور اس کا پانی دریائے جہلم کا حصہ ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ معاون جھیل ہونے کی حیثیت سے وولر جھیل خود جہلم ہے اس کے پانی کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا البتہ سیلاب کو کنٹرول کرنے کے لئے پانی کو ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ سیلاب کا خطرہ ٹل جانے کے بعد ذخیرہ شدہ پانی دوبارہ دریائے جہلم میں ڈال دیا جائے گا۔

منصوبے کا علم ہونے پر پاکستان نے بھارت سے وولر بیراج کی تعمیر کے لئے رضامند کرنے کے لئے ہر حربہ اختیار کر رہا ہے اس پس منظر میں بھارت کے مقاصد یہ ہیں

کہ پاکستان اور بھارت کے مابین باہمی سمجھوتے کے تحت سندھ طاس معاہدہ غیر موثر ہو جائے۔ بھارت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طویل المعیاد اور مستقل منصوبوں کی تعمیر میں پاکستان کی آمادگی سے مقبوضہ جموں وکشمیر پر بھارت کا موقف درست قرار پائے گا۔

بھارت نے موقف اختیار کیا کہ دریائے جہلم کا ایسا پانی زیر استعمال لائے گا جو سندھ طاس معاہدہ کی خلاف ورزی قرار نہ پاسکے بلکہ اس کا اقدام معاہدہ کے عین مطابق ہے۔ دوسرا یہ کہ بیراج کے ذریعے وہ پانی کو نہیں روکے گا بلکہ صرف کنٹرول کرے گا تاکہ ننگلی سے بارہ مولا تک سردیوں کے موسم میں بھی دریائی سفر کو ممکن بنایا جاسکے کیوں کہ سردی کے موسم میں اس مقام پر دریائے جہلم کا پانی صرف ایک فٹ رہ جاتا ہے جس میں کشتی چلانا ناممکن ہے۔ بھارت کے بقول بیراج کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ دولر جھیل میں 30 لاکھ ایکڑ فٹ پانی جمع کیا جاسکے اور اس سے پاکستان کے لئے روزانہ 4 ہزار کیوسک پانی چھوڑا جائے تاکہ پاکستان کو پانی کی بدستور فراہمی برقرار رہے اور کشتی رانی کا امکان بھی رہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ہر طرف بھارت نے اپنی فوجی ضروریات کے تحت سڑکوں کا جال بچھا رکھا ہے حتیٰ کہ کنٹرول لائن کے قریبی علاقہ میں بھی سڑکیں قائم ہیں۔ سب زمینی راستوں کی موجودگی میں آبی راستہ پر دلالت کو عذر لنگ کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے لیکن بعض دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ شائد بھارت دریا کے اس حصے کو فوجی نقل وحرکت کے لئے زیادہ محفوظ خیال کرتا ہے اسی لئے وہ ایسی احمقانہ حرکت پر بضد ہے۔ جبکہ بھارت اپنے موقف پر مسلسل ڈٹا ہوا ہے اور مذاکرات میں کسی قسم کی پیش رفت ہونے کے بجائے مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔

وولر بیراج کی تعمیر کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ 1998ء کے بعد جب مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک اٹھی تو بھارت نے وولر بیراج کی تعمیر کا 80 فیصد کام مکمل کیا تھا جس میں رہائشی کالونیاں، تعمیراتی گودام اور دفاتر کے علاوہ 392 فٹ طویل بیراج کنکریٹ کے ستونوں کی مدد سے بنایا گیا ڈھانچہ اور دریا کے اندر تعمیر کیا گیا پختہ فرش شامل تھا مجاہدین نے 1989ء اور 1990ء میں پے در پے حملے کر کے وولر بیراج کی تمام تعمیرات

کو تباہ کر دیا۔ بھارتی ذرائع ابلاغ نے خود تسلیم کیا کہ وولر بیراج کی تباہی سے بھارت کو 2 ارب روپے سے زیادہ کا نقصان ہوا۔اب بھارت نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ وولر بیراج کی تعمیر کا شوشہ چھوڑ کر اس معاملے کو امن روڈ میپ میں شامل کر دیا ہے۔

وولر بیراج کے تنازعہ پر ہونے والے پاک بھارت مذاکرات ہمیشہ ناکامی سے عبارت ہوئے۔اس سے سندھ طاس کمشن نے مذاکرات کے آٹھ ادوار مکمل کیئے اور بالآخر 1986ء میں مذاکرات کی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا۔1998ء میں سیکرٹری خارجہ کی سطح پر ہوئی جو ناکام رہی مجموعی طور پر تیسری مرتبہ اور امن روڈ میپ کے تحت کمپوزٹ ڈائیلاگ کے طور پر دونوں ممالک نے پہلی بار اس قضیہ پر بات چیت کی لیکن تنازعہ کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

بگلیہار ڈیم منصوبہ:

وولر بیراج کی طرح بگلیہار ڈیم بھی متنازعہ معاملہ ہے دریائے چناب پر مقبوضہ کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کے چندرکوٹ ایریا میں جموں سے 150 کلو میٹر دور 450 میگا واٹ پیداواری صلاحیت کا حامل بگلیہار ڈیم زیر تعمیر ہے۔1999ء میں شروع کیے گئے اس پاور پراجیکٹ کا پہلا مرحلہ اپریل 2005ء میں مکمل کر لیا جائے گا جبکہ باقی ماندہ تعمیراتی مراحل 2006ء پایہ تکمیل کو پہنچیں گے۔اگر یہ ڈیم اپنے موجودہ ڈیزائن میں تعمیر کر لیا جاتا ہے تو پاکستان کے لئے یومیہ 7 سے 8 ہزار کیوسک پانی کی کمی واقع ہو جائے گی اور اس سے پاکستان کو ربیع کے موسم میں اپنے حصے کے تقریباً اڑھائی لاکھ کیوسک پانی سے محروم ہونا پڑے گا کیوں کہ اس ڈیزائن میں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔اس منصوبے میں گیٹ نما سپل وے کی تعمیر بھی شامل ہے جس سے اس کی ذخیرہ جاتی گنجائش ایک لاکھ 64 ہزار فٹ تک بڑھ جاتی ہے۔بگلیہار ڈیم میں دسمبر، جنوری اور فروری کے مہینوں کے دوران 26 دنوں کے لئے پانی ذخیرہ کیا جائے گا جس کی وجہ سے پاکستان کے زرعی شعبے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔اس صورتحال کے پیش نظر پاکستان نے بھارت سے مذکورہ ڈیم کا ڈیزائن تبدیل کرنے اور نئے ڈیزائن انجینئر سے رجوع کرنے کا کہا ہے تاکہ ڈیم کے حوالے سے اس

کے خدشات کا ازالہ کیا جا سکے۔

پاکستان کا موقف ہے کہ ڈیزائن ایسا ہو جس کے مطابق بھارت صرف بجلی پیدا کر سکے اور ڈیم میں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش نہ ہو۔ پاکستان کا موقف دونوں ممالک کے درمیان 1960ء میں ہونے والے سندھ طاس معاہدہ کے عین مطابق ہے جبکہ بھارت کا موقف ہے کہ بگلیہار پاور پراجیکٹ رن آف دی ریور کی بنیاد پر بنایا جا رہا ہے اور اس سے صرف بجلی پیدا کی جائے گی، لیکن ڈیم کا ڈیزائن بھارت کے موقف کی تائید نہیں کرتا۔ پانی کے بہاؤ کی اصطلاح میں رن آف دی ریور سے مراد ایسی صورت حال ہے جس میں پانی کی آمد اور اخراج کی مقدار ایک جیسی ہوتی ہے تو اسے کسی طور پر ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان شروع ہی سے اس ڈیم کی تعمیر کے خلاف اعتراض کرتا چلا آ رہا ہے، بھارت ایک طرف تو سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی پر بضد ہے اور دوسری طرف مختلف عوامل کے تابع محض وقت گزاری کے لئے پاکستان کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ بھارت کی اس دو عملی کی وجہ سے بدیہی طور پر لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر تاخیری حربے اختیار کر رہا ہے تاکہ پاکستان کو مذاکرات میں الجھائے رکھ کر ڈیم کی تعمیر مکمل کر لی جائے۔ صورت حال کی سنگین کے پیش نظر پاکستان نے بھارتی حکومت سے احتجاج کیا۔ 12 جولائی 2003ء کو سندھ طاس کے پاک بھارت کمشنروں کے اجلاس میں پاکستانی حکام نے بھارت سے ڈیزائن تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا مگر بھارت ٹس سے مس نہ ہوا۔ اگست اور دسمبر 2004ء میں پاکستان نے بھارت کو مذکورہ ڈیم کے حوالے سے اپنے اعتراضات کو دور کرنے یا تنازعہ کے حل کے لئے عالمی ماہرین کی تعیناتی کے لئے دو لیگل نوٹس بھیجے مگر بھارت اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ سندھ طاس معاہدے کی شق 9 اے کی رو سے جب فریقین میں کوئی معاملہ سندھ طاس کمشن کے دو طرفہ مذاکرات سے حل نہ ہو تو غیر جانبدار ماہرین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں اور معاملہ مصالحتی عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

دونوں ملکوں کے درمیان بگلیہار ڈیم کے تنازعہ پر پہلے مذاکرات اکتوبر 2003ء کو نئی دہلی میں ہوئے۔ ان مذاکرات کے بعد پاکستانی انڈس کمشنر کی

سرکردگی میں تین رکنی فنی ماہرین کی کمیٹی نے 21 اکتوبر 2003ء کو ڈیم کی سائٹ کا دورہ کیا اور معائنے کے بعد پاکستانی ماہرین نے اپنی حکومت کے خدشات کی تصدیق کی کہ مذکورہ ڈیم 1960ء کے سندھ طاس معاہدے کے منافی ہے۔ اس سلسلے کے مذاکرات کا دوسرا دور جنوری 2004ء میں اسلام آباد میں ہوا۔ مذاکرات میں پاکستان نے ایک مرتبہ پھر بھارت پر زور دیا کہ سندھ طاس معاہدے کے تحت بگلیہار ڈیم میں پانی ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے موجودہ ڈیزائن میں تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ دریائے چناب میں پانی کا بہاؤ متاثر نہ ہو اور بھارت صرف بجلی پیدا کر سکے۔ بھارتی مندوب نے اس بات کا عندیہ دیا کہ پاکستان کے اعتراضات کے حوالے سے بھارت مذکورہ ڈیم کے ڈیزائن پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہے اور پاکستان کو یقین دلاتا ہے کہ ڈیم سے صرف بجلی پیدا کی جائے گی اور یہ کہ اس ڈیم میں صرف اتنا ہی پانی ذخیرہ کیا جائے گا جتنا بجلی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوگا جس سے دریائے چناب کے پانی کی آمد اور اخراج بھی ایک ہی شرح سے ہوگی اور اس کا بہاؤ متاثر نہیں ہوگا۔ تاہم بھارت کی طرف سے اس یقین دہانی کے باوجود کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

اس سلسلے کے مذاکرات کا تیسرا دور نئی دہلی میں 4 سے 6 جنوری 2005 کو پانی و بجلی سیکرٹری کی سطح پر ہوا۔ اس مرتبہ بھی بھارت اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا بلکہ تکنیکی طور طریقوں سے وقت گزارنے کے حربے اختیار کرتا رہا ہے۔ دونوں ممالک نے چھ مختلف تکنیکی ایشوز پر بات چیت کی لیکن کوئی بڑا بریک تھرو نہیں ہو سکا اور اب اس بات کا امکان بڑھ گیا ہے کہ پاکستان اپنی بقاء کی جنگ لڑنے کے لئے ورلڈ بینک جو سندھ طاس معاہدے کا ضامن اور آبی تنازعات کی صورت میں ثالث ہے کے پاس اپنا مقدمہ پیش کرے گا جو معاہدے کے مطابق اپنے غیر جانبدار مبصرین کے ذریعے اس تنازعہ کو حل کرائے گا۔ بصورت دیگر اب یہ تنازعہ سنگین صورت حال اختیار کر چکا ہے ماہرین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ آئندہ اگر پاک بھارت جنگ ہوئی تو پانی کے مسئلے پر ہوگی۔

پاک بھارت امن معاہدے

پاکستان اور بھارت کے درمیان بدقسمتی سے منافقت کا آغاز تقسیم ہندوستان کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، اس سے پہلے جب دسمبر 1947ء میں ریزروبنک آف انڈیا کے پاس محفوظ پاکستان کے 75 کروڑ روپے میں سے پاکسان کو صرف 20 کروڑ ادا کیے گئے اور 55 کروڑ بھارتی حکومت نے روک لیے۔ جلتی پر تیل کا کام 27 اکتوبر 1947ء کو بھارتی حکومت کے اس اعلان نے ہی کر دیا تھا، جس کے مطابق حکومت دہلی نے کشمیر اور بھارت کے الحاق کا اعلان کر دیا، جس پر حضرت قائداعظمؒ نے سختی سے اس الحاق کو رد کر دیا اور اسے فوجی طاقت کے بل بوتے پر کشمیریوں کو غلام بنانے کے سازش قرار دیا اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بھارتی حکومت نے یکم جنوری 1948ء کو خود مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ پاکستان نے 16 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل کے سامنے اپنی شکایت پیش کی۔

نیویارک میں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کی عالی شان عمارت میں ایک شان دار لائبریری ہے جس میں لاکھوں کتابیں عالمی ادارہ اس کی ایجنسیوں کے ریکارڈ اور نادر دستاویزات سینکڑوں الماریوں میں مجتمع ہیں۔ اس لائبریری میں پچاس سالہ تنازع کشمیر کی خوں چکاں داستانیں بھی موجود ہے۔ سلامتی کونسل میں جنوری 1948ء سے کشمیر کے بارے میں اجلاسوں کی مکمل روداد بھارت اور پاکستان کے مندوبین میں تقریری معرکے، سیکرٹری جنرل کو کشمیر پر رپورٹیں، کشمیر کے لیے کمیشنوں اور کمیٹیوں کی سفارشات اور کشمیر میں اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کے مراسلے کشمیر کیس کی درجنوں جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر کے حرف اول کا ریکارڈ جلد اول میں قلم بند ہے اور پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور بھارت کے نمائندہ گوپالا سوامی آئنگر کے درمیان جو تقریری معرکے ہوئے ان کی لفظ بہ لفظ تفصیل انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں موجود ہے۔

بھارت کے حکمران دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ وہ پاکستان کو مسئلہ کشمیر کو ایک بین

الاقوامی مسئلہ نہیں بنانے دیں گے اور اس پر بات چیت 1972ء والے شملہ معاہدے کے تحت دوطرفہ بلا بیرونی شرکت کے ہوسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود بھارتی حکومت نے یکم جنوری 1948ء کو تنازع کشمیر کو سلامتی کونسل کی گود میں ڈال کر ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا اور یہ عالمی ادارہ اس کے حل کے لیے فریق بن گیا۔

اقوام متحدہ کے دستور اور بین الاقوامی قانون کے تحت ریاست جموں و کشمیر کی حیثیت متنازع ہے اور 1948ء سے اقوام متحدہ نے بھارت اور پاکستان کے درمیان جو جنگ بندی دونوں کی مرضی سے نافذ کی اس کے استقرار اور نگہداشت کا کام عالمی ادارہ اپنے فوجی مبصروں کے ذریعے اس وقت سے کر رہا ہے۔ ہر سال ستمبر میں سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو پیش کی جانے والی ادارے کی سالانہ رپورٹ میں کشمیر کی صورت حال کو شامل کرتے ہیں۔

تاریخی دستاویزات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نوزائیدہ بھارتی حکومت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنی کابینہ اور اپنے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اجازت سے بذریعہ تار پاکستان کے خلاف کشمیر میں جارحیت کی شکایت اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو لیک سکسس کو نیو یارک ارسال کی۔ بھارت کی شکایت کو برقیہ سیکرٹری جنرل ٹرگوی لی کو نیو یارک میں یکم جنوری 1948ء کی صبح میں ملا۔ عالمی ادارے کا عملہ سال نو کی خوشیوں میں لگا ہوا تھا۔ بھارت نے اقوام متحدہ کے منشور کے آرٹیکل 35 کا سہارا لیا جو عالمی امن کے لیے ایک بڑے خطرے کی نشان دہی کرتا ہے۔ سیکرٹری جنرل کے نائب نے سلامتی کونسل کے صدر سے رابطہ کیا اور بھارتی مراسلے کی نقل و دستور کے تحت کاروائی کے لیے ارسال کر دی۔

ریاست جموں اور کشمیر اس وقت خون آشام جنگ کی لپیٹ میں تھی جس کی آگ خود بھارت نے لگائی تھی۔ 27 اکتوبر 1947ء کو بھارت نے الحاق کشمیر کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے سو طیاروں کے ذریعے پانچ ہزار بھارتی فوجی اور مہلک ترین اسلحہ سری نگر کے ہوائی اڈے پر اتارنا شروع کر دیں اور بھارت نے شراب کے رسیا مہاراجہ ہری سنگھ سے بھارت سے الحاق کے مشکوک خط پر دستخط حاصل کرا لیے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ

سب فراڈ تھا اور دستاویز الحاق جعلی تھی۔ بھارت کی اس جنگی کاروائی کی کمان بھارت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خود کی۔ انہوں نے اپنی رام کہانی میں دعویٰ کیا کہ نہرو اور پٹیل نے ان پر درخواست کی تھی کہ وہ دوسری جنگ عظیم کے ایک فاتح ایڈمرل کے ناتے سے کشمیر مہم کی کمان کریں کیونکہ نہرو اور پٹیل کو فن جنگ کا تجربہ نہ تھا۔

قائداعظمؒ نے جنرل گریسی کو، جو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف تھا، کشمیر میں فوج بھیجنے کا حکم دیا، جسے دونوں ممالک کی افواج کے فیلڈ مارشل جنرل آرکنیک سے منظوری حاصل کرنے کے چکر میں ضائع کر دیا گیا۔ جنرل آرکنیک لاہور پہنچا اور قائداعظمؒ کو یقین دلایا کہ مذاکرات کے ذریعے یہ مسئلہ کر لیا جائے گا۔

اقوام متحدہ میں بھارتی مندوب مسٹر پی پلائے نے سیکرٹری جنرل سے اور ان کے عملے 2 جنوری 1948ء کو رابطہ کیا اور سلامتی کونسل کی جانب سے جلد کاروائی کا مطالبہ کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ کونسل ہفتے کو بھی غور و خوض کرے جو تعطیل کا دن تھا اور اسٹاف کو ''اور ٹائم'' دینا پڑتا تھا۔ سلامی کونسل کے صدر نے اراکین سے مشورہ کے بعد 6 جنوری کو اجلاس بلایا اور بھارتی تار کی نقول بھارت اور پاکستان کے مندوبین کو ارسال کرائیں۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر، مرزا ابوالحسن اصفہانی عالمی ادارے میں پاکستان کو نمائندگی بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے منگل کے دن سلامتی کونسل کو بتایا کہ حکومت پاکستان تنازع کشمیر کے بارے میں جواب دعویٰ کے لیے اپنے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو جلد از جلد بھیج رہی ہے۔ مگر اس میں ایک ہفتے کی تاخیر ہو گی کیونکہ وہ رنگون میں برما کے جشن آزادی میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں اور واپسی پر فوراً نیویارک روانہ ہو جائیں گے۔ موسم کی خرابی کی باعث فضائی سفر میں تاخیر ہو سکتی ہے اس لیے سلامتی کونسل ایک ہفتے کے لیے بحث کو موخر کر دے۔

بھارتی حکومت کوشاں تھی کہ یہ سلامتی کونسل بلا کر ظفر اللہ کے جواب دعویٰ سے پاکستان کے خلاف جارحیت کے الزام میں تادیبی کاروائی شروع کر دے۔ پنڈت نہرو سر ظفر اللہ کی قانونی مہارت اور موثر خطابت سے واقف تھے اور ان کو خوف تھا کہ سلامتی کونسل میں سر ظفر اللہ کے خطاب کے باعث بھارتی سازش ناکام ہو جائے گی۔ مسٹر اصفہانی نے 8 جنوری 1948ء کو قائداعظم محمد علی جناح کو نیویارک سے ایک خط میں سلامتی کونسل کے

منگل والے اجلاس کی تفصیل ارسال کی۔ کونسل نے سر ظفر اللہ کی نیویارک میں آمد تک اجلاس ملتوی کر دیا۔ بھارتی مندوب اس عمل پر خوش نہ تھے۔

اس عرصہ میں بھارتی حکومت نے ایک سرکاری ماہر قانون گوپا سوامی آئنگر کو سلامتی کونسل میں بھارتی نالش پیش کرنے اور سر ظفر اللہ سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ سر ظفر اللہ 1941ء سے 1947ء تک ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے جج رہ چکے تھے۔ انہوں نے نیویارک میں آمد کے ساتھ ہی بھارتی شکایت کا مطالعہ کیا، جوابِ دعویٰ کے نوٹس بنائے اور سلامتی کونسل کے اجلاسوں میں 15 جنوری سے شریک ہو گئے۔ گوپالا سوامی آئنگر نے بھارتی کیس پیش کیا اور سرحد کے قبائل اور پاکستان پر جھوٹے الزامات لگائے، پاکستان میں سکھوں اور ہندوؤں پر مظالم کی من گھڑت کہانیاں سنائیں اور ریاست جموں و کشمیر میں ہندو ڈوگرہ حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت کو پاکستان کی سازش اور جارحیت بتایا۔ 16 اور 17 جنوری کے اجلاسوں میں سر ظفر اللہ نے پانچ گھنٹے کی جوابِ دعویٰ کی زبردست تقریر میں بھارتی الزامات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ان کی اس تقریر کے بارے میں سفیر پاکستان اصفہانی صاحب نے گورنر جنرل پاکستان قائد اعظم کو اپنے خط مورخہ 22 جنوری 1948ء میں ان الفاظ میں مطلع کیا۔

> ''ہم سلامتی کونسل کی کاروائی میں مشغول ہیں۔ ہم حکومت کو اس بارے میں پوری اطلاعات دے رہے ہیں۔ بھارت اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا ہوا ہے۔ انشاء اللہ بھارت کو سخت ترین سبق ملے گا۔ ظفر اللہ خان اس کام میں ان تھک محنت کر رہے ہیں۔ سلامتی کونسل کے سامنے پاکستان کے موقف کو انہوں نے شان دار طریقے سے پیش کیا اور بھارتی مندوبین سے اجلاسوں میں ان کی گفتگو ہمارے لیے فہم اور تدبر کا بہترین مظاہرہ ہوتی ہے۔ بھارت کے اعلیٰ ترین نمائندوں کو وہ بحث میں شکست فاش دیتے ہیں۔ بھارت نے تعطل پیدا کرایا ہے۔ آج سلامتی کونسل کا کشمیر کے بارے میں پھر اجلاس ہے۔''

سلامتی کونسل نے 20 جنوری 1948ء کو ایک قرارداد کے ذریعے ایک سہ رکنی

کمشن (UNCIP) برائے ہندو پاکستان مقرر کیا جسے ہدایت کی گئی کہ وہ بھارت اور پاکستان جا کران کی حکومتوں سے گفت وشنید کرے اور مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرے۔اس کمشن کے ایک رکن چیکوسلواکیہ کے مندوب جوزف کاربل تھے جن کی بیٹی میڈلین البرائٹ ماضی قریب میں امریکہ کی وزیر خارجہ رہی ہیں۔مسٹر کاربل نے مسئلہ کشمیر پر ایک اہم کتاب Danger In Kashmir لکھی وہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کا حامی تھا 1948ء کے آخری دنوں میں بھارتی حکومت کونسل سے ناراض ہوگئی اور بھارتی مندوب نے دھمکی دی کہ اگر بحث کا دائرہ بھارتی نالش سے زیادہ ہوگیا تو بھارتی وفد بحث میں شریک نہیں ہوگا۔

سر ظفر اللہ خان نے اس بارے میں سلامتی کونسل کے اراکین سے بات کی ان کی کوشش تھی کہ سلامتی کونسل مسئلہ کے لئے مثبت اقدام کرے اور بھارت کی دھمکی سے مرعوب نہ ہو۔بھارتی حکمرانوں کو کشمیر میں اقوام متحدہ کی نگرانی استصواب رائے کی تجویز پسند نہ آئی، پنڈت نہرو نے سری نگر میں شیخ عبداللہ کی قیادت میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کرادی تھی اور بعد میں بھارت نے شیخ عبداللہ کو کونسل میں اپنی حمایت کے لئے بھیجا ۔بھارت کی ناراضگی کے باوجود سلامتی کونسل نے 49-1948ء کی قرارداد میں کشمیر کی جنگ بندی اور استصواب رائے کا فیصلہ کیا۔یہ اہل کشمیر کے ساتھ ناانصافی ہے کہ بھارت کی ہٹ دھرمی کے باعث سلامتی کونسل کی 49-1948ء کی استصواب رائے کی قرارداد پرعمل درآمد نہ ہوسکا۔

صلح پسند قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔نہرو نے 29اکتوبر 1948ء کو لاہور آنے کا وعدہ کیا، لیکن بیماری کے بہانے معذرت کرلی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن لاہور پہنچا، جو قائداعظمؒ سے متعلق اپنے متعصبانہ نظریات کے لیے پہلے ہی شہرت حاصل کرچکا تھا۔یکم نومبر 1948ء کو لاہور میں قائداعظمؒ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان ساڑھے تین گھنٹے مذاکرات ہوئے قائداعظم نے تین تجاویز پیش کیں جن میں فوری جنگ بندی، بھارتی فوج کی واپسی اور استصواب رائے شامل تھا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نیا شوشہ کھڑا کردیا کہ رائے شماری اقوام متحدہ کی نگرانی میں کروائی جائے جس پر قائداعظم

رضامند نہیں تھے وہ سمجھتے تھے کہ دونوں گورنر جنرل یہ کام بخوبی کر سکتے ہیں۔

16 نومبر 1948ء کو لیاقت علی خان نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے کی نہرو کی تجویز مان لی۔ 20 جولائی 1950ء کو دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کی کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں وزیر داخلہ سردار پٹیل کے منفی کردار کی وجہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ یہ کانفرنس اقوام متحدہ کے نمائندے کی نگرانی میں ہوئی تھی جو بار آور نہ ہو سکی۔ 1953ء میں جب محمد علی بوگرہ پاکستان کے وزیراعظم بنے تو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی تلخی کو کم کرنے کی خواہش دونوں اطراف سے ظاہر کی گئی اور جون 1953 میں لندن میں ہونے والی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان لندن میں مذاکرات ہوئے، جہاں فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے کمشن برائے پاک و ہند کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لئے مذاکرات کا سلسلہ دونوں ممالک کے درمیان جاری رہنا چاہئے۔ یہ دونوں ممالک وزرائے اعظم کے درمیان ہونے والی دوسری ملاقات تھی جو کراچی میں 25 جولائی سے 27 جولائی 1953ء تک جاری رہی۔ لیکن اس ملاقات کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

مئی 1954ء میں پاکستان مغربی طاقتوں کا حلف بنا تو بھارت نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔ اس دوران پاکستان اور مغربی ممالک کے درمیان کچھ معاہدے بھی ہوئے 1954ء میں پاکستان سینٹو کے بعد سیٹو کا بھی ممبر بن گیا۔ اس مشترکہ دفاعی تنظیم میں برطانیہ، ترکی، ایران اور عراق بھی شامل تھے۔

اس صورت حال میں بھارتی حکومت کو پریشان کر دیا تو انہوں نے پھر پاکستان کے ساتھ مذاکرات کی ضرورت پیش آئی اور 17 تا 20 اگست 1953ء میں پھر دونوں ممالک دہلی میں ہوئے، جن میں یہ مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا کہ دونوں ممالک اس بات پر متفق ہیں کہ مسئلہ کشمیر ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہونا چاہئے اور لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا بہترین طریقہ ''رائے شماری'' قرار دیا گیا۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اپریل 1954ء تک رائے شماری کے لیے ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا جائے گا، یہ ظاہر یہ بڑی کامیابی تھی اور اس سے پاکستان اور کشمیری

عوام کو امید ہو چلی تھی کہ اب یہ معاہدہ ہو جائے گا، لیکن اچانک بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے ختم کرنے کی عجیب وغریب توجیہ تلاش کر لی، انہیں اس بات کی شکایت پیدا ہوئی کہ پاکستان نے امریکہ سے فوجی معاہدہ کیوں کر لیا ہے؟

نہرو نے پاکستانی وزیراعظم کو خط لکھا کہ اس دفاعی معاہدے کا اثر ہمارے مذاکرات پر بھی پڑے گا اور کشمیر میں صورت حال خراب ہو جائے گی، جس پر محمد علی بوگرہ نے انہیں کہا کہ پاکستان اور امریکا کے درمیان معاہدے سے مسئلہ کشمیر کا متاثر ہونا بڑی عجیب منطق ہے اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ اس معاہدے کا کشمیری عوام کے حق خود ارادیت سے کیا تعلق ہے؟ لیکن پنڈت نہرو اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے، اس دوران دونوں وزرائے اعظم کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، ایک مرحلے پر محمد علی بوگرہ نے نہرو کو مطمئن کرنے کے لیے 3 ستمبر 1953ء کو مستعفی ہونے والے ناظم رائے شماری ایڈمرل نمٹز کی جگہ نئے ناظم رائے شماری کے تقرر پر رضامندی بھی ظاہر کی۔

24 فروری 1954 کو انہوں نے نہرو کو خط لکھ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن پنڈت نہرو نے یکم مارچ 1954ء کو بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد سے ایشیائی ممالک کے لیے سنگین خطرات لاحق ہو گئے ہیں اور اس سے پاکستان اور بھارت کے درمیان طے پانے والے مذاکرات کی حیثیت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

5 مارچ 1954ء میں انہوں نے پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ کو خط لکھا کہ اندریں حالات وہ بھارتی فوج کی جموں وکشمیر میں موجودگی ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ پاکستان نے امریکی فوجی امداد قبول کر کے کشمیر کے تنازعے کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ پنڈت نہرو کی اس عجیب وغریب دلیل کے ساتھ ہی بھارتی خارجہ پالیسی نے اچانک نیا موڑ لیا اور انہوں نے یو این او یا کسی اور ذریعے سے کشمیر پر مذاکرات کے تمام راستے بند کرتے ہوئے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دے دیا۔

اس دوران بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کی کشمیر میں گرفتاری کے بعد سے پیدا شدہ بحران پر بھی کافی حد تک قابو پا لیا تھا اور مقبوضہ کشمیر کے نئے وزیراعظم بخشی غلام

محمد نے اپنے قدم مضبوط کر لئے تھے۔اس کے ساتھ ہی بھارتی صدر نے مقبوضہ کشمیر کا دورہ کیا اور بھارتی آئین کی دفعہ 370ء کے ذریعے مقبوضہ کشمیر کو مرکزی الیکشن کمشن کے دائرہ کار میں لاتے ہوئے کشمیر ہوئی کورٹ کو بھارت کے دوسرے ہائی کورٹس کے ساتھ شامل کر دیا۔اس کے ساتھ ہی پنڈت نہرو نے ایک دوسری تجویز پیش کر دی کہ کشمیر میں جغرافیائی اور مذہبی بنیادوں پر حلقہ بندیاں بنا کر استصواب رائے کروایا جائے اور یہ بھی گوہر افشانی کی کہ جو کشمیری پاکستان ہجرت کر گئے ہیں انہیں رائے شماری میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہو گی۔اس طرح انہوں نے 1949ء میں یو این او کی پیش کردہ ریزولیشن کو خود ہی غلط قرار دے دیا۔

معاہدہ تاشقند

چین اور بھارت کے درمیان اکتوبر 1959ء میں مخاصمت کا آغاز ہو چکا تھا اور لداخ میں چین اور بھارتی افواج کے درمیان جھڑپیں بھی ہونے لگی تھیں۔ یہ سرحدی تنازع تین سال چلتا رہا۔ 20 اکتوبر 1962ء کو نہرو نے بھارتی افواج کو لداخ کے متنازع علاقے چینی افواج سے خالی کروانے کا حکم جاری کر کے باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس جنگ کا نتیجہ بھارت کو شکست کی صورت میں ہی سامنے آنا تھا، لیکن خارجہ سطح پر بھارت کے لیے یہ جنگ ''ٹرمپ کارڈ'' ثابت ہوئی، جس نے مغربی ممالک، خصوصاً امریکا اور برطانیہ کی بے تحاشا جنگی اور مالی امداد کے دروازے بھارت پر کھول دیئے گئے، جب کہ پاکستان کی غیر جانب داری پاکستان کا جرم قرار دی جانے لگی۔

نومبر 1962ء میں برطانیہ اور امریکا کا مشترکہ وفد پاکستان آیا، جس میں امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ نورل ویمن اور برطانیہ کی طرف سے دولت مشترکہ کے سیکرٹری ڈنکن سنڈیز شامل تھے، دونوں نے صدر پاکستان سے ملاقات کی اور 29 نومبر 1962ء کو صدر پاکستان اور بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا جس کے مطابق دونوں ممالک نے اپنے باہمی اختلافات کو گفت و شنید کے ذریعے طے کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ اس سلسلے میں باقاعدہ مذاکرات کا آغاز کریں گے۔ یہ مذاکرات وزارتی سطح کے ہوں گے جن میں کسی مرحلے پر صدر ایوب خان اور پنڈت نہرو بھی شامل ہو جائیں گے۔

صدر ایوب سے دستخط کروانے کے بعد ڈنکن سنڈیز نے اس بیان پر دہلی جا کر پنڈت نہرو سے بھی دستخط کروائے اور لندن روانہ ہو گئے۔ اگلے ہی روز نہرو نے اپنے پارلیمنٹ سے خطاب میں اس مشترکہ اعلامئے کے متعلق کہا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر ہم نے یہ رسمی سی کاروائی کی ہے جس کا بھارت کے کشمیر سے متعلق موقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس اعلان کا پاکستان میں شدید ردعمل ہوا، کشمیری لیڈر چوہدری غلام عباس

، جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور عوامی لیگ کے حسین شہید سہروردی نے اس پر حکومت کے لتے لئے اور اسے امریکی مفادات کے تابع قرار دے کر نہرو کو ناقابل اعتبار قرار دیا، جس پر تب کے وزیر صنعت ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ کم از کم اس اعلامیہ پر دستخط سے مسئلہ کشمیر پر تکلیف دہ تعطل تو ختم ہوگا۔ اس مرحلے پر بھارتی وزیراعظم نے 15 دسمبر 1962ء کو حیرت انگیز بیان جاری کیا، لندن میں بی بی سی سے انٹرویو میں پنڈت نہرو نے کہا، جب تک بھارت اور چین کا سرحدی تنازع طے نہیں ہو جاتا، مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے ساتھ کسی سمجھوتے کا امکان ہی نہیں۔

15 دسمبر کو صدر ایوب خاں نے راول پنڈی میں بیان دیا کہ مسئلہ کشمیر کا حل تو استصواب رائے دہی ہے، لیکن بھارت کے پاس کوئی بہتر حل موجود ہے تو ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اسی طرح پہلی مرتبہ پاکستان نے استصواب رائے سے ہٹ کر کسی حل کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

اسی دوران مغربی وفود کے مشترکہ اعلانیہ کی روشنی میں راولپنڈی میں وزرائے خارجہ کی سطح پر دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہو گیا۔ بھارتی وفد کے قیادت سورن سنگھ اور پاکستانی وفد کی بھٹو مرحوم نے کی۔ یہ مذاکرات 27 سے 30 دسمبر 1962ء تک جاری رہے، جن میں بھارتی وفد نے چار نکاتی اعلامیہ جاری کیا، جس کے مطابق مسئلے کے حل کے لیے خیر سگالی کی فضا کا قیام، بقائے باہمی کا معاہدہ، بنیادی اختلافات کے خاتمے کے لیے حقیقت پسندانہ قدم اٹھانا، عملی تعاون کی راہیں استوار کرنا شامل تھا۔

مسٹر بھٹو نے مذاکرات کو خوش آئند قرار دیا اور مذاکرات کا اگلا دور 16 جنوری 1963ء کو بھارت میں ہونا طے پایا۔ ان چار روزہ مذاکرات میں جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا، اس میں ذرائع ابلاغ سے اپیل کی گئی کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے بہتر فضا پیدا کرنے میں دونوں حکومتوں کی مدد کریں۔ 16 جنوری 1963ء کو تین ہفتوں بعد مذاکرات کا اگلا دور دہلی میں شروع ہوا جہاں 19 جنوری کو پاکستانی وفد نے اپنے اصولی موقف یعنی ''استصواب رائے'' کے برعکس متبادل طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر مسئلہ حل کرنے

کا اشارہ دیا جبکہ بھارت تقسیم کشمیر اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے کا خواہاں تھا۔ جب پاکستانی وفد نے اس پر آمادگی ظاہر کردی تو بھارتیوں نے پینترا بدلا اور دیگر ''معاملات'' پر مذاکرات کا تقاضا کرنے لگے۔

اس صورت حال اور بھارتی ہٹ دھرمی نے مغربی ممالک کو بھی ایک مرتبہ بوکھلا کر رکھ دیا اور اس سے پہلے کہ پاکستانی وفد واپس آجائے مغربی ممالک نے سفارتی دباؤ کے ذریعے مذاکرات کو جاری رکھنے پر دونوں کو رضامند کر دیا۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے 26 جنوری 1963ء کو صدر ایوب خان کے نام اپنے خط میں مطالبہ کیا کہ پاکستان اپنے موقف میں مزید لچک پیدا کرے۔ 7 جنوری 1963ء کو صدر ایوب نے جان ایف کینیڈی کے نام اپنے خط میں بھارت سے مزید مذاکرات پر رضامندی ظاہر کر دی ان مذاکرات میں کسی دوسرے حل پر غور شروع ہوا اور ''کراچی کانفرنس'' کے حوالے سے پاکستانی خبر رساں ایجنسی پی پی آئی نے خبر دی کہ پاکستان بعض شرائط کے تحت تقسیم کشمیر کی تجویز قبول کرنے کو تیار ہے۔ اس ضمن میں 3 شرائط پیش کی گئیں:

(1) دوران تقسیم مسلمانوں کی اکثریت کو آبادی میں اہمیت دی جائے گی۔

(2) مغربی ممالک پاکستان کے دفاعی اور اقتصادی مفادات کا خیال رکھیں گے۔

(3) تقسیم کا منصوبہ ایسا ہو، جس میں کشمیری لیڈرشپ کی رضامندی بھی شامل ہے۔

اس مرحلے پر پاکستانی حکومت نے کچھ زیادہ ہی جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر بھارت وادی کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دے تو پاکستان غیر تحریری معاہدے کے تحت چین کے خلاف جنگ میں اس کی مدد کرے گا اور بھارت کو وادی کے راستے لداخ تک جانے کا راستہ دے گا۔ پاکستان کے اس ''بے پناہ جذبہ خیر سگالی'' کو بھی بھارت نے ٹھکرا دیا۔

مذاکرات کا اگلا دور 8 تا 11 فروری 1963ء کو کراچی میں ہوا، جس میں دونوں کے درمیان بعد المشرقین سے 10 فروری کو بھی مذاکرات ختم ہوتے دکھائی دیئے، لیکن سورن سنگھ اور ذوالفقار علی بھٹو کی ون ٹو ون میٹنگ کے بعد اعلان ہوا کہ مذاکرات کا اگلا دور

دہلی میں ہوگا۔ 12 تا 14 مارچ 1963ء کو بھارت کے صوبہ مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں اگلا دور ہوا، جہاں بھارتی وفد نے باقی معاملات ایک طرف رکھ کر پاکستان اور چین کے درمیان 2 مارچ 1963ء کو طے پانے والے سرحدی معاہدے پر بحث شروع کردی، جس کا ایجنڈے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس مرحلے پر بھٹو مرحوم نے آسام اور تری پورہ کے مسلمانوں کو زبردستی مشرقی پاکستان میں دھکیلنے کے خلاف بھارت سے احتجاج کیا اور طے پایا کہ آسامی مسلمانوں کے مسائل پر دونوں ممالک کے درمیان جلد ہی مذاکرات ہوں گے اور مشرقی پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازعات پر بھی وزارتی سطح کے مذاکرات میں بات ہوگی، اس طرح مسئلہ کشمیر کو ایجنڈے سے خارج کردیا گیا۔

22 تا 25 اپریل 1963ء کو ان وزارتی مذاکرات کا پانچواں دور کراچی میں ہوا، جس میں مسٹر بھٹو نے بھارت کو پیش کی کہ اگر وہ وادی کشمیر اور چناب پر پاکستان کا حق تسلیم کرلے تو پاکستان بھارت کو وادی سے لداخ تک کا راستہ دینے کو تیار ہے۔ بھارتی وفد نے اس پیشکش کو دوبارہ ٹھکرادیا، مذاکرات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا، پھر برطانوی اور امریکی سفیروں نے مسٹر بھٹو سے ملاقاتیں کیں اور مسٹر بھٹو نے مذاکرات کا چھٹے دور پر رضامندی بادل ناخواستہ ظاہر کردی۔

مذاکرات کا چھٹا دور مئی 1963ء میں دہلی میں ہوا، جس میں بھارت نے امریکا اور برطانیہ کی طرف سے ''ثالثی'' کی تجویز مسترد کردی اور پاکستان نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ چھ ماہ کے اس طویل مذاکراتی دور کا اختتام 16 مئی 1963ء کو اس اعلان کے ساتھ ہوا کہ مذاکرات ناکام ہوگئے ہیں، گو اس اعلان کے ساتھ ہوا مذاکرات ناکام ہوگئے، اس لیے پنڈت نہرو اور صدر ایوب کے درمیان بات چیت نہیں ہوگی۔

اس دوران مقبوضہ کشمیر میں بھارتی الحاق کے خلاف تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور بھارت کی طرف سے اس کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا جارہا تھا۔ مارچ 1965ء میں بھارتی پارلیمنٹ نے ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کی منظوری کا بل پاس کردیا۔ اس طرح کشمیر کو دستوری طور پر بھارت کا حصہ بنایا گیا، مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی نے شدت اختیار کرلی

اور بھارت نے پاکستان پر کمانڈوز وادی میں داخل کرنے کا الزام لگایا۔ 25 اگست کو بھارتی افواج نے کشمیر میں دو مقامات پر جنگ بندی لائن عبور کی، اس سے پہلے راجستھان میں دونوں ممالک کی افواج کے درمیان شدید لڑائی میں پاکستان کا پلہ بھاری رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستانی افواج نے کشمیر محاذ پر کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں تو صورت حال سے بوکھلا کر بھارت نے 6 ستمبر کو پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ 23 ستمبر کو سلامتی کونسل کی کوششوں سے بند ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی روس نے دونوں ممالک کے درمیان مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ 22 ستمبر کو بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور 25 ستمبر کو ایوب خان نے روس کی اس تجویز کو قبول کر لیا۔ 3 سے 10 جنوری 1966ء تک تاشقند میں کانفرنس ہوتی رہی جس میں صدر ایوب اور لال بہادر شاستری نے اپنے ماہرین کے ساتھ شرکت کی۔ اس کانفرنس میں کئی مرحلے آئے اور آخری مرحلے پر جب کانفرنس کی ناکامی یقینی دکھائی دے رہی تھی کوسیجن نے دونوں وزرائے اعظم سے الگ الگ ملاقات کر کے انہیں ایک مشترکہ اعلامئے پر متفق کر دیا جسے ''اعلان تاشقند'' کے نام سے ساری دنیا جانتی ہے۔ اس کے اہم نکات کچھ اس طرح تھے۔

(1) 25 فروری 1966ء تک دونوں ممالک کی افواج 5 اگست 1965ء والی پوزیشنوں پر واپس چلی جائیں گی اور دونوں فریق فائر بندی لائن پر فائر بندی کی شرائط کی پابندی کریں گے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر استوار کیے جائیں گے۔

(2) جنگ نہ کرنے کے معاہدے کو پاکستان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(3) صدر ایوب اور شاستری نے ماضی کے معاہدوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

(4) ستمبر 65ء کی جنگ کے قیدیوں کی واپسی طے پا گئی۔ دونوں ممالک کے رہنماؤں نے طے کیا کہ وہ اپنے متعلقہ حکام کو جنگی قیدیوں کے تبادلے کی ہدایات جاری کریں گے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ فریقین مہاجرین اور غیر قانونی تارکین وطن کی بے دخلیوں کے سوال پر بات چیت جاری رکھیں گے۔ یہ بھی طے کیا کہ دونوں

ملک جائیدادیں اور اثاثے ایک دوسرے کو واپس کرنے پر بات چیت کریں گے جن پر جنگ کے دوران قبضہ کیا گیا تھا۔

(5) دونوں ممالک نے میڈیا پر ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ایسے پراپیگنڈے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی جس سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ حاصل ہو اور یہ کہ دونوں حکومتیں سفارتی تعلقات میں 1961ء کی وی آنا کونشن کی پابندی کریں گی۔

(6) ثقافتی، تجارتی، اقتصادی تعلقات کو بحال کر کے پرامن اور دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان مفاہمت کے جذبات اور دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا جائے گا۔ انہوں نے ان مقاصد کے حصول کو پاکستان اور بھارت کے ساٹھ کروڑ عوام کی بہبود کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل قرار دیا۔

(7) اقوام متحدہ کے منشور پر عمل کرنے کا دونوں سربراہان نے وعدہ کیا اور اچھے ہمسایوں کے سے تعلقات قائم کرنے کے لئے پوری کوششیں صرف کرنے پر متفق ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف طاقت استعمال نہ کرنے اور تنازعات پرامن ذرائع سے طے کرنے کے عزم کا اعادہ کیا۔

(8) سفارتی مشن دوبارہ کھولنے اور دونوں ممالک کے ہائی کمشنرز کے عہدے سنبھالنے کا اعلان جاری ہوا۔

(9) دونوں ممالک عوامی اخراج اور جائیداد کے معاملات کا جائزہ لینے پر متفق ہو گئے۔

(10) دونوں نے اقلیتوں کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کا وعدہ کیا تا کہ ترک وطن کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

(11) مسئلہ کشمیر پر مذاکرات ناکام رہے۔ لیکن انہوں نے اتفاق کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کا جاری رہنا اس علاقہ خصوصاً برصغیر پاک و بھارت کے امن نیز دونوں ملکوں کے عوام کے مفاد میں نہیں۔ اس پس منظر میں مسئلہ جموں و کشمیر پر بات چیت کی گئی اور ہر دو فریقوں نے اپنا موقف پیش کیا۔

(12) دونوں نے اپنے روابط بہترین کرنے کا وعدہ کیا۔

(13) مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق دونوں ممالک کے لوگوں میں رابطے اور میل ملاپ کی سہولتوں کا وعدہ کیا گیا۔

معاہدہ تاشقند کو پاکستانی اپوزیشن نے ناکامی قرار دیا جب کہ لال بہادر شاستری ہارٹ اٹیک سے سورگباش ہو گئے، بعد میں اس معاہدے کو بنیاد بنا کر ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک چلائی اور صدر ایوب کو ایوان اقتدار سے رخصت کر دیا۔لیکن ایوب خان جاتے جاتے جنرل یحییٰ خان کو پاکستان کے سر پر مسلط کر گئے جن کی عاقبت نا اندیشی نے بالآخر ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

رن آف کچھ معاہدہ

تنازعہ کشمیر کی طرح رن آف کچھ کا تنازع بھی پاکستان اور بھارت کو ورثے میں ملا۔ آزادی سے قبل اور بعد میں بھی اس کی حدود واضح نہیں تھیں کیوں کہ برطانوی دور میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اگر اصولاً اس علاقے کی تقسیم ہوتی تو قانون استقلال کے تحت دونوں نوزائیدہ ریاستوں کو برابر علاقہ ملنا چاہئے تھا مگر بھارت تین چوتھائی سے زیادہ علاقہ ہتھیانے کے باوجود بقیہ پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔

رن کچھ کا علاقہ پاکستان کے صوبہ سندھ اور سابق ریاست کچھ کے درمیان ایک خشک جھیل کا غیر آباد علاقہ ہے جو تقسیم کے بعد بھارتی ریاست گجرات میں شامل کیا گیا تھا۔ اس متنازعہ علاقے میں شمال کی طرف 35,000 مربع میل پر پاکستان کا دعویٰ تھا جبکہ بھارت کا دعویٰ تھا کہ اس میں سے 4800 مربع میل کا علاقہ اس کی ملکیت ہے۔ چونکہ ابھی اس علاقے میں حد بندی نہیں ہوئی تھی اس لئے سرحد کے دونوں طرف بسنے والے دیہاتی اس علاقے میں واقع چراگاہوں میں اپنے مویشی چراتے تھے۔ جنوری 1965ء میں بھارت نے کنجرکوٹ کے قریب پاکستانی فوج کے گشت میں مداخلت شروع کر دی اور پاکستانی چوکیوں کے مقابل اپنی چوکیاں قائم کر لیں۔ اس کے بعد بھارت کی بری فوج کے ایک پورے بریگیڈ کے علاوہ دو پلٹنیں اور بھی پہنچ چکی تھیں۔ حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت کو ان فوجی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت فوجوں نے پاکستانی فوجوں کے خلاف اندھادھند فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس علاقے نے اپریل 1965ء میں اس وقت عالمی توجہ حاصل کر لی جب پاکستان اور بھارت میں جنگ شروع ہوئی جو تین ہفتوں تک جاری رہی۔ صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے برطانوی وزیر اعظم ہیرالڈ ولسن نے دولت مشترکہ کے

سربراہان کی کانفرنس کے موقع پر بھارت اور پاکستان کو راضی کر لیا کہ تنازعہ کے تصفیئے کے لئے ایک ثالثی ٹریبونل قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تین افراد پر مشتمل ایک ٹریبونل قائم کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی بھارت یا پاکستان کا باشندہ نہیں ہوگا اور اس کا چیر مین اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور دونوں ممالک کے اتفاق رائے سے مقرر کیا جائے گا۔ اس طرح سویڈن کے جج گنار لاگرگرین کو چیر مین مقرر کیا گیا۔ ٹریبونل میں بھارت کی نمائندگی یوگوسلاویہ کے جج ایلس ببلر اور پاکستان کی نمائندگی ایرانی سفارت کار نصر اللہ انتظام نے کی۔

29 فروری **1969**ء کو جنیوا میں ٹریبونل نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا اس دوران بھارت اپنے سیاسی، نظریاتی، ثقافتی اور خصوصاً معاشی حربوں کے ذریعے عالمی حمایت کر کے اپنے لئے راہ ہموار کر چکا تھا۔ رن آف کچھ کا امن کی خاطر جو معاہدہ سامنے آیا اس کا فیصلہ کسی حد تک جانبدارانہ اور بھارت کے حق میں تھا۔ اس معاہدے کے تحت **3500** مربع میل کا علاقہ بھارت کے اور **1350** مربع میل کا علاقہ پاکستان کو عطا کر کے انصاف کی دھجیاں بکھیری گئیں۔ اس ناانصافی کے باوجود بھی بھارتی رہنماؤں کے دلوں میں نفرت و عداوت کی آگ برابر اسی طرح بھڑکتی رہی جو بالآخر ایک بڑی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

———✡———
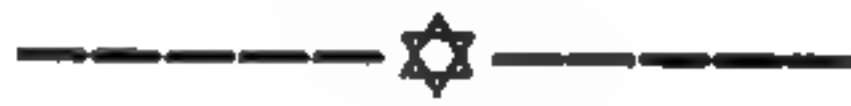
شملہ معاہدہ

حصول پاکستان کی جدوجہد میں مشرقی بنگال کے عوام کا حصہ مغربی پاکستانیوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھا کیوں کہ بنگالیوں نے بھی مسلسل اسلام سے اپنی محبت کا ثبوت ہر جگہ دیا اور اسلام کو ہی اپنی قومیت قرار دیا۔ لیکن بھارت کو مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتحاد کسی طرح بھی پسند نہیں تھا اس لئے وہ اسے تباہ کرنے کے لئے مسلسل سازشوں میں مصروف رہا۔ لیکن 1965ء کی جنگ میں اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس ناکامی سے انڈیا نے کوئی سبق نہیں سیکھا بلکہ دوسری جنگ کی تیاری شروع کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا کہ اس مرتبہ اس کا نشانہ مشرقی پاکستان ہوگا۔

بھارت نے 1965ء میں عسکری ناکامی کا بدلہ مشرقی پاکستان میں ''پراکسی وار'' کے ذریعے چکایا اور مشرقی پاکستان میں شورش برپا کر دی۔ پاکستان امریکہ کا فوجی اتحادی تھا ایسے میں اس پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ پاکستان کی ہر قسم کی امداد کرتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر اور سابق امریکی صدر اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ 1971ء میں امریکہ نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی منظوری دی تھی۔ اگر امریکہ چاہتا تو پاکستان کو ٹوٹنے سے بچا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

1970ء میں مولانا بھاشانی نے بھی مشرقی پاکستان میں فسادات کرانے کے لئے سی آئی اے کے منصوبے کا انکشاف کیا تھا۔ اس نازک موقع پر چین پاکستان کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن امریکہ نے دھمکی دے دی کہ اگر چین نے پاکستان کی فوجی مدد کی تو امریکہ بھی جنوبی ایشیا میں فوجی مداخلت پر مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ چین نے پاکستان کی صرف خفیہ امداد جاری رکھی۔ 2 دسمبر کو صدر یحیٰی خان نے امریکی صدر رچرڈ نکسن سے ایک خط کے ذریعے استدعا کی کہ امریکہ بھارتی جارحیت کے مقابلے کے لئے پاکستان کی امداد کرے۔ اس کے جواب میں امریکہ کے سیکرٹری خارجہ ہنری کسنجر نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اس استدعا کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران روس کا رویہ بظاہر غیر جانبدارانہ رہا لیکن درحقیقت یہ بھارتی حکومت کے موقف سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ پاکستان کے خلاف نام نہاد مکتی باہنی جو دراصل بھارت کی سینا کے سپاہیوں پر مشتمل تھی اور جس پر مکتی باہنی کا لیبل محض اس لئے چسپاں کر دیا گیا تھا کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالی جا سکے ،اور پاکستان کی سلیت کے خلاف بھارت کی جارحیت کو مشرقی پاکستان کے عوام کی تحریک آزادی کا نام دیا جا سکے۔ بھارت کا موقف بھی یہی تھا کہ نام نہاد بنگلہ دیش کا مسئلہ پاکستان کے عوام کے مابین تنازعہ ہے اور اس کا پاکستان اور بھارت کے مابین براہ راست کشیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بھارت نے یہ موقف اس لئے اختیار کیا تا کہ بھارت کی فوج پاکستان کی سلیت کو مجروح بھی کرتی رہے اور پاکستان بھارت کو موردالزام ٹھہرا کر بھارت کے خلاف کوئی جوابی کاروائی بھی نہ کر سکے۔

روس کے حکمرانوں نے اس کشیدگی کا عجیب وغریب حل تلاش کیا، یہ حل صدر یحییٰ اور شیخ مجیب کے درمیان مفاہمت کے متعلق تھا۔ روس کا خیال تھا کہ شیخ مجیب درحقیقت متحدہ پاکستان کے دائرے میں اپنے صوبہ کے لئے خود اختیاری چاہتے تھے جو محض حقیقت کے منافی ہے، کیوں کہ اٹانومی کا مطالبہ ہمیشہ کسی ملک کے وہ صوبے کرتے ہیں جو اقلیت میں ہوں۔ مشرقی پاکستان جو پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور جس کے ارکان کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہے اس کا اپنے لئے اٹانومی طلب کرنا بے معنی ہے۔

دراصل شیخ مجیب اور صدر یحییٰ کے درمیان عام انتخابات کے بعد جس تنازعہ نے جنم لیا وہ اٹانومی کا نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مقصد ایک کمزور اور برائے نام مرکز کا قیام اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کی مکمل علیحدگی تھا۔ اس قسم کے مشرقی پاکستان پر بھارت اسی قسم کا اقتدار اور بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا جس قسم کا اقتدار بھارت نے سکم اور بھوٹان میں قائم کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صدر یحییٰ خان نے **1969**ء کو برسر اقتدار آنے کے بعد ملک کا آئینی مسئلہ طے کرنے کے لئے جب عام چناؤ کا اعلان کیا تو بھارت کے پریس نے عوامی لیگ اور شیخ مجیب کو خوب اچھالا۔ انتخابات ہوئے تو اس کے نتائج حکومت اور سیاسی جماعتوں کے لئے حیران کن تھے، ملک سیاسی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مغربی پاکستان میں پیپلز

پارٹی کو سندھ اور پنجاب میں بھاری کامیابی حاصل ہوئی، مشرقی پاکستان پر مکمل طور پر عوامی لیگ قابض تھی اور سرحد اور بلوچستان پر نیشنل عوامی پارٹی کا سکہ چلتا تھا۔ انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں صورتحال انتہائی تشویش ناک ہوگئی۔

انٹیلی جینس ایجنسیوں کی رپورٹوں میں واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ اگر حکومت نے انتقال اقتدار کے مرحلے کو جلد مکمل نہ کیا تو صورت حال بہت زیادہ بگڑ جائے گی۔ 10 جنوری کو شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی رہائش گاہ کے باہر جمع ہونے والے ورکروں سے کہا "تمہیں بنگلہ دیش مبارک ہو اگر تم لوگ عوامی لیگ کو اس قدر بھاری مینڈیٹ سے کامیاب نہ کراتے تو وہ (مغربی پاکستان والے) تم کو کتے کی موت مار دیتے"۔

ڈھاکہ میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی فوج پر حملے ہو رہے تھے اور غیر بنگالیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جا رہا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کرنا پڑا۔ اس سے پہلے کلکتہ میں قائم عارضی ریڈیو سٹیشن سے آزادی کے ترانے نشر کرنا شروع کر دیئے گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی ایک ریکارڈ شدہ کیسٹ بھی بھارت پہنچائی جا چکی تھی جس میں آزاد بنگلہ دیش کے اعلان کے علاوہ نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک مغربی پاکستانیوں کو قید یا قتل نہیں کر دیا جاتا۔

اس وقت تک بھارتی فوج تعداد کے لحاظ سے اپنی برتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بری فوج اور فضائیہ کے بل بوتے پر مشرقی پاکستان کے گرد پوری طرح گھیرا ڈالنے کی کاروائی مکمل کر چکی تھی۔ بھارتی فضائیہ نے اپنے تمام اڈوں پر جنگی پیمانے پر سرگرمیاں شروع کر دیں، اس روز مشرقی کمان کے سربراہ جنرل نیازی نے مشرقی پاکستان کے عوام کو ہدایت کی کہ وہ بھارت کے جارحانہ عزائم سے باخبر رہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھارت مشرقی پاکستانیوں کا ہرگز دوست نہیں وہ آزادی سے قبل مشرقی پاکستان کو بھارت میں شامل کرنا چاہتا تھا اس وقت بھی اس کا یہی عزم ہے۔

چنانچہ پاکستان میں سیاسی کشیدگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ کا المناک اختتام 16 دسمبر 1971ء کو 90 ہزار پاکستانیوں کے ہتھیار ڈالنے پر ہوا۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی افواج قابض ہوگئیں جبکہ مغربی محاذ پر بھی بھارت کو

برتری حاصل ہوئی اور بھارت نے مغربی پاکستان کے 5164 مربع میل علاقے پر قبضہ کر لیا 341 مربع میل علاقے پر آزاد کشمیر میں قبضہ ہوگیا، جس میں لداخ، کارگل، لیپا سیکٹر کا علاقہ اور بیس مرگ شامل ہیں۔

اس مکمل عسکری شکست نے پاکستان میں مایوسی کی شدید لہر پیدا کر دی، جب ذوالفقار علی بھٹو نے 20 دسمبر 1971ء کو صدر پاکستان کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو بھارتی حملہ کے بعد پاکستان کے حالات سخت پریشان کن تھے۔ بھارت نے مطالبہ کیا کہ پاکستان بنگلہ دیش کو آزاد ملک اور کشمیر میں کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرے، جس کے بعد پاکستان سے مذاکرات کرے گا۔ 3 جنوری 1972ء کو کراچی میں ایک دھواں دھار تقریر کرنے کے بعد بھٹو نے 18 جنوری 1972ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل سے رہا کر دیا، جس سے پاک بھارت تعلقات نارمل کرنے کا آغاز ہوا۔

14 اپریل 1972ء کو بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے پاک بھارتی ''اعلیٰ سطحی رابطے'' کا انکشاف کیا۔ 6 اپریل 1972ء کو پاکستانی حکومت نے بیان جاری کیا کہ مسز اندرا گاندھی نے صدر بھٹو کو ''غیر مشروط مذاکرات'' کی دعوت دی ہے، جس پر سربراہی ایجنڈے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ 26 اپریل 1972ء کو مری میں دونوں ممالک کے ایلچیوں نے مذاکرات کا آغاز کیا۔ بھارتی وفد کی قیادت ڈی پی دھر اور پاکستانی وفد کی قیادت عزیز احمد کر رہے تھے۔ ان مذاکرات کا اختتام اس مشترکہ اعلامیہ پر ہوا کہ 28 جون 1972ء کو دونوں ممالک کے سربراہان شملہ میں مذاکرات کریں گے۔

بظاہر ترپ کے سارے پتے بھارت کے ہاتھوں میں تھے مگر جب بھٹو 28 جون 1972ء کو بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے مذاکرات کے لئے شملہ پہنچے تو بھارت نے سیاسی سودے بازی کی پوری کوشش کی۔ شملہ جانے سے پہلے بھٹو نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان پائیدار امن کے قیام کی کوشش ضرور کرے گا لیکن وہ اپنے اصولوں کا سودا ہرگز نہیں کرے گا۔ 28 جون سے 2 جولائی 1972ء تک دونوں ممالک کے وفود اپنے سربراہان کے ہمراہ مذاکرات میں مصروف رہے، بھارتی وزیراعظم کا اصرار تھا کہ پاک بھارت تمام قضیوں کا ایک ہی مرتبہ سمجھوتہ ہو جائے جس میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہو۔ مسٹر بھٹو

نے تجویز پیش کی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام قضیوں کو قدم بہ قدم طے کر لیا جائے گا ایک ہی مرحلہ میں نہیں انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ جب دوسرے قضیئے اور اختلافات طے پا جائیں گے تو کشمیر کے قضیہ کو ہاتھ میں لیا جائے گا۔ چار روز تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ کئی مرتبہ ان مذاکرات میں ''ڈیڈ لاک'' پیدا ہوا، بالآخر ایسا لگتا تھا کہ مسٹر بھٹو کسی سمجھوتے کے بغیر ہی اپنے ملک واپس لوٹ آئیں گے عین اس وقت جب وہ بھارتی وزیر اعظم کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الوداعی ملاقات کرنے ان کی رہائش گاہ پر پہنچے تو انہیں ایک مرتبہ پھر مذاکرات کی کامیابی کے لئے دعوت دی جس کے جواب میں مسز اندرا گاندھی نے اپنے مشیروں سے صلاح مشورہ کے لئے وقت طلب کیا اور کہا کہ وہ آخری ضیافت میں انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گی۔ طعام کے بعد دونوں رہنماؤں نے از سر نو مذاکرات کئے اور معاہدے کے مسودے میں کئی مرتبہ ترمیم و تبدیلی کی گئی جس کے بعد اعلامیہ جاری کر دیا گیا۔ جسے شملہ معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخی معاہدہ شملہ پر حکومت پاکستان کی طرف سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی حکومت کی طرف سے مسز اندرا گاندھی نے دستخط کئے اس معاہدے کے اہم نکات یہ ہیں۔

(1) تصادم اور محاذ آرائی ختم کی جا رہی ہے۔

(2) دونوں حکومتیں اس بات پر متفق ہوگئی ہیں کہ ان کے سربراہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آپس میں ملاقات کریں گے اور ''اسٹیٹس کو'' برقرار رکھتے ہوئے باہمی اختلافات کو بات چیت سے طے کیا جائے گا، عدم مداخلت پر سختی سے عمل ہوگا۔

(3) دونوں ممالک کی افواج بین الاقوامی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی۔

(4) نئی سرحد بندیوں کا تعین ہوگا۔

(5) 17 دسمبر 1971ء کو جنگ بندی کے نتیجے میں قائم ''کنٹرول لائن'' کا احترام کیا جائے گا۔ لیکن اس علاقے میں ان ملکوں کا تسلیم شدہ موقف متاثر نہیں ہوگا۔ آپس کے اختلافات اور قانونی تشریحات کے فرق کے باوجود کوئی فریق یکطرفہ طور پر اس لائن کی خلاف ورزی کے لئے طاقت کے استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکی سے گریز کیا جائے گا۔

(6) جنگی قیدیوں اور سویلین نظر بندوں کا تبادلہ ہوگا۔

اس کے علاوہ مواصلات، سائنس و ٹیکنالوجی، اقتصادیات، تجارتی اور ثقافتی سطح پر دونوں ممالک کے درمیان معاہدے طے پائے۔ اس سمجھوتے سے 93 ہزار قیدیوں کی باعزت واپسی ممکن ہوئی جن میں وہ 150 قیدی بھی شامل تھے جن پر بنگلہ دیش کی حکومت قتل وغارت گری کے مقدمے قائم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس معاہدے کے ذریعے مسٹر بھٹو نے بڑی کامیابی کے ساتھ بھارت کو کنٹرول لائن، بیان الاقوامی سرحد میں تبدیل کرنے سے روک دیا جب کہ بھارت نے عسکری نوعیت کے بعض اہم علاقے ہم سے ہتھیا لئے جس کی ایک مثال ہی بھارتی کامیابی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ 1965ء میں پاکستان نے اپریشن جبرالٹر جن علاقوں سے شروع کیا تھا ان میں چھمب سیکٹر، سمن، کھوئی رٹہ، پونچھ، اوڑی، ٹیٹوال اور کیل شامل ہیں جہاں سے درجنوں راستے مقبوضہ کشمیر کو جاتے ہیں اور جن پر مکمل کنٹرول بھارت کے بس سے باہر تھا یہ علاقہ گوریلا کاروائیوں کے لیے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ بھارت نے فوجی توازن اپنے حق میں کرنے کے لیے چوٹی ''قاضی ناگ'' پر قبضہ کرلیا۔ ششماباری رینج سے نیچے میدانی علاقے میں اتر کر ساری وادی پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے کارگل پر قبضہ کرلیا اور دریائے سیوک پر قبضہ کر کے ایک پل بھی اپنی فوجی آمدورفت کے لیے تعمیر کرلیا، جہاں سے پہلی مرتبہ اسے سیاچن تک جانے کا راستہ ملا۔

———✡———

معاہدہ دہلی

جنگی قیدیوں کے واپسی کے سوال پر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان 18 اگست 1973ء کو نئی دہلی میں مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مذاکرات میں برصغیر کے ان انسانی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی جو 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان یہ تاریخی سمجھوتہ 28 اگست 1973ء کو طے پایا۔ جس کے مطابق 195 جنگی قیدیوں کے سوا جن پر بنگلہ دیش کی حکومت مقدمہ چلانے کا ارادہ رکھتی ہے باقی تمام قیدی انتظامات ہوتے ہی واپس کر دیئے جائیں گے۔ باقی قیدیوں کے مقدموں کے بارے میں حتمی تصفیہ کے لئے کسی مناسب وقت پر دوبارہ مذاکرات شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی تفصیلات اس طرح ہیں۔

(1) معاہدہ کی شق نمبر 2 کے تحت پاکستان کے تمام جنگی قیدی اور نظر بند شہری ضروری انتظامات کے مکمل ہوتے ہی واپس پاکستان بھیج دیئے جائیں گے۔ باہمی رضا مندی سے ان کی واپسی کی تاریخ کا تعین کیا جائے گا۔

(2) 195 جنگی قیدیوں سے متعلق فریقین کے موقف میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر بلا تاخیر انسانی مسائل کے حل پر عمل درآمد کیا جائے گا۔

(3) اس کے ساتھ ہی پاکستان میں رکے ہوئے تمام پاکستانیوں کو جن کا ذکر مشق نمبر 5 میں کیا گیا ہے واپس بھیج دیا جائے گا۔

(4) ان افراد کی واپسی بیک وقت عمل میں لائی جائے گی۔

(5) پاکستان اور بنگلہ دیش نے اپنے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے ان غیر بنگالیوں کا مسئلہ جنہوں نے پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اس طرح حل کیا ہے کہ حکومت پاکستان نے محض انسانی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے معقول تعداد میں ان افراد کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی ہے، اس بات پر

اتفاق کیا ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے وزیر اعظم یا ان کے نمائندے سے ملاقات کر کے اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ جن غیر بنگالیوں نے بنگلہ دیش سے پاکستان جانے کی خواہش ظاہر کی ہے ان کی کتنی تعداد کو پاکستان قبول کرتا ہے۔ بنگلہ دیش نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ اس بات چیت میں خود مختاری اور برابری کی بنیاد پر حصہ لے گا۔

(6) بنگلہ دیش نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ وہ ان جنگی قیدیوں کی واپسی کے دوران 195 جنگی قیدیوں پر مقدمہ نہیں چلائے گا اور تا فیصلہ یہ قیدی بھارت میں ہی رہیں گے۔

(7) پاکستانی جنگی اور شہری علاقوں کی واپسی مکمل ہونے کے بعد اور پاکستان میں رکے ہوئے بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں رکے ہوئے ان پاکستانیوں کی واپسی کے اختتام پر جن کا ذکر معاہدہ کی شق نمبر 5 میں ذکر کیا گیا ہے، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں 195 پاکستانی جنگی قیدیوں کا مسئلہ طے کیا جائے گا۔ یہ بات اس سے پہلے بھی طرفین کے اتفاق رائے سے ہو سکتی ہے۔

(8) پاکستان میں رکے ہوئے بنگالیوں، بھارت میں نظر بند پاکستانی جنگی قیدیوں اور بنگلہ دیش میں رہنے والے پاکستانیوں کی واپسی کے انتظامات بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مشورے کرے گا۔ بھارت پاکستانی جنگی قیدیوں کو پہنچائے گا اور پاکستان بنگالیوں کو بنگلہ دیش تک پہنچائے گا اور پاکستان بنگالیوں کو بنگلہ دیش تک پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔

(9) بنگلہ دیش کی حکومت پاکستانی باشندوں کو اس مقام تک پہنچائے گی جس پر فریقین کے درمیان اتفاق رائے ہوگا۔ ان کے لئے ٹرانسپورٹ کے انتظامات بھی بنگالی حکومت کرے گی، ان انتظامات کے لئے متعلقہ حکومتیں بین الاقوامی انسانی تنظیموں سے مدد لے سکتی ہیں۔

(10) معاہدے کے مطابق تینوں حکومتوں میں رکے ہوئے افراد تک پہنچنے کے لئے حکومت سوئیزر لینڈ کے نمائندوں یا دنیا کی کسی انسانی تنظیم پر کوئی پابندی نہیں

ہو گی۔ پاکستان میں رکے ہوئے بنگالی اور بنگلہ دیش میں رکے ہوئے پاکستانی با آسانی آ جا سکیں گے۔ حکومت پاکستان اور بنگلہ دیش ان نمائندوں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرے گا۔

(11) جو افراد اپنے ملک کو واپس جائیں گے ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک روا رکھا جائے گا۔

حکومت بھارت کے نمائندے نے اس معاہدے کے متعلق بنگلہ دیشی حکومت سے صلاح مشورہ کر لیا ہے اور اس معاہدے سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ 28 اگست 1973ء کو نئی دہلی میں طے پایا اور اس کی تین نقول تیار کی گئیں اس پر مسٹر عزیز احمد (پاکستان) اور پی این ہکسر (بھارت) نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کے تحت ستمبر 1973ء کے آخری ہفتہ میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی شروع ہوئی اور بالآخر 30 اپریل 1974ء کو تمام جنگی کی واپسی پر منتج ہوئی۔

مذاکرات کا تسلسل

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے جبری خاتمے کے بعد فروری 1978ء میں بھارتی وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا، جس کے بعد آغا شاہی دہلی گئے اور پاکستان نے بھارت سے سلال ڈیم، ٹریڈیشن ٹرانزٹ، کلچر، سپورٹ سے متعلق کچھ معاہدے کیے، جن پر آسانی سے دونوں ممالک رضامند ہو گئے، کیوں کہ ان میں مسئلہ کشمیر شامل نہیں تھا۔ اس دوران افغانستان میں روس کی مداخلت نے بین الاقوامی منظرنامہ بدل کر رکھ دیا۔

17 جولائی 1981ء کو جب امریکا نے پاکستان کو فوجی اور اقتصادی امداد کا اعلان کیا تو بھارت نے اس پر شدید احتجاج کیا، جس پر جنرل ضیاء الحق نے بھارتیوں کو (No war pact) جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیشکش کی، جسے بھارت نے قبول نہ کیا۔ اس کے برعکس بھارت نے ''دس نکاتی'' ایجنڈا جاری کر دیا، جس پر عمل پاکستان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ 30 جنوری 1982ء کو بھارتی وزیر خارجہ نرسمہا راؤ اور آغا شاہی کے درمیان مذاکرات ہوئے، جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اپریل 1984ء میں بھارتی افواج نے اچانک یورش کی اور سیاچن کے تین دروں پر قابض ہو گئی۔ 17 دسمبر 85ء کو جنرل ضیاء الحق نے بھارت کا دورہ کیا اور راجیو گاندھی سے مذاکرات بھی کیے، اس مرحلے پر انھوں نے ''سیاچن'' پر گھاس نہیں اگتی'' والا مشہور فقرہ کہہ کر بحث کا دروازہ کھول دیا تھا۔

1985ء میں سارک کا قیام عمل میں آیا، جس سے دونوں ممالک کے سربراہوں میں ملاقاتوں کا سالانہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ 7 دسمبر 85ء کو پہلی سارک کانفرنس ڈھاکہ میں ہوئی، جہاں جنرل ضیاء الحق نے شرکت کی۔ 1986ء میں پاکستان کی نمائندگی جونیجو مرحوم نے اور 1988ء میں بے نظیر بھٹو نے کی، اس مرحلے پر راجیو گاندھی بھی پاکستان آئے،

لیکن کوئی خاص خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

اس کے بعد 1990ء سے 1992ء تک خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا ایک دور دکھائی دیتا ہے۔ جب 1989ء کے آخر میں کشمیری مجاہدین نے بالآخر بھارت کے خلاف عسکری جدوجہد کا آغاز کیا۔ 19 جنوری 1990ء کو فاروق عبداللہ نے مجاہدین کی سرگرمیوں سے خوف زدہ ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان کی طرف سے اس ''جہاد'' اور بھارت کی طرف سے ''سرحد پار دہشت گردی'' کے لئے پاکستان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ شمالی کمانڈ کے بھارتی افسر کمانڈنگ جنرل گوریندر سنگھ نے اپنی حکومت کے سامنے پاکستانی مداخلت پر شدید احتجاج کیا۔ اپریل 1990ء تک یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی مرحلے پر دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس صورت حال کا امریکہ نے نوٹس لیا اور مئی 1990ء میں صدر جارج بش نے رابرٹ گیٹس کو اپنا خصوصی ایلچی بنا کر پاک بھارت دورے پر روانہ کیا جس نے دونوں ممالک کو مذاکرات کے لئے آمادہ کر لیا۔

مذاکرات کا پہلا دور 18 سے 19 جولائی 1990ء تک اسلام آباد میں ہوا۔ بھارتی وفد کی نمائندگی سیکرٹری خارجہ مچکند دوبے اور پاکستان سے تنویر احمد خان نے کی۔ جس میں کنٹرول لائن کی سنگین صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور باہمی اعتماد کی بحالی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ روکنے پر مفاہمت کی گئی۔ مذاکرات کا دوسرا دور 10 اور 11 اگست 1990ء کو دہلی میں ہوا جس میں صرف Military Confidence Building Measures پر ہی گفت و شنید ہوئی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

18 تا 20 دسمبر 1990ء کو اس سلسلے کا تیسرا راؤنڈ ہوا۔ پاکستانی وفد کی قیادت شہر یار خان اور بھارتی وفد کی قیادت حسب سابق مچکند دوبے نے کی۔ اسلام آباد میں ہونے والے ان مذاکرات میں بھارت نے کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بتانے کی رٹ جاری رکھی۔ پاکستان کی طرف سے جب نیوکلیئر مسئلے کو علاقائی سطح پر حل کرنے کی تجویز دی گئی تو بھارت نے اسے عالمی سطح پر حل کرنے پر زور دیا اور مذاکرات ختم ہو گئے۔ مذاکرات کا چوتھا

دور 4 تا 6 اپریل 1991ء کو دہلی میں ہوا جس میں دونوں ممالک کی سابقہ مذاکرات والی ٹیم شامل تھی ان مذاکرات کا بنیادی ایجنڈا ''باہمی اعتماد کی بحالی'' Military Confidence Building Measures قرار دیا گیا۔ آخر میں جس معاہدے پر دستخط ہوئے اس کے مطابق دونوں ممالک نے ایک دوسرے کی فضائی حدود کی خلاف ورزی نہ کرنے اور فوجی نقل و حرکت سے ایک دوسرے کو آگاہ رکھنے کا وعدہ کیا اور دونوں ممالک ''اصولی طور پر'' سیاچن پر مذاکرات کے لئے تیار ہو گئے۔ ''سر کریک'' اور وولر بیراج'' پر بھی بات چیت ہوئی۔ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ شہریار خان نے اس دوران بھارتی وزیر اعظم چندر شیکھر سے ملاقات کی، اس معاہدے کی باقاعدہ مظوری پاکستانی کابینہ نے 10 اگست 1990ء کو دی۔

مذاکرات کا پانچواں دور مری میں 30، 31 اکتوبر 1991ء کو ہوا، جس میں دونوں ممالک نے جنوری 1992ء تک اپنی اپنی نیوکلیئر تنصیبات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرنے کا معاہدہ کیا، اس مرحلے پر ''سر کریک'' بھی زیر بحث آیا۔ مذاکرات 26 مئی کو ہونے تھے لیکن دو بھارتی سفارت کاروں کی پاکستان سے بے دخلی اور جوابی بھارتی کاروائی نے معاملہ بگاڑ دیا۔

مذاکرات کے اس دور کی نمائندگی جے این ڈکشت اور پاکستان کی طرف سے شہر یار خان نے کی اور دو معاہدے طے پائے، جن میں سے ایک سفارتی نمائندوں کے ''ضابطہ اخلاق'' Code of Conuct اور دوسرا ایک دوسرے کے خلاف جراثیمی ہتھیاروں کے استعمال کی ممانعت تھا۔ بھارتی حکومت کی طرف سے جاری ہینڈ آؤٹ میں کشمیر سے متعلق کسی بات کا تذکرہ نہیں تھا۔

مذاکرات کے ان چھ ادوار میں کشمیر پر بات نہ ہو سکی۔ اگست 1992ء میں جب بے نظیر بھٹو دوبارہ برسر اقتدار آئیں تو بھارتی وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے اپنے پیغام خیر سگالی میں مسئلہ کشمیر پر گفتگو کا عندیہ دیا۔ اس کے بعد بھارت اٹوٹ انگ بنا دیا۔ عالمی دباؤ اور اپنے اندرونی حالات سے مجبور ہو کر جن میں بابری مسجد کی شہادت اور حضرت بل کا محاصرہ شامل تھا، بھارت نے بالآخر یکم جنوری 1994ء سے پاکستان میں مذاکرات کا آغاز کیا۔

بھارتی وفد کی نمائندگی سیکرٹری خارجہ جے این ڈکشت نے کی اور مذاکرات کا آغاز کرنے سے پہلے صدر فاروق لغاری سے ملاقات کی۔ 2 جنوری کو مذاکرات کے دو ابتدائی دور ہوئے لیکن حسب روایت گفت وشنید سے آگے سلسلہ بڑھتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان مذاکرات کا اختتام اس مشترکہ اعلامیہ کے ساتھ ہوا کہ دونوں ممالک کے درمیان بنیادی تنازع یعنی مسئلہ کشمیر کے حل کرنے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ بھارتی وفد نے روانگی سے پہلے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر کے نرسمہا راؤ کی نیک خواہشات اور پیغام خیر سگالی البتہ ضرور ان تک پہنچا دیا۔

اعلان لاہور

بھارت نے 11 مئی 1998ء کو اچانک ایٹمی دھماکہ کر کے جنوبی ایشیا کی ساری فضا دھواں دار کر دی جس پر پاکستان کو ایک اعصاب شکن انتظار کے بعد بین الاقوامی سطح پر بھارت کے اس جارحانہ اقدام کی خاطر خواہ مخالفت نہ ہونے کے سبب پاکستانی عوام بے پناہ دباؤ پر بالآخر 28 مئی 1998ء کو جوابی ایٹمی دھماکے کرنے پڑے۔ 1974ء میں بھارت نے بغیر کسی جواز یا ضرورت کے ایٹمی دھماکہ کیا پھر 11 مئی 1998ء کو مزید پانچ ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان کو للکارنا شروع کر دیا کہ وہ ''طریقے سے اور فرمانبرداری سے پیش آئے ورنہ پاکستان کو سبق سکھایا جائے گا'' جس کے بعد پاکستانی ''شیر'' کو بھی مجبوراً نیند سے بیدار ہونا پڑا اور پاکستان نے بھی 28 مئی 1998ء اور پھر 30 مئی کو یکے بعد دیگرے چھ دھماکے کر دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی بھارت جو پاکستان کو للکار رہا تھا یکلخت اس کے رویئے میں تبدیلی آگئی اور وہ تمام مسائل کو مذاکرات کی میز پر حل کرنے کی باتیں کرنے لگا۔

دوسری طرف بھارت مقبوضہ کشمیر میں سات لاکھ فوج رکھے ہوئے تھا جو ہر روز مظلوم اور نہتے کشمیریوں پر گھناؤنے مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔ بھارت کسی صورت کشمیریوں کو یہ حق نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنا مستقبل اپنی رائے سے ظاہر کریں آیا وہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ۔ آج کی طرح بھارت کی اس وقت بھی ایک ہی رٹ تھی کہ کشمیر ان کا حصہ ہے کیوں کہ اس وقت کے کشمیری مہاراجہ نے انہیں دعوت دے کر بلایا تھا۔

1965ء اور 1971ء میں بھارت کی جنگی یلغار پاکستان کے خلاف محض اس وقت سوویت یونین، امریکہ اور برطانیہ کی ایماء پر ہوئی تھی اور اب 1999ء میں بھی روس، جاپان، امریکہ اور برطانیہ اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ پاکستان اور بھارت کے

درمیان کوئی نام نہاد ہی سہی کوئی امن سمجھوتہ ہو جانا چاہئے۔ بعض لوگ مسٹر واجپائی یاترا کو اقوام متحدہ کی اس کشمیر قرارداد کو جس کے تحت کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا کو دفنانے کی ایک کوشش قرار دے رہے تھے۔

دونوں ممالک کے ایٹمی طاقت بن جانے سے ساری دنیا میں واویلا مچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر مغربی سفارتکار سرگرم عمل ہوئے، انہیں خوف لاحق تھا کہ کہیں دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ شروع کر دیں۔ امریکی سفارتکاروں کے دورے شروع ہوئے اور 20 فروری **1999**ء کو بھارتی وزیر اعظم واجپائی بس یاترا کے ذریعے لاہور تشریف لانے کا پروگرام طے ہوا۔

مسٹر واجپائی کا تعلق ایک ایسی متشدد انہ ہندو جماعت سے ہے جو ہندوؤں کے علاوہ کسی اور کو بھارت میں برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ جب دسمبر **1978**ء کے اوائل میں پاکستان نے عالمی سطح پر ایک دستاویز میں کشمیر کو متنازعہ کہہ دیا تو واجپائی جو اس وقت بھارت کے وزیر خارجہ تھے آگ بگولا ہو گئے۔ 6 دسمبر **1978**ء کو انہوں نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے نہایت تلخ لہجے میں کہا:

> ''یہ پاکستان کی شرارت کا نتیجہ ہے کہ وہ عالمی سطح پر ایسی شرارتیں بار بار کر رہا ہے اور اس طرح آگ سے کھیل رہا ہے۔ ہم اسے یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ بھارت پاکستان سے اچھے تعلقات کا خواہشمند ضرور ہے لیکن وہ پاکستان کی 'فضول' باتوں کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ جموں و کشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے اور ہمارے کسی خطے کو عالمی دستاویز میں متنازعہ ظاہر کرنا شرارت کے سوا کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا۔''

واجپائی صاحب جب مارچ **1998**ء میں بھارت کے وزیر اعظم بنے تو کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنا اور آزاد کشمیر پر قبضہ ان کی جماعت کے ایجنڈے میں سرفہرست تھا لیکن مخلوط حکومت ہونے کے سبب وہ مجبور ہونے کی بنا پر اس ایجنڈے کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے خفیہ طور پر عملدرآمد کرنے کی راہ اپنائی۔ 19 اپریل **1998**ء کو

انہوں نے اپنے سائنسدانوں کو کہا کہ وہ 11 مئی 1998ء تک ایٹمی دھماکے کریں، مقصد یہ تھا کہ ایٹمی دھماکے کر کے آزاد کشمیر پر حملہ کرلیا جائے تا کہ مسئلہ کشمیر کو ختم کرنے کے علاوہ پاکستان اور چین کے درمیان زمینی رابطے کو ختم کر دیا جائے۔

چنانچہ بھارت نے 11 مئی کو دھماکے کر کے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور واجپائی اور ان کے ساتھی خود کو ہلاکو اور چنگیز خان سے تعبیر کرنے لگے۔ 15 مئی کو اپنی رہائش گاہ پر اپنی جماعت کے کارکنوں سے خطاب کیا وہ اس وقت کیسری رنگ کی پگڑی پہنے ہوئے تھے انہوں نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر بھارت کی کسی ملک سے جنگ ہوئی تو وہ ایٹم بم گرانے سے گریز نہیں کرے گا۔ بھارت کے پاس ایک بڑا ایٹم بم موجود ہے جس کا کمانڈ اور کنٹرول سسٹم ہمارے ہاتھ میں ہے۔

واجپائی صاحب کے اس جنگی اعلان کے تین روز بعد ان کے ایک دست راست وزیر داخلہ ایڈوانی نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ کشمیر پالیسی رول بیک کرے اور یہ کہ وہ علاقے اور دنیا کی جیوسٹر ٹیجک صورتحال میں تبدیلی کا ادراک کرنے علاوہ بھارت مخالف پالیسی چھوڑ دے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ کشمیر میں بغاوت ختم ہو چکی ہے۔ اسی روز واجپائی نے سینہ تان کر کہا کہ ''اب بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں رہی، اب ہم بڑی طاقتوں کو مشورہ دیا کریں گے''، جس کے بعد پاکستان نے بھی ہنگامی بنیادوں پر ایٹمی دھماکے کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

پاکستان کے ان ایٹمی دھماکوں نے بھارتی حکمرانوں کے طاقت کے نشے کو اتار دیا، انہیں معلوم ہو گیا کہ پاکستان کے پاس بھی غوری میزائل ہے جس کے ذریعے وہ بھارت پر ایٹم بم گرا سکتا ہے۔ چنانچہ عالمی طاقتوں نے پاکستان اور بھارت کو مفاہمتی رویہ اپنانے کا مشورہ دیا جس کے جواب میں واجپائی نے کہا ''ہم دنیا کو نہیں مانتے۔'' تاہم واجپائی اب ہوش میں آ چکے تھے اور انہوں نے کیسی پگڑی اتار دی اور 4 جون کو راجیہ سبھا میں کہا ''پاکستان اور بھارت کے ایٹمی دھماکوں میں کشیدگی والی کونسی بات ہے، پاکستان مسئلہ کشمیر پر بات چیت پر اصرار کرتا ہے تو ہم بھی تیار ہیں، ہم کشمیر سمیت تمام مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کو تیار ہیں۔'' اب مسٹر واجپائی کو حقیقی خطرہ یہ نظر آنے لگا تھا

کہ مسئلہ کشمیر عالمی سطح پر آجائے گا اور اس کا نقصان بھارت ہی کو ہوگا۔ انہوں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی ہی سے انکار کر دیا۔ اس پر وائس آف امریکہ نے جو تبصرہ کیا وہ قابل غور ہے:

> ''واجپائی صاحب کا بیان ایسے وقت پر آیا ہے جب دنیا کی پانچ بڑی طاقتیں جنیوا میں کشمیر کے تنازعہ پر بحث کر رہی ہیں بھارتی عہدے داروں کو اندیشہ ہے کہ ان مذاکرات کے نتیجے میں کشمیر کے تصفیے کے لئے بین الاقوامی ثالثی کے لئے کہا جا سکتا ہے۔''

انہیں دنوں کلنٹن انتظامیہ سوچ رہی تھی کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے بھارت پر دباؤ ڈالا جائے امریکی وزیر خارجہ نے کہا کہ امریکہ پاکستان اور بھارت پر زور دے گا کہ وہ مسئلہ کشمیر حل کرنے کے علاوہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کریں۔ امریکہ بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لئے چین کی طرف دیکھنے لگا اور 11 جون کو کلنٹن نے واشنگٹن میں کہا کہ پاک بھارت اسلحہ دوڑ رکوانے کے لئے چین جانا ضروری ہے یہ بے وقوفوں والی سوچ ہوگی کہ ہم چین کے ساتھ مضبوط تعاون کے بغیر عالمی چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ پھر وہ چین گئے اور جو اعلامیہ شائع ہوا، اس میں امریکہ اور چین کے صدور نے کہا کہ خطے میں ہتھیاروں کی دوڑ رکوانے اور پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت کی فضا پیدا کرنے کے لئے ہمیں کردار ادا کرنا ہوگا۔

بھارت نے اس اعلامیئے کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی لیکن بھارت اعلامیئے کے اصل پیغام کو سمجھ چکا تھا یعنی اگر بھارت نے کشمیر پر حملہ کیا تو چین آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے واجپائی کو مجبور کیا کہ وہ کیسری پگڑی اتار کر امن اور خوشحالی کی باتیں کرے۔

چنانچہ 20 فروری کو واجپائی صاحب بذریعہ بس واہگہ بارڈر پر اسی راستے سے پاکستان میں داخل ہوئے جس راستے سے 1965ء میں بھارتی افواج نے بی آر بی نہر پار کر کے لاہور میں داخل ہونا تھا لیکن وہ اس میں ناکام رہے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری واجپائی اور پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر نواز شریف کے درمیان گورنر ہاؤس میں

باضابطہ طور پر ''ون ٹو ون'' ملاقات ہوئی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔اس سے قبل دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ اور دیگر حکام کا بھی ایک اہم اجلاس ہوا جو 90 منٹ تک جاری رہا۔اس اجلاس میں پاکستان کی طرف سے وزیر خارجہ سرتاج عزیز وزیر مملکت برائے خارجہ امور صدیق کانجو اور بھارت کی طرف سے وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور بھارت کے وزیراعظم کے سپیشل سیکورٹی ایڈوائزر ستیش شرما شامل تھے۔اجلاس کے بعد دونوں ممالک کے حکام نے بتایا کہ یہ مذاکرات کامیاب رہے ہیں اور ان میں کشمیر، ایٹمی اسلحے کی دوڑ روکنے کے امور پر بات چیت کے علاوہ دونوں ممالک کے مختلف شعبوں میں تعاون بڑھانے پر بھی اتفاق کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ متنازعہ امور طے کرنے کے لئے ہر سطح پر بات چیت جاری رکھنے پر اصولی اتفاق کیا گیا ہے۔

21 فروری کو گورنر ہاؤس میں استقبالیہ کے دوران ''اعلان لاہور'' جاری ہوا اور سربراہ ملاقات میں جن امور پر سمجھوتہ ہوا اس کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) دونوں ممالک بیلاسٹک میزائل کے سمٹ سے قبل ایک دوسرے کو تحریری طور پر آگاہ کریں گے اور اس سلسلے میں دونوں ممالک باہمی طور پر ایک معاہدہ پر بھی دستخط کریں گے۔

(2) دونوں ممالک باہمی طور پر مذاکرات کریں گے جن میں سلامتی اور نیوکلیئر ڈاکٹرائن (Doctrines) کے حوالہ سے باہمی اعتماد بڑھانے کے لئے لائحہ عمل طے ہوگا۔تاکہ کسی بھی ممکنہ تنازعہ سے محفوظ رہا جا سکے۔

(3) دونوں ممالک اس بات پر مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ وہ قومی سطح پر ایسے اقدامات کریں گے جس کے تحت ایٹمی اسلحہ کے کسی بھی حادثاتی غیر مجاز استعمال کے خطرہ کو کم سے کم کیا جا سکے۔اس سلسلہ میں دونوں ممالک نے اس امر پر بھی اتفاق کیا ہے کہ وہ ایٹمی اسلحہ کے حوالہ سے کسی بھی قسم کے حادثہ غیر مجاز استعمال یا کسی اور واقعہ کی ایک دوسرے کو تحریری طور پر اطلاع دیں گے، جس کے نتیجہ میں ایٹمی جنگ کا خطرہ ممکن ہو۔اس کے ساتھ ایسے اقدامات بھی کئے جائیں گے جن میں ایسے واقعات کی روک

تھام کا انتظام کیا جائے اور دونوں ممالک باہمی طور پر ایسا نظام بھی وضع کریں گے جس سے ایسے کسی حادثہ کی بر وقت اطلاع دی جا سکے اور کسی بڑی غلطی فہمی سے بچا جا سکے۔

(4) دونوں ممالک اپنے طور پر اس پابندی پر عمل کریں گے کہ مزید ایٹمی ٹیسٹ نہ کئے جائیں جب تک کہ ان کے ممالک میں اس حوالہ سے کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہو جائے اور دھماکہ کرنا ان کے سخت ترین مفاد کے لئے ناگزیر ہو۔

(5) دونوں ممالک سمندر میں حادثات کی روک تھام کے بچاؤ کے حوالہ سے بھی ایک معاہدہ پر دستخط کریں گے تاکہ دونوں ممالک کی سمندری آبدوزوں اور ائیر کرافٹ کا تحفظ کیا جا سکے۔

(6) دونوں ممالک کے باہمی اعتماد کو فروغ دینے کے لئے ممکنہ اقدامات پر عمل درآمد کے لئے ایک ٹھوس و جامع لائحہ عمل مرتب کریں گے تاکہ باہمی اعتماد کی فضا کو فوری ممکن بنایا جا سکے۔

(7) دونوں ممالک نے اس امر پر بھی اتفاق کیا ہے کہ وہ باہمی طور پر قائم ڈائریکٹر جنرل ملٹری اپریشن کی سطح پر قائم مواصلاتی رابطہ کو مزید بہتر درجہ دینے اور محفوظ بنانے کے لئے بھرپور جائزہ لیں گے۔

(8) دونوں ممالک باہمی طور پر سلامتی، تخفیف اسلحہ اور ایٹمی عدم پھیلاؤ پر مذاکرات کریں گے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ اس حوالہ سے جہاں بھی ضرورت ہوگی دونوں ممالک کے تکنیکی ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں گی اور 1999ء کے وسط سے قبل ان تمام معاملات پر دستخط کر لئے جائیں گے۔

اس میمورنڈم آف انڈرسٹینڈنگ کے شروع میں دونوں ممالک نے اقوام متحدہ کے چارٹر اور شملہ معاہدہ کی روح کے مطابق عملدرآمد کا عزم ظاہر کیا۔ اس کے علاوہ اس میں کہا گیا کہ 23 ستمبر 1998ء کو دونوں ممالک کے وزرائے اعظم میں امن و سلامتی کے

بارے میں نیویارک معاہدہ کی رہنمائی میں جموں وکشمیر سمیت تمام متنازعہ مسائل حل کئے جائیں گے اور یہ مفاہمت کی یادگار لاہور میں دونوں وزرائے اعظم کی امن وسلامتی کے لئے اقدامات کرنے کی ہدایت کے تحت تیار کی گئی۔

بھارتی وزیراعظم کے اس دورے کے خلاف جماعت اسلامی نے شدید احتجاج کیا، بعض سنجیدہ حلقوں کا بھی خیال تھا کہ مسئلہ کشمیر کو ایک تنازعے کے طور پر ایجنڈے کا حصہ بنائے اور بھارتی حکومت سے موثر یقین دہانیاں حاصل کئے بغیر سربراہی ملاقات کا اہتمام نہ کیا جائے۔ اگر امریکی دباؤ کے تحت مذاکرات ضروری ہیں تو بھی عوام کو اعتماد میں لیا جائے، لیکن حکومت پاکستان نے مسٹر واجپائی کو روایات کے برعکس واہگہ بارڈر پر خوش آمدید کہا اور مسٹر واجپائی کے اس دورے کو تاریخ کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔

ادھر پاکستانی حکومت کے ذمہ دار اعلان لاہور کو مسئلہ کشمیر کے حل کی طرف ایک اہم پیش رفت قرار دے رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر واجپائی نے نئی دہلی واپس جا کر اپنے روائتی انداز میں یہ کہہ کر ساری توقعات پر پانی پھیر دیا کہ ”میں نے نواز شریف کو بتایا ہے کہ کشمیر میں مسلمان علیحدگی پسند بے گناہ بچوں اور عورتوں کو قتل کر رہے ہیں، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات معمول پر لانا بہت مشکل ہوگا۔“

------✡------

اعلان واشنگٹن

کارگل کے آس پاس کا علاقہ دنیا کے چند خوبصورت ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ لیکن ملٹری آپریشنوں کو بروئے عمل لانے کے لیے یہ علاقہ دنیا کے مشکل ترین علاقوں میں سے بھی ہے کارگل کی یہ چھوٹی سی جنگ جس علاقے میں لڑی گئی وہ دراس سے کارگل اور بٹالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ایک سو کلومیٹر تک ہو گی۔ اس میں جو خطرناک کوہستانی چوٹیاں واقع ہیں، ان کی بلندی 13 سے 18 ہزار فٹ تک ہے جب کہ وادیاں سطح سمندر سے 7 ہزار فٹ بلند ہیں۔ ایک چوٹی لائن کے پیچھے دوسری چوٹی لائن واقع ہے اور درمیان میں گھاٹیوں اور کھائیوں کے سلسلے میں ہیں۔ ان کھائیوں کی گہرائیاں سینکڑوں سے لے کر ہزار فٹ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انفنٹری اٹیک جب تک کسی ناگہانیت کی بنیاد پر استوار نہ ہوں، انتہائی مہنگے پڑتے ہیں اور دردناک حقیقت یہ ہے کہ ان حملوں کا انجام بیشتر ناکامی ہوتا ہے۔ کسی حملہ آور یا دفاع کنندہ فوج کا حجم، کوہستانی نقوش زمین کے سائز کے ساتھ براہ راست منسلک ہے۔ بالعموم ایک پوسٹ پر چار سے بارہ سپاہی رہ سکتے ہیں۔ دامن کوہ سے اوپر بلندی تک جانے کے راستے کا حجم یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کتنے سپاہی شانہ بشانہ ایک ساتھ اس پر چڑھ سکتے ہیں۔ بالعموم ان کی تعداد آٹھ سے بیس تک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دفاع کرنے والے کو حملہ کرنے والے کے مقابلے میں زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ اس علاقے کی دشوار گزاری اور شدید نشیب و فراز کے علاوہ یہاں کا موسم آب و ہوا ایسی ہے کہ جس کی بناء پر بھارتی پروڈکٹس نے یہ خطرہ مول لیا تھا کہ وہ ان بلندیوں پر موسم گرما میں تو موجود رہتے تھے لیکن جب سردیاں آتیں (جو اکتوبر میں شروع ہو جاتی ہیں) تو وہ نیچے اتر کر نسبتاً گرم علاقوں میں چلے جاتے اور پھر جب موسم بہار آتا (جو مئی سے شروع ہوتا ہے) تو وہ پھر واپس ان چوٹیوں پر لوٹ آتے۔

ان پہاڑی علاقوں میں کچے راستوں کو ''سڑکوں'' کا نام دیا جاتا ہے۔ تاہم یہ راستے فوجی گاڑیوں کا لوڈ لے سکتے ہیں۔ یہ کچے راستے (ٹریک) بالعموم وادیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان علاقوں میں کہ جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ ٹریک، دراس سے کارگل تک دامن ہائے کوہ کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کچے راستوں میں جہاں کہیں موڑ آتے ہیں ان پر اوپر چوٹیوں پر سے فائرنگ کی جاسکتی ہے۔ چھوٹے ہتھیاروں کی یہ فائرنگ سڑک (ٹریک) بند ہونے کا باعث بنتی ہے۔ ان وادیوں کی چوڑائی چند سو گز سے لے کر تقریباً ہزار گز تک ہے۔ دراس کے نزدیک وادی کا عرض سب سے زیادہ ہے جو پانچ سے لے کر سات ہزار گز تک ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں دراس میں ایک چھوٹی سی کنٹونمنٹ بھی قائم ہے۔ ان بلندیوں پر تعنیات ٹروپس سردیوں میں اسی کنٹونمنٹ میں پیچھے آجایا کرتے تھے۔

یہ نومبر 1998ء کا وسط تھا جب لیفٹیننٹ جنرل محمود، کمانڈر 10 کور نے چیف آف جنرل سٹاف، لیفٹیننٹ جنرل عزیز کے توسط سے چیف آف آرمی سٹاف، جنرل پرویز مشرف کا انٹرویو مانگا، جب جنرل محمود، آرمی چیف سے ملاقات کے لیے گئے تو ان کے ساتھ میجر جنرل (اب لیفٹیننٹ جنرل) جاوید حسن بھی تھے، جو فورس کمانڈر ناردرن ایریا (FCNA) تھے۔ ان افسروں نے ایک ایسے پلان کی تکمیل کی اجازت طلب کی جو قبل ازیں مسترد کیا جاچکا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ سردیوں میں انڈین ٹروپس دراس کارگل سیکٹر میں جن بلندیوں کو خالی کرتے ہیں، ان پر قبضہ کرلیا جائے۔ ایسا کرنے سے مقصود یہ تھا کہ کشمیر میں لڑنے والے حریت پسندوں کی مدد کی جائے اور ان کو تقویت فراہم کی جائے۔ اصولی طور پر یہ پلان منظور کرلیا گیا اور ہدایات جاری کردی گئیں کہ ابتدائی تیاریاں شروع کردی جائیں۔ اس پلان کی خبر صرف ان چار اشخاص تک محدود رکھی گئی کہ جو اس گفتگو میں شریک تھے یعنی (1) جنرل مشرف (2) جنرل عزیز (3) جنرل محمود (4) جنرل جاوید حسن۔

اس جنگی پلان کی تکمیل کی تیاریاں اگرچہ نومبر دسمبر 1998ء میں شروع ہوگئی تھیں، تاہم وزیراعظم نواز شریف کو دسمبر 1998ء میں کسی وقت مطلع کیا گیا تھا اور وہ بھی

سرسری طور پر۔ ان کے سامنے بھی یہی دلیل دی گئی کہ کشمیر کے حریت پسندوں کو تقویت کی سخت ضرورت ہے اور یہ تقویت ان علاقوں میں اپنے ٹروپس بھیج کر فراہم کی جا سکتی ہے۔ نواز شریف جس طرح کی شخصیت ہیں، انہوں نے اس کا تاثر بھی ویسا ہی لیا۔ ملٹری لیڈر شپ نے نہ تو ملٹری آپریشنز کے سکیل کا کوئی مکمل جائزہ انہیں پیش کیا اور نہ ہی ممکنہ سیاسی مقصد کی نشان دہی کی کہ جو اس پلان کی کامیاب تکمیل سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔

اس مرحلے پر باقی پاک فوج کو بھی کچھ خبر نہ تھی کہ اس طرح کا کوئی آپریشن بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ نیوی اور ایئر فورس کے چیفس کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ تمام تیاریاں خفیہ خفیہ جاری رہیں۔ جوں جوں ٹروپس خالی بلندیوں پر قابض ہوتے چلے گئے وہ مزید آگے بڑھتے رہے۔ وہ ایک بلندی کے بعد آگے بڑھتے تو مزید بلندیاں خالی نظر آتیں اور وہ ان پر بھی قابض ہوتے چلے گئے تا آنکہ وہ مرحلہ آ گیا کہ وادی کشمیر (دراس) ان کے سامنے نظر آنے لگی۔ اس عمل کے نتیجے میں یہ ٹروپس 130 مربع کلومیٹر تھا اور گہرائی 7 سے لے کر 15 کلومیٹر تک تھی۔ مختلف سائز کی 132 پوسٹوں پر وہ قابض ہو چکے تھے، لیکن جن ٹروپس نے یہ علاقے زیر قبضہ کیے ان کی تعداد کل ملا کر 1000 سے زیادہ کبھی نہ تھی۔ ہاں جن ٹروپس نے انصرامی امداد فراہم کرنے کا بندوبست کیا، ان کی تعداد 4000 ہزار تھی۔ اس قابض سپاہ کا تعلق زیادہ تر ناردرن لائٹ انفنٹری (NLI) سے تھا۔ علاوہ ازیں کچھ لوکل مجاہدین بھی تھے جو بطور قلی (لیبر) انصرامی کا کام کاج اور فرائض انجام دیتے رہے۔

موسم گرما کا آغاز ہوا ہی تھا کہ برصغیر میں ایک ایسے واقعہ نے جنم لیا، جس نے پاکستان اور بھارت کے سیاسی، فوجی اور سفارتی تعلقات کی جہتوں کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ اس قدر سنگین اور شدید تھا کہ اس نے پاکستان میں جمہوریت کی بساط کو لپیٹ دیا، ایک منتخب وزیراعظم کو "نگل" لیا اور مملکت خداداد پاکستان ایک بار پھر فوجی حکمرانوں کی گرفت میں چلا گیا۔

یہ واقعہ یا سانحہ کارگل کی جنگ تھی، جس نے پاکستان اور بھارت کو جوہری جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ عوام کو اس جنگ کی قہرمانی کا تجربہ اس وقت ہوا، جب وہ کارگل کے پہلے شہید کیپٹن ناصر کی میت کو کندھا دینے، اسے خراج تحسین پیش کرنے اور اس کے عظیم

الشان جنازے میں شریک ہونے کے لیے مئی 1999ء کے وسط میں واہ کینٹ جمع ہوئے۔ اس وقت کم کم لوگوں نے کارگل کا نام سنا تھا اور حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ کارگل جنگ کو پاکستان باقاعدہ تسلیم بھی نہیں کررہا تھا۔ فوج کی طرف سے خصوصی طور پر کہا جارہا تھا کہ یہ تو محض مجاہدین کی جنگ ہے جو کشمیر سے ملحق سترہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں میں لڑی جارہی ہے ...... مگر جوں جوں کارگل کے شعلے بہت سے نازک ہاتھوں کو جلانے لگے، ہر طرف کہرام مچنے لگا۔ اس دوران ہی یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب کارگل کے ایک اور شہید حوالدار لالک جان، جنہیں بعدازاں نشان حیدر بھی دیا گیا، کی میت شمالی علاقہ (ضلع غزر) میں پہنچی تو مقامی لوگوں نے غصے میں آکر مظاہرہ بھی کردیا۔

کارگل (جس میں دراس اور بٹالک بھی شامل ہیں) کا متنازعہ علاقہ لائن آف کنٹرول (ایل او سی) کے ذرا پار سیاچن اور سری نگر کے درمیان ڈیڑھ سو کلومیٹر کو محیط ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مجاہدین، جنہیں پاکستان کی حمایت حاصل تھی، نے بڑی سرعت رفتاری اور چابک دستی سے کارگل کی بعض چوٹیوں پر آسانی سے قبضہ کرلیا تھا، یوں کہ بھارت کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی، اور یہ حملہ بعض ذرائع کے مطابق، اس وقت کیا گیا، جب بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے دورہ لاہور مکمل کیا ہی تھا اور جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے سیاسی میدانوں میں قدرے اطمینان کی ہوائیں چلنا شروع ہوگئی تھیں ...... لیکن بھارتی حکومت اس واقعہ سے زیادہ دنوں تک ناآشنا نہ رہ سکی۔ اس نے پلٹ کر پاکستانی حمایت یافتہ مجاہدین، مجاہدین کشمیر اور پاک فوج کے دستوں پر کارگل کے مقام پر پہلا باقاعدہ حملہ 6 مئی 1999ء کو تتر دک سیکٹر میں کیا، اور پھر یہ سلسلہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ بعدازاں پاکستان کی افواج کے جوانوں اور افسروں کی خاصی بڑی تعداد کی شرکت کی بھی خبریں آنے لگیں۔

ابتداء میں خبریں سنائی جاتی رہیں کہ پاکستان کارگل پر فتح کے جھنڈے گاڑ رہا ہے، لیکن یکایک فتح کے ان دعوؤں میں کمی اور پاکستانیوں کی شہادتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ وزیراعظم نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کے درمیان کارگل کے مسئلے پر شدید کشیدگی اور ناراضگی پیدا ہوچکی ہے۔ بعدازاں اسی حوالے سے کئی پنڈورا باکس کھلتے گئے۔ کارگل کے محاذ پر مجاہدین اور پاک فوج

کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر پاکستان بھی پسپائی اختیار کرتا گیا۔

بھارت سے سفارتی طاقت اور پروپیگنڈے کے طوفانی استعمال سے عالمی میڈیا میں پاکستان آرمی کے خلاف Rogue Army ایسے دریدہ ذہنی کے اشتہارات بھی شائع کروائے......اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزیراعظم نواز شریف سے منسوب یہ بیان بھی سامنے آیا: مجھے تو کارگل آپریشن کے بارے میں جنرل پرویز مشرف نے اعتماد میں ہی نہیں لیا تھا۔ اس طرح کی Sensitive، Leaking سے پاکستان کی سیاسی حکومت اور فوجی جنتا کے درمیان کشیدگی اور بداعتمادی کی فضا کر فروغ اور بڑھاوا ملا۔

جنرل پرویز مشرف اور میاں نواز شریف کارگل جنگ کے دو بڑے کردار ہیں کہ اس بحران کے وقت مشرف افواج پاکستان کے سالار اعظم اور نواز شریف پاکستان کے منتظم اعلیٰ تھے۔ موخرالذکر بار بار دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں اس لڑائی کی کوئی خبر نہیں دی گئی تھی تا آنکہ ساری دنیا اس سے آشنا ہوگئی۔ جنرل پرویز مشرف، جنہوں نے ہر موضوع پر ہمیشہ کھل کر اور غیر مبہم گفتگو کی ہے، کارگل کا ذکر آتے ہی خاموش تو نہیں ہوتے، لیکن محتاط ترین اور مختصر گفتگو کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

کارگل لڑائی اور بعدازاں واشنگٹن معاہدے (جس پر نواز شریف نے دستخط کیے اور جس کی وجہ سے یہ ہلاکت خیز بحران ختم ہوا) پر تبصرہ کرتے ہوئے ریٹائرڈ جرنیل اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل نے انگریزی ماہنامہ ''ہیرالڈ'' (جولائی 2000 صفحہ 37) کو انٹرویو کے دوران کہا تھا: ''کارگل تصادم کے دوران نواز شریف ایک اہل اور عقل مند وزیراعظم کی حیثیت میں کردار ادا کرنے میں ناکام رہے۔ جب کارگل کی منجمد بلندیوں پر مجاہدین اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے، نواز شریف نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ کارگل لڑائی کے حوالے سے انہوں نے جن جرائم کا ارتکاب کیا، وہ اب آہستہ آہستہ سامنے آ رہے ہیں۔ کارگل کے محاذ پر جو جنگ پاکستان نے جیتی تھی، نواز شریف وہ جنگ واشنگٹن میں ہار آئے۔ ان کی سفارتی ناکامی کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے مجاہدین اور فوجیوں نے جو قربانیاں دیں، سب ضائع چلی گئیں۔

وطن عزیز میں اس موضوع پر خاموشی چھائی رہی لیکن بھارت نے کارگل کے حوالے

سے ایک انکوائری کمیٹی بٹھائی تاکہ اپنی خامیوں اورکوتاہیوں کے بارے میں تحقیق کی جا سکے بھارت میں اس کمیشن کو ''کارگل ریویو کمیٹی'' (Kargil Review Committee) کا نام دیا گیا۔اس میں جنرل مشرف کے کارگل کردار پر سخت تنقید کی گئی ہے۔لیکن یہ کمیٹی نواز شریف کو بھی کارگل سے بالکل بری الذمہ قرارنہیں دیتی۔

1999ء کے موسم گرما کے دوران امریکی صدر بل کلنٹن کے سامنے واشنگٹن میں کیا ہوا تھا؟ نواز شریف وہاں کیوں بھاگم بھاگے پہنچے تھے؟ کیا معاہدہ واشنگٹن پاکستان کی ہزیمت تھی؟ کارگل سے نجات حاصل کرنے کے لیے وائٹ ہاؤس کے اندر امریکی صدر نے نواز شریف سے کیا سلوک کیا تھا؟ یہ ایسے پراسرار سوالات ہیں، جن پر شاید پردہ پڑا رہتا، اگر امریکہ کے ممتاز دانشور بروش ریڈل (Bruce Redal) ایک رپورٹ میں ان سب باتوں کو کھول کھول کر بیان نہ کر دیتے۔

جناب بروس ریڈل سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے قریبی اور راز دار مشیروں (برائے جنوبی ایشیاء) اور دوستوں میں شامل تھے۔ جب نواز شریف کارگل جنگ کے خاتمے کے لیے 4 جولائی 1999ء کو وائٹ ہاؤس پہنچے، بروس ریڈل وہیں تھے۔انہی کی موجودگی میں یہ سارے معاملات، گفتگوئیں اور معاہدہ انجام کو پہنچے۔وہ اس سارے تاریخی منظر کے عینی شاہد ہیں۔مئی 2002ء کو جب کارگل جنگ کی تیسری ''سالگرہ'' منائی جارہی تھی، بروس ریڈل نے کارگل جنگ اور معاہدہ واشنگٹن کے بارے میں ایک تفصیلی ریسرچ پیپر لکھا، جسے امریکہ کی ایک ممتاز یونیورسٹی کے بین الاقوامی امور کے شعبے کے حوالے کیا گیا۔ بعدازاں یہ تحقیقی اور انکشاف خیز مقالہ 7 مئی کو ''واشنگٹن پوسٹ'' نے شائع کر دیا۔ ان سطور کی تحریر تک کارگل کے بحران پر یہ مقالہ ایسا Document ہے کہ جسے ہنوز چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے اور نہ ہی نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کی طرف سے اس کی تردید آسکی ہے۔ بروس ریڈل لکھتے ہیں:

امریکہ کی ایک ممتاز یونیورسٹی کے بین الاقوامی امور کے شعبے کے حوالے کیا گیا۔ بعدازاں یہ تحقیقی اور انکشاف خیز مقالہ 7 مئی کو ''واشنگٹن پوسٹ'' نے شائع کر دیا۔ان سطور کی تحریر تک کارگل کے بحران پر یہ مقالہ ایسا Cocument ہے کہ جسے ہنوز چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے اور نہ ہی نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کی طرف سے اس کی تردید آسکی ہے۔ بروس ریڈل لکھتے ہیں:

''4 جولائی 1999ء کا دن امریکی سفارتی تاریخ میں اس وقت کے حالات کے مطابق سب سے زیادہ غیر معمولی دن تھا۔ امریکی صدر کلنٹن اس وقت (پاکستان اور بھارت کے درمیان) انتہائی نازک اور اعلیٰ سطح کے سفارتی اقدامات کرنے میں مشغول تھے۔ پاکستان اور بھارت کی انتظامیہ سے مسلسل رابطوں کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن، نواز شریف کو اس بات کے لیے رضامند کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ پاکستان، بھارت سے کارگل کے محاذ پر لڑنے والے مجاہدین کو واپس بلانے کے لیے تیار ہے، کیونکہ اس لڑائی کی وجہ سے دو نئی ایٹمی قوتوں میں جنگ کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ صدر کلنٹن کے مشرق قریب اور جنوبی ایشیاء امور کے بارے میں نیشنل سکیورٹی کونسل میں مشیر ہونے کی حیثیت سے اس دن کے معاملات میں اہم مشاورت مہیا کرنے کے لیے مجھے خصوصی اہمیت دی گئی تھی...... 1999ء کے موسم بہار میں پاکستانیوں نے لائن آف کنٹرول کے شمالی اطراف میں کارگل کے مقام پر بھارت کے مقابلے میں برتری حاصل کرلی تھی۔ 1999ء میں پاکستان کی پشت پناہی سے کشمیر مجاہدین اور فوجی یونٹوں نے روایتی طریقہ کار کی مخالفت کرتے ہوئے بھارت کی طرف سے خالی کی ہوئی پوزیشنوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح پاکستان کی پشت پناہی رکھنے والے مجاہدین میں بھارتی فوج کی مشرقی کشمیر کو سپلائی میں رکاوٹ ڈالنے کی پوزیشن میں آگئے۔ ان پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے پاکستان کارگل ہائی وے پر نظر رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ پاکستانی خطرے کی وجہ سے بھارت کی وادی پر گرفت کمزور ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا۔ سخت گیر بی جے پی حکومت کے وزیراعظم کے لیے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ پاکستانی فوج نے اس پیش رفت کا ارتکاب بھارتی وزیراعظم کے لاہور میں نواز شریف سے ملنے کے لیے بس کے ذریعے جانے کے مضبوط اقدام کے جواب میں کیا تھا''۔

بروس ریڈل کہتے ہیں: ''مجاہدین کی کاروائیوں سے بھارت نے محسوس کیا کہ نواز شریف نے دھوکا دہی اور دوہرے پن کا ارتکاب کیا ہے اور یوں بھارت نے اپنے کھو جانے والے علاقے کے حصول کے لیے اقدامات شروع کردیئے۔ 1999ء کے آخر مئی اور شروع جون میں کارگل کے فرنٹ پر 150 کلومیٹر کے علاقے میں دونوں ممالک کی افواج کے درمیان شدید جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ کارگل کی چوٹیوں (جن میں سے بعض کی اونچائی سطح سمندر سے 17 ہزار فٹ ہے) پر ہونے والی جھڑپوں میں آرٹلری کی لڑائیوں کے علاوہ فضائی لڑائیاں بھی

ہوئیں۔ پاکستان کی بہتر فوجی پوزیشن کی وجہ سے بھارتی انفنٹری کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ پاکستان نے اس بات سے انکار کر دیا کہ ان جھڑپوں میں کشمیری مجاہدین لڑ رہے ہیں۔ یہ ایسا دعویٰ تھا جسے دنیا میں کسی نے سنجیدگی سے نہ لیا...... صورت حال اس وقت مزید شبہات کا شکار ہوگئی جب یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ ان لڑائیوں کو اسلام آباد میں کون ہینڈل کر رہا ہے۔ نواز شریف اسلام آباد میں اور مشرف راولپنڈی میں تذبذب اور کشیدگی کا شکار تھے۔ امریکا کارگل تنازع کے شروع ہی سے اس کی وسعت کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھا۔ ہم آسانی سے غور کر سکتے تھے کہ دونوں ممالک جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کسی تیسری پارٹی کی حمایت (پاکستان، چین اور عرب ممالک سے جب کہ بھارت، روس اور اسرائیل سے) سے ایک بڑے پیمانے کی جنگ شروع کر سکتے ہیں، جس کے ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کا خوف بہت زیادہ تھا...... ان اندازوں کو پیش نظر رکھ کر امریکا نے فوری طور پر پاکستان کو اپنی فوجیں لائن آف کنٹرول کے پیچھے واپس بلانے کے لیے اقدامات کرنے کے لیے کہا۔ مئی **1999**ء کے آخر میں پہلے مرحلے کے تحت انڈر فرتھ اور انڈر سیکرٹری تھامس پکرنگ نے ان خیالات کی ترجمانی پاکستان اور بھارت کے واشنگٹن میں موجود سفیروں سے کی۔ امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے دو دن بعد نواز شریف سے ملاقات کی۔ جنرل ٹونی زینی نے بھی، جن کے مشرف سے بہت اچھے تعلقات ہیں، مشرف سے ملاقات کی، تاہم ان ملاقاتوں سے کوئی فرق نہ پڑا۔ میں نے امریکی نقطہ نظر واشنگٹن میں فارن پریس سنٹر میں بیان کیا۔ وسط جون میں صدر کلنٹن نے دونوں ممالک کے سربراہوں کو خط لکھے، جن میں پاکستان سے فوجیں واپس بلانے اور بھارت کو ضبط کا مظاہرہ کرنے کا کہا گیا تھا۔ پاکستان اور بھارت دونوں امریکی رویے پر حیران تھے۔ پاکستان کی حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ اسلام آباد کا تصور تھا کہ امریکا، بھارت کے خلاف ہمیشہ کی طرح پاکستان کی پشت پناہی کرے گا اور بھارت کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس بحران کو میرٹ پر دیکھ رہا ہے۔ دونوں ممالک اپنے **50** سالہ کشیدہ حالات کے پس منظر میں امریکی پالیسی کو دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ امریکہ اب ماضی کے ساتھ چپکا ہوا نہیں ہے۔''

''جون کے آخر میں صورت حال مزید گھمبیر ہوگئی''۔ بروس ریڈل کہتا ہے: ''دونوں ممالک کی افواج کے کارگل فرنٹ پر شدید جھڑپوں میں مشغول ہونے کے علاوہ دونوں طرف سے بڑی جنگ کے لیے فوجوں کی بڑے پیمانے پر نقل و حرکت شروع ہوگئی۔ دونوں جانب سے

اموات کی شرح بڑھنا شروع ہو گئی۔ ہماری خفیہ ایجنسی نے اطلاع دی کہ پاکستان اور بھارت میں مکمل جنگ کے سائے حقیقت کا روپ دھارنے کے قریب ہیں۔ یہ خطرہ واضح تھا کہ بھارتی فوجیں پہاڑی چوٹیوں پر قابض پاکستانیوں کی پوزیشنوں پر حملے کر کے انہیں نڈھال کر رہی تھیں۔ نئی دہلی لائن آف کنٹرول کے کسی دوسرے حصے پر پاکستان کے خلاف نیا محاذ کھولنے کا آسان فیصلہ کر سکتا تھا تاکہ اپنا بوجھ کم کر سکے اور پاکستان کو اپنے مطلب کے محاذ پر جنگ کرنے کے لیے مجبور کر دے۔ نواز شریف نے جب دیکھا کہ پاکستان دنیا میں تنہا ہوتا جا رہا ہے تو وہ اس صورت حال سے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوری طور پر امریکا سے درخواست کی کہ وہ بھارت کو جوابی حملے سے باز رکھنے کے لیے ثالث کا کردار ادا کرے۔ واشنگٹن کا موقف واضح تھا یعنی مسئلے کا حل پاکستانی فوجوں کا لائن آف کنٹرول سے واپس پہلی پوزیشن پر جانا تھا، اس کے علاوہ کوئی حل ممکن نہیں تھا۔ جون 1999ء کے آخری دنوں میں نواز شریف نے کہا کہ وہ (امریکی) صدر کلنٹن سے ملاقات کر کے براہ راست کارگل مسئلے کے حل کے لیے درخواست پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نواز شریف اس سے قبل بھی کلنٹن سے کئی بار ملاقات کر چکے تھے۔ ان ملاقاتوں میں نیو یارک، واشنگٹن اور عمان میں شاہ حسین کے جنازے کے دوران ملاقاتیں بھی شامل ہیں......

2 جولائی 1999ء کو وزیراعظم نواز شریف نے صدر کلنٹن سے رابطہ کیا۔ انہوں نے درخواست کی کہ امریکہ فوری طور پر دخل اندازی کرتے ہوئے کارگل اور دراس کے محاذ پر جاری پاک، بھارت لڑائی بند کرائے۔ صدر کلنٹن نے واضح کر دیا کہ وہ اس صورت میں پیش رفت کریں گے جب پاکستان لائن آف کنٹرول سے فوجیں واپس بلائے گا۔ صدر کلنٹن نے بھارت کے وزیراعظم واجپائی سے بھی ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ بھارتی حکام اس بات پر ڈٹے ہوئے تھے کہ پاکستانی فوجوں کی ایل او سی سے واپسی بہت ضروری ہے کیونکہ واجپائی پاکستانی فوجوں کی لائن آف کنٹرول سے آگے موجودگی کے دوران مذاکرات کرنے پر رضامند نہ تھے۔ صدر کلنٹن نے واجپائی کو یقین دہانی کرائی کہ امریکا پاکستانی فوجوں کے ایل او سی عبور کرنے کے اقدام کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے گا بلکہ ہم لاہور میں شروع کیے گئے اقدامات میں پیش رفت دیکھنا چاہتے ہیں۔

3 جولائی 1999ء کو نواز شریف بہت زیادہ افسر تھے۔ انہوں نے صدر کلنٹن سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ واشنگٹن فوری طور پر ہماری مدد کرے۔ صدر کلنٹن نے اپنا سابقہ موقف دہرایا کہ اگر آپ اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامند ہیں تو پھر امریکا آئیں اور اگر فوجیں

واپس بلانے کے بارے میں پیش رفت نہیں کرتی تو امریکا آنے کی زحمت نہ کریں۔ کلنٹن نے نواز شریف سے کہا کہ مہربانی کر کے واشنگٹن آنے کے لیے ان نکات پر غور کر لیں۔ نواز شریف نے کہا کہ وہ 4 جولائی (1999) کو امریکا پہنچ رہے ہیں۔ وائٹ ہاؤس اور وزارت خارجہ نے 3 جولائی کا باقی دن کافی تیاری میں گزارا۔ ملاقات کے لیے جگہ کا انتخاب مسئلہ بن گیا تھا۔ وائٹ ہاؤس کے اندر بلیئر ہاؤس کو پاکستانیوں کی آمد کے لیے بہتر جگہ قرار دیا گیا۔''

''ہم نے نواز شریف کی امریکا آمد سے قبل دو صفحات پر مبنی ایک دستاویز تیار کی تھی۔ پہلا ایک ڈرافٹ تھا جو کہ اس صورت میں صدر کلنٹن نے جاری کرنا تھا جب نواز شریف ایل او سی سے فوجیں واپس بلانے پر رضامندی کا اظہار کرتے۔ دوسرے ڈرافٹ کا استعمال اس صورت میں کیا جاتا اگر نواز شریف فوجیں واپس بلانے سے انکار کرتے۔ دوسرے ڈرافٹ میں واضح کیا گیا تھا کہ (یعنی دھمکی دی گئی تھی) جنوبی ایشیا کے بحران کا ذمہ دار صرف پاکستان کو قرار دیا جائے گا۔ نواز شریف اپنے بیوی بچوں سمیت واشنگٹن پہنچے تھے، جو واضح اشارہ تھا کہ وہ پاکستان کی بعض مقتدر قوتوں سے خوفزدہ تھے۔ اگر واشنگٹن ملاقات ناکام ہو جاتی تو نواز شریف واپس گھر جانے کے قابل نہ رہتے.......... نواز شریف کو پہلے ڈیلاس ایئر پورٹ پہنچنا تھا جہاں سے ان کی پی آئی اے کی کمرشل پرواز کو نیویارک کے ایئر پورٹ جے ایف کے کی طرف موڑا جانا تھا جہاں انہیں سعودی سفیر شہزادہ بندر بن سلطان سے ملاقات کرنی تھی۔ شہزادہ بندر بن سلطان امریکی سفارتی اقدامات میں مدد فراہم کرنے اور سوویت یونین کے خلاف افغان جنگ کے دوران پاکستان سے مل کر کام کرنے کا توسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ شہزادہ بندر نے کارگل کے اس بحران کے حوالے سے امریکی صدر سے پوچھا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ صدر کلنٹن پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف سے کیا چاہتے ہیں۔ میں نے شہزادہ بندر سے واشنگٹن میں ان کے میک لین والے گھر میں ملاقات کی اور کارگل بحران سے متعلق امریکی نقطہ نظر واضح کیا۔ شہزادہ بندر نے وعدہ کیا کہ وہ ڈیلاس سے بلیئر ہاؤس تک نواز شریف کے ساتھ سفر کرتے ہوئے انہیں اس بارے میں قائل کریں گے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ کا تعاون حاصل کرنے کی بھی یقین دہانی کروائی۔''

کارگل کے سنگین اور خطرناک مسئلے کو حل کرنے کے حوالے سے یادداشتوں کو یکجا کرتے ہوئے بروس ریڈل مزید لکھتے ہیں: ''صدر کلنٹن کے مشیر 4 جولائی کی صبح ہی اکٹھے ہو گئے

تا کہ صدر کو ہونے والے اجلاس سے متعلق بریفنگ دیں اور تجاویز مہیا کر سکیں۔ اس وقت ماحول سنجیدہ تھا۔ امریکی صدر کے مشیر سینڈی برجر نے اجلاس کا آغاز صدر کلنٹن کو کہے گئے ان الفاظ سے کیا کہ یہ آن کی صدارت میں ہونے والے غیر ملکی پالیسی سے متعلق اہم ترین سیمینار ہے کیونکہ اس سیمینار کے ناکام ہونے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان ایٹمی جنگ کا خطرہ ہے۔ سینڈی برجر نے کہا کہ صدر کلنٹن کو نواز شریف پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ فوجیں واپس بلانے پر رضا مند ہوں تاہم دریں اثناء نواز شریف کو تحفظ کا احساس دلاتا ہے تا کہ وہ اس پسپائی پر عمل درآمد کروا سکیں۔ مسٹر ڈب ٹالبوٹ نے سیمینار کی اہمیت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نواز شریف کو صدر کلنٹن سے تنہا ملاقات کا موقع فراہم نہیں کیا جائے گا تا کہ وہ بعد اپنے وعدے سے مکر نہ جائیں۔ میں نے کلنٹن کو تجویز دی کہ اس بات کا اظہار اس وقت کیا جائے جب نواز شریف پسپائی کے بارے میں رضا مند نہ ہوں۔ خاص طور پر اس وقت جب فارن سیکرٹری شمشاد احمد رضا مند نہ ہوں کیونکہ ان کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ وہ پاکستانی فوج کی خفیہ ایجنسی (آئی ایس آئی) سے قریبی تعلقات رکھتے ہیں۔ ہمیں اسی لیے شمشاد احمد سے محتاط بھی رہنا تھا.......... صدر کلنٹن نے نواز شریف کو یاد دہانی کروائی کہ عرب اسرائیل تنازع میں امریکا نے اس لیے کردار ادا کیا ہے کیونکہ دونوں فریقوں نے امریکا کو ثالثی کرنے کے لیے خود دعوت دی تھی۔ کشمیر کے بارے میں ایسا معاملہ نہ تھا، بہترین راستہ لاہور میں اپنایا گیا تھا، یعنی بھارت سے براہ راست مذاکرات کیے جائیں۔ صدر بل کلنٹن نے نواز شریف کو مخاطب کرتے ہوئے ناراضگی سے کہا کہ انہوں نے کارگل پر اپنی فوجوں کو حملہ کرنے کی اجازت دے کر لاہور معاہدے کو زبردست نقصان پہنچایا ہے اور خود کو بے اعتبار بھی کیا ہے۔ صدر نے دوبارہ کہا کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی فوج اور اس کے اتحادی جنگجو کنٹرول لائن کی غلط سائیڈ پر ہیں اور انہیں ہر حال میں وہاں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اگر پاکستان مکمل طور پر دستبردار ہو جائے تو امریکا پاکستان کی مدد کر سکتا ہے۔"

کارگل کے حوالے سے طے پائے جانے والے واشنگٹن معاہدے کی منظر نگاری کرتے ہوئے اس واقعہ کے اکلوتے گواہ لکھتے ہیں: "کمرے میں کھچاؤ کا ماحول تھا اور نواز شریف پریشان دکھائی دیتے تھے۔ نواز شریف نے صدر کلنٹن کو ایک دستاویز پیش کی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ واجپائی کے ساتھ ان کا ایک معاہدہ ہے جو کنٹرول لائن پر عمل کا مظاہرہ کرنے اور اعلان لاہور پر عمل درآمد کرنے کے بارے میں ہے۔ نواز شریف نے بتایا کہ پہلے تو بھارت

اس نان پیپر پر عملدرآمد کے لیے رضامند ہو گیا مگر پھر وعدے سے مکر گیا اسی دوران اچانک نواز شریف نے مطالبہ کیا کہ صرف دونوں لیڈروں (نواز شریف اور بل کلنٹن) کے درمیان یہ ملاقات ہونی چاہیے۔ یوں نواز شریف، صدر بل کلنٹن اور میرے سوا سب افراد کمرے سے نکل گئے، نواز شریف نے دوبارہ درخواست کی کہ وہ علیحدگی میں صدر کلنٹن سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں مگر کلنٹن نے انکار کر دیا۔ پھر نواز شریف نے صدر کلنٹن کو گزشتہ ماہ کی اپنی تمام کوششوں کے بارے میں بتایا اور معاہدے کے بارے میں بھی بتایا جس کے ذریعے پاکستان کارگل سے دستبردار ہونا چاہتا تھا۔ نواز شریف بے حد گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت سی تفصیلات بتائیں مگر ان کے چہرے سے جنگ کے خطرے اور ڈر کے آثار نمایاں تھے...... نوار شریف نے کلنٹن کو بتایا کہ وہ ایک ایسا حل چاہتے ہیں جس کے ذریعے پاکستان چند حصوں سے دستبردار ہو جائے۔ بغیر اشارہ دیئے نواز شریف نے بتایا کہ پاکستان میں انتہا پسند ان کے خلاف ہیں، وہ ان کے خلاف تحریک شروع کر سکتے ہیں اور کلنٹن کے ساتھ شاید یہ ان کی آخری ملاقات ہو۔''

صدر کلنٹن غصے میں آ رہے تھے۔ انہوں نے نواز شریف کو درشتی میں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''کیا نواز شریف نے پاکستان ایٹمی میزائل فورس کو کاروائی کے لیے تیار ہونے کا حکم جاری کیا ہے، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، پاکستانی ایٹمی جنگ کی جانب بڑھ رہا ہے۔'' نواز شریف کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ انہوں نے میزائل فورس کو تیاری کے احکامات جاری کیے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس کے خلاف ہیں مگر وہ پاکستان میں اپنی زندگی کو خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

اس دوران تھوڑی دیر کے لیے میٹنگ ملتوی کر دی گئی۔ اس وقفے میں کلنٹن نے دہلی میں واجپائی سے فون پر گفتگو کی اور انہیں نواز شریف سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا۔ (اس فون کا مطلب امریکا کی طرف سے بھارت کو اطمینان دلانا تھا)۔

ایک گھنٹے کے وقفہ کے بعد صدر کلنٹن اور نواز شریف کے درمیان بات چیت دوبارہ شروع ہوئی۔ صدر کلنٹن نے میز پر ایک مختصر بیان رکھا جو کہ نواز شریف کے نان پیپر سے لیا گیا تھا اور اسے پریس کے لیے جاری کیا جانا تھا۔ اس کا اہم حصہ یہ تھا کہ ''وزیر اعظم نواز شریف نے لائن آف کنٹرول پر کشیدگی کے خاتمے کے لیے فوری اور سخت اقدامات کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کر دیا ہے'' سٹروب، سینڈی اور میں نے وقفہ کے دوران اس بیان کو تیار کیا

تھا۔ اس بیان میں اعلان لاہور پر عمل درآمد کرنے، کارگل پر جنگ بندی کرنے اور فوجیں ہٹانے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔

بروس کے بقول: ''صدر کلنٹن پرعزم تھے۔ نواز شریف کے پاس لائن آف کنٹرول سے فوجیں ہٹانے کا ایک بہترین موقع تھا یا پھر امریکا کی ہمدردی کے بغیر پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک وسیع اور خوفناک جنگ تھی۔ نواز شریف نے خاموشی کے ساتھ ہمارے تیار کردہ بیان کو متعدد بار پڑھا۔ انہوں نے اپنی ٹیم سے بات چیت کرنے کا مطالبہ کیا۔ کچھ دیر کے لیے اجلاس ملتوی ہوا۔ چند منٹ کے بعد نواز شریف اچھی خبروں کے ساتھ واپس پلٹے۔ انہوں نے ہمارے بیان میں ایک تبدیلی کرنے کے بعد رضامندی ظاہر کرنے کا عندیہ دیا۔ نواز شریف یہ فقرہ داخل کروانا چاہتے تھے کہ ''صدر کلنٹن ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے دونوں ممالک کی بات چیت کے سلسلے کو دوبارہ شروع کروانے کی حوصلہ افزائی کریں گے اور ایل او سی کی تقدس کو قائم رکھا جائے گا۔'' میں نے کہا کہ ہم آسانی سے اس جملے کی منظوری دے سکتے ہیں کیونکہ صدر کلنٹن پہلے یہ لاہور میں شروع کیے گئے اقدامات کو آگے بڑھانے کا عندیہ دے چکے ہیں، تاہم ہمیں اپنے میڈیا کو یہ بات ظاہر کرنی چاہیے کہ یہ زبان استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کارگل سے فوجیں واپس بلا رہا ہے۔ کلنٹن رضامند ہو گئے اور اپنے موقف سے نواز شریف کو آگاہ کیا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد نواز شریف نے رضامندی ظاہر کر دی۔ چند سیکنڈ میں ملاقات کا موڈ تبدیل ہو گیا۔ کلنٹن نے نواز شریف کو بتایا کہ ہم دونوں نے باہمی تعلقات کو بڑے مشکل حالات میں رکھا ہے تاہم حتمی طور پر مثبت نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ایک دفعہ پاکستان نے کارگل سے فوجیں واپس بلا لیں تو امریکا بھارت پر بھی دباؤ ڈالے گا، صدر کلنٹن نے یقین دہانی کروائی کہ وہ کشمیر کے مسئلہ پر جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے۔ یوں اس واشنگٹن معاہدے نے پاکستان اور بھارت کو ایک ہلاکت خیز جنگ سے بچا لیا۔''

بروس ریڈل کارگل کا بحران ''حل'' کرانے کی یہ تاریخی کہانی بیان کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں: ''وطن واپسی کے سفر کے دوران نواز شریف نے لندن اور ریاض میں قیام کیا۔ دونوں ممالک سے انہیں تعاون کی یقین دہانی کروائی گئی۔ وزیر اعظم نواز شریف اپنی زبان کے پکے نکلے۔ انہوں نے اپنی افواج کو اپنے اتحادیوں سمیت واپسی کا حکم دیا اور ایسا ہی ہوا۔ پاکستان میں فیصلے سے بے چینی بڑھی جب کہ بھارت میں خوشیاں منائی گئیں۔

4 جولائی کو امریکی صدر کلنٹن اور پاکستانی وفد کے درمیان تین گھنٹوں پر محیط ملاقات کے تین ادوار ہوئے اور یہ تین گھنٹے پاکستان کی عزت و وقار پر بہت بھاری ثابت ہوئے ملاقات کے اختتام پر "اعلان واشنگٹن" جاری ہوا۔ واشنگٹن معاہدے کے مندرجات کا اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے اور ان حالات کو بھی پیش نگاہ رکھا جائے جن میں معاہدہ طے پایا تھا تو ہمیں ایک گہری اداسی آگھیرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے معاہدے اور یہ معاہدہ کروانے والوں نے ہمارے جذبات اور ہماری امنگوں کا کوئی نہیں رکھا۔ اعلان واشنگٹن کے خاص نکات اس طرح تھے:

☆ صدر کلنٹن اور وزیر اعظم نواز شریف نے اس بات پر اتفاق کیا کہ کارگل ریجن میں حالیہ لڑائی خطرناک ہے جس کے نتیجے میں وسیع جنگ ہو سکتی ہے۔

☆ جنوبی ایشیا میں امن کے لئے ضروری ہے کہ فریقین شملہ سمجھوتے کے مطابق کنٹرول لائن کا احترام کریں۔

☆ دونوں ممالک کے سربراہوں نے اتفاق کیا ہے کہ شملہ سمجھوتے کے مطابق لائن آف کنٹرول کی بحالی کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں گے۔

☆ صدر کلنٹن نے اس بات پر زور دیا اور طے پایا کہ ان اقدامات کے بعد ایک دوسرے کے خلاف جارحیت فوری طور پر بند کر دی جائے گی۔

☆ طے پایا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر سمیت تمام تنازعات طے کرنے کے لئے فروری 1999ء میں لاہور میں شروع کئے جانے والے دوطرفہ مذاکرات بہترین فورم ہے۔

☆ صدر کلنٹن نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ لائن آف کنٹرول کی بحالی کے اقدامات کے بعد ان دوطرفہ کوششوں کی حوصلہ افزائی اور امن عمل کو تیز کرنے کے لئے وہ ذاتی دلچسپی لیں گے۔

☆ صدر کلنٹن نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ جلد ہی جنوبی ایشیا کا دورہ کریں گے۔

اس معاہدے کے بعد وزیر اعظم میاں نواز شریف نے خود کو کارگل سے

واقعات سے بری الذمہ قرار دیا اور نیاز نائک کے ذریعے بیان دلوایا کہ وزیر اعظم کارگل کی مہم جوئی سے لاعلم تھے۔ اس موقع پر حزب اختلاف کی جماعتیں خاموش نہ رہ سکیں اور انہوں نے کارگل کا ذمہ دار میاں نواز شریف اور ان کی کچن کابینہ کو ٹھہرایا۔ وہ جماعتیں جو ایک دوسرے کا وجود بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں اب باہمی اشتراک عمل میں شامل ہونا شروع ہو گئیں اور ایک نعرہ ''نواز شریف ہٹاؤ ملک بچاؤ'' لے کر میدان میں نکل آئیں۔ انہوں نے ایک گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس تشکیل دیا جسے عوام کی طرف سے بھاری پذیرائی حاصل ہوئی۔

کارگل نے پاکستانی وزیر اعظم میاں نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کے درمیان باقاعدہ کھنچاؤ کا آغاز کیا، اس کا ڈراپ سین 12 اکتوبر 1999ء کو ہوا، جب نواز شریف کو جیل جانا پڑا اور جنرل مشرف نے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھال لیا۔ بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے پہلے تو ان سے بات ہی کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد عالمی دباؤ اور علاقائی مفادات کے پیش نظر جنرل مشرف کو بھارت کے دورے کی دعوت دی گئی۔ دورے سے قبل جنرل مشرف نے صدر پاکستان کا عہدہ بھی سنبھال لیا اور اپنے حالیہ دورہ آگرہ میں انہوں نے ہر ممکن طریقے سے بھارت کو مسئلہ کشمیر کو بہ طور ''ایشو'' ماننے پر تیار کرنا چاہا، لیکن بھارتی ''راج ہٹ'' ہے یا ''تریا ہٹ'' جس نے آگرہ کا تاریخی موقع بھی ضائع کر دیا، ایک مرتبہ پھر برصغیر کے عوام مایوسی اور امید کی ملی جلی کیفیات سے کسی اگلے اعلان کے منتظر رہنے لگے۔

آگرہ مذاکرات

جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد مسئلہ کشمیر پر ایک اصولی موقف اختیار کیا اس کی بازگشت اقوام متحدہ کے ہزاریہ اجلاس میں بھی سنائی دی۔ جنرل نے واضح طور پر عالمی برادری کے سامنے بھارت کو مذاکرات کی پیش کش کے ساتھ ساتھ ناجنگ معاہدہ فوجی اخراجات میں کمی کے علاوہ امن کی ایک مربوط فضا پیدا کرنے کا فراخدلانہ اعلان کیا۔ بھارت نے ان اعلانات کا مثبت جواب نہیں دیا اس کے برعکس انہوں نے مقبوضہ ریاست جموں میں جاری تحریک میں پھوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی تحریک آزادی کی عسکری قیادت اور سیاسی قیادت کے درمیان کے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جنگ بندی کی آڑ میں بھارتی مقبوضہ ریاست کے عوام کو بہیمانہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، انسانی حقوق کی بدترین پامالیاں جاری رہیں، مجاہدین اور سیاسی قائدین نے اس انتہائی نازک مرحلے پر اتحاد کی فضا کو برقرار رکھا۔ بھارت نے مذاکراتی عمل سے پاکستان کو باز رکھنے کے لئے سی پنت کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے سیاسی قائدین کے ساتھ مذاکرات کا عمل شروع کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی شمولیت کے بغیر کوئی بھی مذاکراتی عمل کامیاب نہیں ہوسکتا چنانچہ مجاہدین نے بھارتی جنگ بندی کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ مذاکراتی عمل سے بھی لاتعلقی کا اظہار کیا۔

اس دوران جنرل پرویز مشرف ثابت قدمی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور انہوں نے حریت کانفرنس کے نمائندہ وفد کو پاکستان آنے دعوت دی، حریت کانفرنس نے پاکستان کے لئے پانچ افراد پر مشتمل وفد کا اعلان بھی کیا لیکن بھارت نے اس وفد کو پاکستان آنے کی اجازت نہ دی۔ بھارتی حکومت کے شدت پسندوں نے سید علی گیلانی کی وفد میں شرکت پر اعتراض کیا اور تا حال حریت کانفرنس کے قائدین پاکستان نہیں آسکے۔

اس پس منظر میں سربراہ ملاقات کو بھارتی رویئے میں تبدیلی سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا اس کی کئی وجوہات ہیں، بنیادی وجہ یہ ہے کہ بھارتی مقبوضہ جموں و کشمیر میں ایک عہد آفرین جدوجہد جاری ہے یہ جدوجہد سیاسی سطح پر بھی جاری ہے اور عسکری سطح پر بھی۔ اس جدوجہد کے سرخیل وہ مجاہدین ہیں جنہوں نے اپنا آج ایک بہتر کل کے لئے نچھاور کیا ہے۔ چالیس سال تک جموں و کشمیر کے عوام حصول حق خودارادیت کے لئے آئینی اور جمہوری طریقوں سے ایک صبر آزما جدوجہد میں مصروف رہے۔

1987ء میں مسلم متحدہ محاذ کو اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس اور نیشنل کانفرنس پر واضح برتری حاصل تھی لیکن دھونس اور دھاندلی سے محاذ کے امیدواروں کو ناکام بنا دیا گیا اس غیر جمہوری عمل نے مقبوضہ ریاست جموں و کشمیر کے عوام خصوصاً نوجوانوں کو یہ باور کرا دیا کہ بھارت ریاست پر اپنے غاصبانہ قبضے کو ختم کرنے پر جمہوری طریقوں سے آمادہ نہیں ہوگا۔ اس سوچ نے موجودہ عسکری تحریک کو جنم دیا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ عسکری جدوجہد ہماری سیاسی جدوجہد کا ایک جزو لاینفک ہے۔

آج اگر ہم مسئلہ کشمیر کی گونج دنیا کے مختلف ایوانوں میں سن رہے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ وہ قربانیاں ہیں جو جموں و کشمیر کے عوام نے دی ہیں۔ کشمیریوں کے جذبہ حریت کو کچلنے کے لئے وادی میں موجود آٹھ لاکھ فوج کے باوجود مجاہدین اپنی مرضی کے مطابق ریاست کے کسی بھی حصہ میں اپنی کاروائی اپنی مرضی کے حدف کر سکتے ہیں۔ کئی بھارتی جرنیلوں اور اس وقت کے بھارتی فوج کے سربراہ جنرل پدمانابھان اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ بندوق کے بل پر مجاہدین کی کاروائیوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ کشمیر ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اسے سیاسی مذاکرات سے ہی حل کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ بھارتی رویئے میں تبدیلی کا سہرا مجاہدین کے سر ہی بندھتا ہے۔

یکم جنوری 2001ء کو بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے ایک مضمون تحریر کیا تھا جس میں انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کشمیر کا ایک دیرپا حل چاہتے ہیں اور یہ کہ گھسے پٹے روائتی طریقے کو خیر باد کہنا ہوگا۔ بھارت اپنے عالمی مفادات کی تکمیل کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے اس کے چند دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ سلامتی کونسل کی مستقل نشست اسے اس وقت ہی مل سکتی ہے اگر وہ مسئلہ کشمیر کو حل کرے۔ چنانچہ یہ وہ اصل صورت

حال ہے جس نے بھارت کو مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور کیا۔

25 مئی 2001ء کو بھارت کے قائم مقام ہائی کمشنر نے بھارتی وزیر اعظم مسٹر واجپائی کا دعوت نامہ سیکرٹری خارجہ انعام الحق کے حوالے کیا، جس میں مسٹر واجپائی نے جنرل مشرف کو، جنہوں نے ابھی صدارت کا حلف نہیں اٹھایا تھا، دورۂ بھارت کی دعوت دے کر یہ کہا کہ ہمارا مشترکہ دشمن غربت ہے اور ہمیں مصالحت، باہمی بامقصد اور نتیجہ خیز مذاکرات کے ذریعے اعتماد کی فضا قائم کرنے کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اس اقدام کو نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا، کیونکہ اس سے پہلے مسٹر واجپائی صدر جنرل مشرف سے کسی بھی مسئلے پر خیر سگالی کا جواب جنرل مشرف کی طرف سے بڑا بھرپور تھا اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ جنرل مشرف نے مسٹر واجپائی کی طرف سے اس دعوت نامے کو بہت وقعت دی اور ایک اسٹیٹس مین کی طرح کھل کر اس کا اظہار بھی کیا، جس کا ثبوت 15 جولائی کو دورۂ بھارت کے دوسرے دن ان کی بھارتی اخبارات کے ایڈیٹروں سے ہونے والی بات چیت ہے، جس میں انہوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ مسٹر واجپائی کی طرف سے اس دعوت نامے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسے ان کی اسٹیٹس مین شپ قرار دے کر توصیفی کلمات بھی ادا کیے، حالانکہ 14 جولائی کو دو۔ ے کے آغاز پر ہی بھارتی میڈیا نے انہیں ''کارگل کا آرکیٹیکٹ'' کہنا شروع کر دیا تھا۔

14 جولائی کے اس دورے سے پاکستان اور بھارت ہی میں نہیں، ساری دنیا کے امن پسند اور صلح جو انسان دوست بہت سی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے، خصوصاً کشمیری عوام، جو گزشتہ 53 سال سے بدتر سے بدترین حالات کی طرف مسلسل بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور ایک ایک کر کے جن پر زندگی کے تمام شاید دونوں ممالک کی اس اعلیٰ سطحی سربراہی ملاقات میں کوئی ایسا فارمولا طے پا جائے، جس سے کشمیری عوام کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہو، لیکن اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ بعض عاقبت نا اندیش انتہا پسند خفیہ ہاتھوں نے اس معاہدۂ امن کو عین آخری لمحات میں سبوتاژ کر دیا اور 16 جولائی کی رات کو یہ منحوس خبر سنی گئی کہ دونوں ممالک کے وفود مشترکہ بیان پر متفق نہیں ہو پائے۔ آخری لمحات میں پانسہ پلٹ گیا؟

سربراہی ملاقات کے دوران یعنی 15 اور 16 جولائی ایسے تھے جن میں لحہ بہ

لحہ حالات نئے رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آگرہ کے مغل شیرٹن ہوٹل میں جمع دنیا بھر سے آئے ہوئے چھ سات سو صحافی اپنی تمام تر تجربہ کاری، زعم باخبری اور بصیرت کے باوجود اکثر وقت حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے افواہوں اور قیاس آرائیوں کے جھگڑے سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے اعصاب شکن چیلنج سے دوچار رہے۔ 15 جولائی کی سہ پہر بھارت کے خارجہ سیکرٹری نے کانفرنس ہال میں مختصر سا بیان پڑھا جس میں انہوں نے مسٹر واجپائی کے دورہ پاکستان کی اطلاع دی۔ مسٹر واجپائی کی جنرل مشرف سے بالمشافہ ملاقات طے شدہ وقت سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ اور بھارتی خاتون ترجمان نے مذاکرات کی فضا کو صرف خوشگوار نہیں بلکہ انتہائی خوشگوار(Very Cordial) قرار دیا۔ وفود کی سطح پر ایک گھنٹے کی ملاقات جو اس کے فوراً بعد ہوئی اس میں بھی کوئی ایسی ناخوشگوار بات کا تاثر نہیں ملا۔

اگلے روز بھارت کی وزیر اطلاعات مسز سشما سوراج نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے وفود کی سطح کی ملاقات میں زیر بحث آنے والے موضوعات کا ذکر کیا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ دہشت گردی، جوہری مسائل، تجارت اور جنگی قیدیوں کے موضوعات پر کیا متعین گفتگو ہوئی ہے تو انہوں نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ مجھے تو ان موضوعات کے نام بتائے گئے ہیں جن پر گفتگو ہوئی ہے، تفصیل مجھے نہیں بتائی گئی۔ ون ٹو ون ملاقات کے بارے میں انہوں نے کوئی مثبت یا منفی بات نہیں کی، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ملاقات میں مسئلہ کشمیر زیر بحث ہی نہیں آیا۔

16 جولائی 2001ء کی صبح کو جنرل مشرف نے ناشتے کی میز پر صحافیوں سے جو گفتگو کی وہ نیوز چینلز نے دکھائی اور اس میں جنرل پرویز مشرف نے بالکل صاف اور واضح انداز میں تنازعہ کشمیر کی مرکزیت پر اپنا موقف بیان کیا جس وقت اخباری ایڈیٹروں سے جنرل مشرف کی گفتگو ٹیلی کاسٹ ہوئی تو کانفرنس کے بھارتی کیمپ میں بھونچال آ گیا۔ بھارتی میڈیا نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف نے کشمیر اور دوطرفہ تعلقات بارے جو گفتگو کی ہے اس سے پاکستان کو غیر معمولی برتری حاصل ہو گئی ہے اور عمومی موڈ پاکستان کے

حق میں اور بھارت کے خلاف ہو گیا ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر آپ کو کشمیر کو بنیادی تنازع (Core dispute) کہنے پر اعتراض ہے تو آپ Core کے بجائے Main یا مرکزی مسئلہ کہہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ میں Dispute کے لفظ پر بھی اصرار نہیں کرتا آپ اسے Issue کہہ لیجئے لیکن کسی نہ کسی سطح پر آپ کو اس تنازعے کی مرکزیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ انہوں نے تنازع کشمیر کو حل کرنے کا عمل شروع کئے بغیر تجارت، ویزا میں نرمی اور سیاچن وغیرہ جیسے مسائل پر بات چیت کو غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابل عمل قرار دیا اور اپنی بات اتنے موثر انداز میں کہی کہ شرکائے مجلس میں سے کوئی بھی ان سے اختلاف نہ کر سکا۔

جنرل پرویز مشرف کی گفتگو کے دو بالکل متضاد نتائج نکلے اول یہ کہ باشعور اعتدال پسند اور منصف مزاج بھارتیوں میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ جنرل مشرف تنازعہ کشمیر کے حوالے سے جو کچھ مانگ رہے ہیں اسے تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ دوسرا یہ کہ بھارتی عقابوں کی سوچ اور رویئے میں مزید سختی پیدا ہوئی۔ اس مکتب فکر کے تمام لوگوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس گفتگو کی نشریت کے بعد بھارتی حکومت سخت دباؤ میں آ گئی اور جو حلقے سربراہی ملاقات کو ناکام بنانا چاہتے تھے وہ حرکت میں آ گئے۔ بھارت نے جنرل پرویز مشرف کی گفتگو کا اثر زائل کرنے کے لئے ایک روز پہلے ہونے والی وفود کی سطح کی ملاقات کی افتتاحی گفتگو کے نکات جو اس وقت صیغہ راز میں تھے مسٹر واجپائی نے نشر کر دیا تا کہ دنیا کو باور کرایا جائے کہ بھارت اپنے سخت موقف پر پوری طرح قائم ہے اور اس نے کوئی پسپائی اختیار نہیں کی۔

ایک طرف ٹی وی چینلز پر جنرل پرویز مشرف کی گفتگو اور اس پر ہمدردانہ تبصرے نشر ہو رہے تھے اور دوسری طرف مجوزہ اعلان کے مختلف مسودے تیار ہو رہے تھے اور ان پر نظر ثانی کی جا رہی تھی حالانکہ اس سے صرف دو گھنٹے پہلے پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار صحافیوں کو بتا چکے تھے کہ مشترکہ اعلامیہ بس حتمی شکل اختیار کرنے ہی والا ہے۔ لیکن اس کے بعد معاملہ بگڑتا چلا گیا اور اس ملاقات کو ناکام بنانے والوں نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اس تمام صورت حال میں صرف دو اشخاص مقابلتاً فکری طور پر ایک

دوسرے کے قریب تھے وہ جنرل پرویز مشرف اور مسٹر واجپائی تھے۔ مسٹر واجپائی جنرل مشرف کے تجزیئے سے دوسرے تمام بھارتی حکمرانوں سے بڑھ کر اتفاق کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بھارت اور پاکستان کو اگر اچھے ہمسایوں کے تعلقات قائم کرنے ہیں تو اس مسئلے کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اس سے پہلے مسٹر واجپائی اپنی کابینہ کے ارکان سے گفتگو کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ چکے تھے کہ وہ بہت جلد پاکستان کا دورہ کریں گے اور وہاں ایک جامع سمجھوتے پر دستخط کریں گے۔

انتہا پسند حلقوں کی تمام تر طاقت کے باوجود ان کا یہ بیان امید کی ایک کرن کی حیثیت رکھتا تھا لیکن جب کوئی مسودہ ابتدائی اتفاق رائے کے بعد نظر ثانی کے لئے بھارتی ٹیم کے انتہائی داخلی گروپ یعنی کابینہ کی سیکورٹی کمیٹی کے پاس جاتا اور وہاں سے نئی ترامیم کے ساتھ واپس آتا تو پھر اس کو قابل قبول بنانے کی کوشش میں مسٹر واجپائی پورا تعاون کرتے بلکہ ایک مرحلے پر تو جنرل مشرف نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے اور واجپائی صاحب کو معاملات طے کرنے ہوں تو ہم بہت معمولی لیت ولعل کے بعد کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مسٹر واجپائی کی رائے بھی یہی تھی کہ جنرل مشرف کا رویہ واقعی مفاہمانہ اور لچکدار ہے اور انہیں خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجنا چاہئے لیکن آخری لمحات میں سخت گیر موقف رکھنے والے بھارتی اہلکار مسٹر واجپائی کو عملاً بے بس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پہلی بار ایڈوانی نے اور دوسری بار آر ایس ایس کی قیادت نے اسے مسترد کر دیا۔ جس کے متعلق ''نادیدہ ہاتھ'' کے الفاظ استعمال کیئے گئے۔

پروگرام کے مطابق انتہا پسند پارٹی آر ایس ایس کے حامی وزراء نے 14 جولائی کو اپنے اپنے استعفے وزیر اعظم کی دہلی کی قیام گاہ 5۔ ریس کورس روڈ پہنچا دیئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اگر پاک بھارت مشترکہ اعلامئے میں یہ بات شامل نہ ہوئی کہ ''جموں کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے'' تو وہ کابینہ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

وزیر اعظم واجپائی نے کم وبیش دو گھنٹے تک مرلی منوہر جوشی (وزیر انسانی وسائل) اور آنند کمار (وزیر ثقافت) کو استعفے واپس لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی

لیکن وہ ناکام رہے جس کے بعد انہوں نے جنرل پرویز مشرف کو صورت حال سے آگاہ کیا اور صدر پرویز مشرف نے پاکستان روانگی کا فیصلہ کرلیا۔ بھارتی وزیراعظم نے صدر جنرل پرویز مشرف کو یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ اس معاملے کو اپنے کلیدی وزراء کے ساتھ طے کرلیں گے اور واجپائی کے دورہ اسلام آباد میں دونوں ممالک کا ایک مناسب مشترکہ اعلامیہ جاری ہوگا۔ واجپائی کا خیال تھا کہ وہ اس مسئلے کو دو تین ماہ میں حل کرلیں گے۔ بھارتی وزیراعظم کی یہ یقین دہانی ہی پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار کی پرامیدی تھی جس کی بنا پر انہوں نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ آگرہ مذاکرات ناکام نہیں ہوئے۔

سربراہ مذاکرات سے قبل کے ٹائم فریم کے دوران مشترکہ طور پر کام کرنے والے پاکستانی اور بھارتی حکام نے 14 جولائی کو ایک مشترکہ اعلامئے کا مسودہ تیار کرلیا تھا جسے واجپائی اور جنرل پرویز مشرف کو آگرہ میں اپنے مذاکرات کے بعد حتمی شکل دینا تھی۔ اس مسودے کو بھارت کے وزیر خارجہ، خزانہ اور وزیر تجارت کی آشیر باد حاصل تھی۔ پرویز مشرف اس مسودے پر خوش تھے کہ اس میں کشمیر کو ایک تنازعہ تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس میں کشمیری عوام کی ''خواہشوں'' کا ذکر کیا گیا تھا اور سرحد پار دہشت گردی کا حوالہ ''تشدد'' (Violence) کے لفظ کے ذریعے دیا گیا تھا۔

یہاں سے مبینہ نادیدہ ہاتھ کا کام شروع ہوا 15 جولائی کو جب یہ منظور شدہ مسودہ آگرہ میں قائم پرائم منسٹر آفس میں ٹائپنگ کے لئے بھیجا گیا تو اس کے بارے میں فوری طور پر کے ایل ایڈوانی کو دہلی میں خبر دی گئی جنہوں نے اعلامئے کو نرم کرنے کا مطالبہ کیا۔ 15 جولائی کو رات گئے ایک دوسرا مسودہ صدر پرویز مشرف کے پاس بھیجا گیا جس پر انہیں غصہ آیا اور انہوں نے بھارتی ایڈیٹروں کے سامنے بھارت پر الزام عائد کیا۔ دوسرے مسودے میں بھی کشمیر کو متنازعہ تسلیم کیا گیا تھا پاکستانی وفد نے اس مسودے کو بھی تسلیم کرلیا اور اس کی توثیق کے ایل ایڈوانی نے بھی کردی تھی۔

یہ دوسرا مسودہ جب شام چھ بج کر پینتالیس منٹ پر ٹائپنگ کے لئے بھیجا گیا تو واجپائی کے دفتر سے پھر اسے لیک کردیا گیا۔ اس بار ناگپور میں آر ایس ایس کی

قیادت نے فوری طور پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مسودے کو مسترد کر دیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ مشترکہ بیان میں کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ تسلیم کیا جائے۔ رات آٹھ بجے تک آر ایس ایس کے دو حامی وزراء جوشی اور کمار کے استعفے وزیراعظم کی دہلی رہائش گاہ پر پہنچ چکے تھے۔

بھارت کی نئی تجاویز

بھارت نے پاکستان پر ہمیشہ سے یہ الزام لگایا ہے کہ پاکستان ''کراس بارڈر ٹیرر ازم'' میں ملوث ہے، چنانچہ وہ اس بہانے سے مذاکرات سے راہ فرار اختیار کرتا رہا ہے۔ مذاکرات کو سرحد پار دہشت گردی روکنے سے مربوط کرنے کی رٹ نے بین الاقوامی سطح پر بھارت کی ساکھ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا کیوں کہ پاکستان نہ صرف بھارتی بلیک میلنگ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اصولی موقف یعنی جامع مذاکرات پر اصرار کرتے ہوئے دنیا کے ہر قابل ذکر فورم پر نہ صرف بھارتی ہٹ دھرمی کو واضح کیا بلکہ اس پیش کش کا بھی بار بار اعادہ کرتا رہا ہے کہ ہم دنیا میں کسی بھی مقام پر غیر مشروط بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ او آئی سی نے بھی تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستانی موقف کی صداقت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا باقاعدہ نوٹس لیتے ہوئے بھارت سے کہا کہ وہ پاکستان سے بات چیت کے دروازے بند نہ کرے۔ او آئی سی میں روسی صدر پیوٹن کو بھی جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کے اصولی موقف سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جائیں گے مسئلہ کشمیر ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ایران نے بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات شروع کرانے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے پاکستان کے دورے کے دوران امریکی اعلیٰ سفارتکاروں نے بھی ایسا ہی عندیہ دیا تھا۔ پاکستان کی طرف سے مسلسل مذاکرات کے لئے اصرار اور بھارت کی طرف سے مسلسل انکار کا بہر حال عالمی سطح پر نوٹس لیا گیا اور خصوصا سعودی شہزادے عبداللہ نے بھارت کو واضح الفاظ میں اسرائیل بھارت معاہدے پر اپنے تحفظات سے آگاہ کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر حل کرنے کی اہمیت بھی جتلائی۔

یہ وہ صورت حال ہے جس میں پاکستان کی طرف سے پاکستانی موقف کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے پر پذیرائی ملنا شروع ہوگئی اور بھارت کو اب کوئی معقول بہانہ بھی سوائے ''سرحد پار دہشت گردی'' کے میسر نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بھارت پر پاکستان سے مذاکرات

شروع کرنے کے لئے دباؤ بڑھنے لگا تو بھارت نے اپنی عالمی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے 22 اکتوبر 2003ء کو دو انتہائی اہم فیصلے کر کے نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی حلقوں کو بھی چونکا دیا۔ ایک اہم فیصلہ بھارت کے نائب وزیر اعظم ایل کے ایڈوانی نے حریت کانفرنس کے رہنماؤں سے مذاکرات اور دوسرا بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا کی طرف سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے پاکستان کو بارہ انتہائی اہم تجاویز کی پیش کش کی۔ یہ تجاویز اس طرح ہیں:

☆ فضائی اور ریل رابطوں کی بحالی۔
☆ مظفر آباد، سری نگر، سندھ، راجستھان بس سروس شروع کرنا۔
☆ کراچی، ممبئی، چندی گڑھ فیری سروس۔
☆ کرکٹ روابط کی بحالی۔
☆ پاکستان کے بڑے شہروں میں بھارتی ویزا دفاتر کا قیام۔
☆ لاہور دہلی بس سروس کی گنجائش میں اضافہ۔
☆ کوسٹ گارڈز کے درمیان رابطے۔
☆ بیس پاکستانی بچوں کا مفت علاج۔
☆ بھارتی سفارتکاروں کی تعداد میں اضافہ
☆ معمر افراد کو واہگہ کی سرحد سے پیدل تنہا سفر کرنے کی اجازت۔

بھارتی وزیر خارجہ یشونت سنہا نے یہ تجاویز وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی زیر صدارت ہونے والے کابینہ کے انتہائی اہم اجلاس میں پیش کر کے کابینہ کی باقاعدہ منظوری کے بعد ایک پریس کانفرنس میں ان کا باقاعدہ اعلان کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فی الحال پاکستان سے مذاکرات کا امکان نہیں۔ بھارتی وزیر اعظم سارک کانفرنس میں شرکت کے لئے اسلام آباد تو ضرور جائیں گے لیکن وہ صدر مشرف یا وزیر اعظم جمالی سے مذاکرات نہیں کریں گے کیوں کہ ان کے پرانے موقف کے مطابق اعلیٰ سطح مذاکرات شروع کرنے کے لئے پاکستان کو سرحد پار دہشت گردی بند کرنا ہوگی، جو ان کے خیال میں ابھی پاکستان نے بند نہیں کی۔

اس سے پہلے بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں متنازعہ بگلیہار ڈیم کے معائنے کی بھی پاکستانی ماہرین کو اجازت دے دی تھی، جنہوں نے 11 اکتوبر کو بھارت کا دورہ کر کے اس کا

معائنہ بھی کیا اور حکومت پاکستان کو اپنی رپورٹ پیش کی۔

بھارت کی طرف سے سخت گیر رویہ اپنانے اور انتہائی غیر سفارتی زبان استعمال کرنے کے بعد اچانک ان تجاویز کی پیش کش بہرحال ایک بھرپور سفارتی حملہ ہے جو پاک بھارت پر نظر رکھنے والے سنجیدہ حلقوں کے لئے تو اتنا زیادہ اہم نہیں تاہم عوامی حلقوں کے لئے ضرور چونکا دینے والا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ ان تجاویز کے اعلان کے فوراً بعد امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے ان کی بھرپور پذیرائی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس مرتبہ بھارت نے اپنے یورپی اور امریکی حلیفوں کو اعتماد میں لے کر یہ پیش کش کی ہے۔ پاکستانی دفتر خارجہ کی طرف سے ان تجاویز کا خیر مقدم تو کیا گیا لیکن اس کے لئے بڑی محتاط زبان استعمال کی گئی۔ وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ ہم ایسی تجاویز پہلے ہی پیش کر چکے ہیں گو کہ ان میں جامع مذاکرات کا ذکر نہیں ہے لیکن پاکستان غیر مشروط تجاویز کا خیر مقدم کرے گا اور ان پر سنجیدگی سے غور بھی کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بھارت سے کہا کہ وہ پاکستان کے ساتھ جامع مذاکرات کے فیصلے پر بھی نظر ثانی کرے۔ بھارت سرکاری ترجمان کی طرف سے کہا گیا کہ یہ تجاویز دونوں ممالک کے عوام کے باہمی رشتے مضبوط کر کے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی ایک اہم کڑی ہیں کیوں کہ بھارتی حکومت شدت سے محسوس کرتی ہے کہ دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے سے تعلقات مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور یہ فیصلے دراصل عوامی دباؤ کا نتیجہ ہیں۔

بھارت نے یہ تجاویز پیش کر کے سارک کانفرنس کے آغاز سے قبل گیند ایک مرتبہ پھر پاکستان کی کورٹ میں پھینک دی۔ دونوں ممالک کے درمیان غیر سرکاری وفود کی آمد و رفت اور ان کی طرف سے خیر سگالی جذبات کا اظہار ایسی عالمگیر سچائی ہے جس نے دونوں ممالک کے انتہا پسندوں کو مجبور کر دیا کہ وہ حالت جنگ جیسی صورت حال کا خاتمہ کر کے دونوں ممالک کے عوامی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنے تعلقات کو بہتر بنائیں۔ خصوصاً بھارت کی طرف سے کرکٹ روابط کی بحالی کے اعلان کے بعد اس مسئلے نے خاصی جذباتی حیثیت اختیار کر لی اور پاکستان کے پالیسی سازوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ ملکی مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط سے سفارتی ترجیحات اور عالمی رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی پیش کر سکتے ہیں۔

اعلان اسلام آباد

بھارت ایک عرصے سے ہی متنازعہ ایشوز کو زیر بحث لانے سے پہلے اقتصادی، تجارتی تعاون اور مارملائزیشن پر زور دیتا تھا اور کور ایشو کے طور پر سرحد پار دہشت گردی کا ذکر کرتا تھا جبکہ پاکستان کا موقف تھا کہ کور ایشو کشمیر ہے اور جب تک اس پر بات نہیں ہوتی حالات معمول پر نہیں آسکتے، تجارت اور اقتصادی تعاون بھی ممکن نہیں۔ بھارت کمپوزٹ مذاکرات کی بات کرتا تھا جبکہ پاکستان کور ایشو پر مذاکرات کو اہمیت دیتا تھا۔ کشمیر سمیت تمام معاملات مذاکرات کے ذریعے حل رکھنے کی یقین دہانی ''اعلان لاہور'' میں کی گئی تھی۔ آگرہ سربراہ کانفرنس کے موقع پر بھی بھارت کمپوزٹ مذاکرات پر زور دے رہا تھا لیکن پاکستان بالخصوص جنرل پرویز مشرف اسے کشمیری عوام کے خون اور پاکستان کی طویل قربانیوں سے غداری قرار دیتے تھے۔ عام حالات میں تو شائد حکومت پاکستان کے لئے اپنے اس موقف سے دستکش ہونا ممکن نہ تھا مگر 11 ستمبر کے واقعات اور اسلام و جہاد کے خلاف امریکہ کے عالمی ایجنڈے نے بھارت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ پاکستان پر دباؤ بڑھا کر اپنے مقاصد حاصل کرے اور پاکستانی حکمرانوں کے علاوہ امریکی نمک خوار بابوؤں پر مشتمل وزارت خارجہ کو یہ سہولت ملی کہ وہ حالات کے جبر کا رونا رو کر نہ صرف کور ایشو کو پیچھے دھکیل کر اقتصادی تعاون اور نارملائزیشن کے علاوہ کمپوزٹ مذاکرات کے بھارتی فلسفے کو قبول کریں۔ بلکہ دہشت گردی کے اضافی پروٹوکول پر بھی دستخط کریں جو کشمیر کاز اور کشمیری مجاہدین کے ساتھ غداری کے مترادف ہے اور جس کا تمام فائدہ بھارت اٹھائے گا اور نقصانات پاکستان اور اس کے حکمرانوں کے حصے میں آئیں گے۔

6 جنوری 2004ء کو سارک کانفرنس کے بعد صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری واجپائی کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا اور یہ مذاکرات بھی پہلے کی طرح خاطر خواہ نتائج پیدا نہ کر سکے۔

پاکستانی وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور ان کے بھارتی ہم منصب یشونت سنہا نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان فروری سے کشمیر سمیت تمام دوطرفہ معاملات پر جامع مذاکرات ہوں گے۔ اس بات کا فیصلہ جنرل پرویز مشرف اور مسٹر واجپائی کے درمیان ملاقات میں ہوا۔ سارک سربراہ کانفرنس کا انعقاد اس لحاظ سے اہم تھا کہ اسے پہلی بار بھارت نے اپنے مفاد میں ہائی جیک کرلیا اور عرصہ دراز سے ''پہلے تجارت، نارملائزیشن اور پھر سیاسی تنازعات کا سیاسی حل۔'' کی جو راگنی بھارت کے حکمران الاپ رہے تھے اسے عملی شکل دینے میں کامیاب رہے۔ اس موقع پر ''اعلان اسلام آباد'' کے نام سے سارک کانفرنس کا جو اعلامیہ جاری کیا گیا وہ بھی بھارتی عزائم اور منصوبوں کی تکمیل کا مظہر تھا۔ اعلان اسلام آباد میں کہا گیا تھا کہ رکن ممالک ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ دہشت گردی اور غربت کے خاتمے کے لئے کوششیں کی جائیں گی کیوں کہ یہ انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ اعلامیہ میں ممبر ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون اور تجارتی تعلقات کو مزید مضبوط بنانے پر اتفاق کیا گیا اور آزاد تجارت کے معاہدے کو اہم سنگ میل قرار دیا گیا۔

جہاں تک مسئلہ کشمیر اور دوسرے معاملات پر پاکستان کے موقف کا تعلق ہے، اس میں سارک سے پہلے ہی لچک نظر آرہی تھی جبکہ واجپائی نے آخر دم تک اپنے پتے سینے سے لگائے رکھے حتیٰ کہ اسلام آباد آمد کے دوسرے دن ہی انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کی اور اس ملاقات کے دوران زیر بحث معاملات کے بارے میں دونوں ممالک کے عہدے داروں اور سفارت کاروں کی زبانیں بند رہیں۔ البتہ دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ نے بتایا کہ دونوں لیڈر اگلے ماہ سے جامع مذاکرات پر تیار ہو گئے ہیں جس میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہوگا۔

اگرچہ ''اعلان اسلام آباد'' میں ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے اور ایک دوسرے کی حاکمیت، علاقائی سالمیت، قومی آزادی کا احترام کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی اور طاقت کے عدم استعمال کے علاوہ سیاسی بات چیت کے فروغ پر زور دیا گیا تھا لیکن سافٹا اور انسداد دہشت گردی کے فروغ کے اضافی پروٹوکول پر دستخط کرنے کے بعد ان

کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ کیوں کہ جنوبی ایشیا کے پاکستان سمیت تمام سارک ممالک کی منڈیوں کو عدم استحکام سے دوچار کرنے اور آزادی کی تحریکوں کو اندھی طاقت سے کچلنے کے بعد بھارت کو نہ تو کسی ملک کے معاملات میں مداخلت کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی قومی آزادی کو خطرے میں ڈالنے کی، کیوں کہ اس کا مقصد اپنی سیاسی وفوجی بالادستی کو یقینی بنانا ہے، بلاوجہ کی کوئی مصیبت مول لینا نہیں۔

اگرچہ وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد اعلان اسلام آباد کے بعد کہہ رہے تھے کہ کشمیریوں کو بائی پاس نہیں کیا جاسکتا، انہیں ساتھ لے کر چلنا ہوگا، لیکن حزب المجاہدین کے کمانڈر و جہاد کونسل کے چیئرمین سید صلاح الدین کے الفاظ میں بھارت کشمیر میں خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ جس دن اعلان اسلام آباد کیا جارہا تھا اس دن بھارتی سورماؤں نے 15 کشمیریوں کا بھوجن کیا جبکہ سارک کانفرنس کے شرکاء کو اس کا علم ہی نہیں ہوسکا اور انہوں نے زمینی حقائق نظرانداز کردیئے۔ چونکہ واجپائی مشرف ملاقات کو ایک اہم بریک تھرو قرار دیا جارہا تھا اور اس حوالے سے واجپائی کے مشیر برجیش مشرا سرگرم عمل تھے جو 1999ء میں چناب فارمولے پر کام کر رہے تھے۔ اس لئے حکومتی سطح پر سارک کانفرنس کی کامیابی اور علاقائی استحکام میں اضافے کے دعوؤں کے باوجود عوامی سطح پر شکوک وشبہات میں مزید اضافہ ہوا اور کشمیر پالیسی میں یوٹرن کے علاوہ بھارتی بالادستی کے عزائم میں پیش رفت سے تعبیر کیا گیا۔

خارجہ سیکرٹریوں کے مذاکرات فروری 2004ء

پاکستان اور بھارت کے جائنٹ سیکرٹریوں کے مابین تین روزہ جامع مذاکرات کا آغاز 16 فروری 2004ء کو اسلام آباد میں ہوا اور دو روز کی بات چیت میں خارجہ سیکرٹریوں کی سطح کے مذاکرات کے لئے ایجنڈا طے کیا گیا۔ پاکستان کے خارجہ سیکرٹری ریاض کھوکھر نے ملاقات کے بعد ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ مذاکرات میں جامع مذاکرات کے پانچ نکاتی ایجنڈے، ٹائم فریم اور آئندہ بات چیت کی سطح کے بارے میں تفصیلی منصوبے کی منظوری دی گئی ہے۔ چنانچہ اب دونوں ممالک کے خارجہ سیکرٹریوں کے درمیان امن وسلامتی اور جموں وکشمیر کے تنازعہ پر مئی جون 2004ء میں مذاکرات کا عندیہ دیا گیا۔

امن روڈ میپ کا نقطہ عروج دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ کی اگست 2004 کی ملاقات پر ہوگا۔ پاکستان اور بھارت کے سربراہان کی ملاقات کے بارے میں وزرائے خارجہ اپنی ملاقات کے دوران بھی کوئی بات کر سکتے ہیں۔ سیکرٹریوں کی سطح پر ہونے والے مذاکرات کے دوسرے اہم موضوعات میں سیاچین، وولر بیراج، تل بل، نیوی گیشن منصوبہ، سرکریک، دہشت گردی، منشیات کی سمگلنگ کا انسداد، معاشی اور تجارتی تعاون اور وفود کے تبادلوں کے علاوہ ایٹمی معاملات پر ماہرین کی سطح پر مذاکرات اور دیگر تکنیکی امور شامل تھے۔

بھارت نے پاکستان کے ساتھ جامع مذاکرات کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ اپنے باہمی تعلقات میں بہتری لانے کا عزم رکھتا ہے۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ گزشتہ چار عشروں کے دوران دونوں ملکوں کے مابین مذاکرات کے متعدد ادوار کے ابتدائی مرحلوں میں ہمیشہ اسی قسم کی خوش فہمیوں کو جنم دیا جاتا رہا ہے۔ مگر وقت آنے پر غیر ضروری مسائل کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے۔ جب

سربراہان کے درمیان ملاقات کا مرحلہ آتا تو نہ صرف مذاکرات میں کھنڈت ڈال دی جاتی بلکہ کبھی بھارت کو کشمیر کا اٹوٹ انگ قرار دے کر اور کبھی سرحد پار دراندازی کا الزام لگا کر مذاکرات میں پیش رفت روک دی جاتی ہے۔

اس کی ایک مثال جولائی 2001ء میں آگرہ مذاکرات میں آپ پڑھ چکے ہیں، اس وقت مشترکہ اعلامیہ کو نہ صرف روک لیا گیا بلکہ کانفرنس سے قبل دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت کی جو فضا پیدا ہوئی تھی وہ بھارتی پارلیمنٹ پر دہشت گردی کا ایک ڈرامہ رچا کر پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں پر دس لاکھ کے لگ بھگ ایٹمی اسلحہ سے مسلح فوج دس ماہ تک مسلط رکھی گئی اور نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کو ایٹمی جنگ کے خوف میں مبتلا کر دیا گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نائن الیون کے بعد امریکہ نے ایک نادیدہ خطرے کا الزام لگا کر پیشگی حملے کی جو ڈاکٹرائن وضع کی تھی اور جس کے تحت اس نے افغانستان اور عراق کو آگ اور بارود سے روند ڈالا تھا اس ڈاکٹرائن کو عملی طور پر اسرائیل نے فلسطین میں اور بھارت نے پاکستان میں استعمال کر کے یہ حقیقت ایک مرتبہ پھر آشکار کر دی کہ بھارت کے قول و فعل میں تضاد بھی ہے اور وہ عالمی سطح پر اپنے قبول شدہ معاہدوں سے بھی منحرف ہو جاتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال مسئلہ کشمیر ہے جو تقسیم ہند کا نا تکمیل شدہ ایجنڈے کا حصہ ہے لیکن بھارت اقوام متحدہ کی منظور شدہ قراردادوں کے مطابق اسے حل کرنے اور کشمیریوں کو ان کی آزادی کا فطری حق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔

خارجہ سیکرٹریوں کی سطح کے مذاکرات کی کامیابی پر اب جن خوشگوار جذبات کا اظہار کیا جا رہا تھا اس سے زیادہ دلفریب تاثرات کا اظہار ''اعلان لاہور'' آگرہ کانفرنس'' سے پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن پہلے بھارت کو اٹوٹ انگ کہنے اور پھر در اندازی کا الزام لگانے سے کبھی دریغ نہ کیا گیا۔ پاکستان کی طرف سے اعتماد کی بحالی کا یکطرفہ اور رضا کارانہ ہنوز سلسلہ جاری ہے اور کشمیر میں ریاستی دہشت گردی کو فروغ دینے کے لئے ہر دور میں بھارتی فوج میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ 80 ہزار سے زائد کشمیریوں کو شہید، عورتوں کی عزتوں کی پامالی اور مقامات مقدسہ کی توہین کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سے پاکستان نے اعتماد کی بحالی کا سلسلہ شروع کیا ہے کشمیر میں جہاد اور دہشت گردی میں امتیاز قائم رکھنے پر زور دینا چھوڑ دیا ہے۔ سارک کانفرنس کے بعد تو جنرل پرویز مشرف نے اعلان اسلام آباد کے تحت کہا تھا کہ پاکستان اور اس کے کنٹرول میں واقع سرزمین کو دہشت گردی یا جہاد کے لئے استعمال نہیں کرنے دی جائے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بھارت نے کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا سلسلہ پہلے سے زیادہ شدومد سے جاری رکھا۔

---✡---

من موہن، مشرف اور پاک بھارت

تنازعات کا مستقبل

بھارت کے نئے وزیراعظم من موہن سنگھ دہلی کے وزیراعظم ہاؤس میں اپنی وزارت عظمیٰ کے 100 دن مکمل کر چکے ہیں کہا جاتا ہے کہ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد کے دور تین ماہ ایک وزیراعظم کے لیے ’ہنی مون‘‘ جیسے ہوتے ہیں لیکن من موہن سنگھ کے لیے آغاز ہی تھکا دینے والا ہے وزیراعظم ہاؤس میں من موہن سنگھ آنے والوں کا تپاک سے استقبال کرتے ہیں لیکن ان کے رویئے میں جلد بازی بھی نظر آتی ہے ان آنکھوں سے تھکاوٹ جھلکتی ہے بات چیت کے دوران ان کی نظریں کمرے میں ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہیں جو شاید کام کا دباؤ ہے 71 سالہ وزیراعظم بن جانا متوقع نہ تھا انہوں نے بھارت میں کوئی انتخاب نہیں جیتا اور ان کی شہرت ایک غیر معمولی ذہانت کے حامل ماہر اقتصادیات و مالیات کی ہے۔

کانگریس کے مخالفین انہیں سونیا گاندھی کی کٹھ پتلی قرار دیتے ہیں اور انہیں بہت سے قومی چیلنجوں کے ساتھ ایک یہ چیلنج بھی درپیش ہے کہ وہ دنیا کے سامنے خود کو ایک مکمل با اختیار وزیراعظم ثابت کر دیں پھر ان پر سب سے بڑا دباؤ پاکستان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے ہے...... کشمیر کے حوالے سے صدر پرویز مشرف سے ان کی ملاقات کے نتیجے میں ویسی چونکا دینے والی صورت حال سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ دونوں نے اس مسئلے کو اہمیت دینے کا عہد کیا ہے کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کے حوالے سے ہمیشہ دونوں میں عوامی سطح پر غیر معمولی تجسس کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے لیکن ظاہر ہے اس سلسلے میں تمام باتیں منظر عام پر نہیں آتیں۔

بھارتی سفارتی عہدیدار اب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر جنوب

مشرقی ایشیاء کا سب سے حساس فلیش پوائنٹ ہے۔ اپنی جگہ بھارتی موقف میں اسے ایک بڑی تبدیلی قرار دیا جاسکتا ہے ابھی تک صورت حال سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ بھارت نے کشمیر کے حوالے سے اپنی حکمت عملی طے کرلی ہے۔ ان باتوں کو واضح کرلیا گیا ہے جنہیں دو طرفہ مذاکرات میں بناد بنایا جائے گا۔ بھارت کے سفارتی حلقوں کے مطابق بھارت مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے لائن آف کنٹرول میں ردو بدل پر آمادہ ہے۔ بھارتی افسران ابھی تک تو یہی کہہ رہے ہیں کہ بھارت کی اس پیشکش پر دوطرفہ بات چیت میں موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اب پاکستان کے سفارتی عہدیدار اس پر غور وفکر میں مصروف ہیں جب کہ بات چیت کے دوران بھی بھارتی پیشکش پر بحث مباحثہ جاری ہے وزیر اعظم من موہن سنگھ کے ساتھ نیو یارک جانے والے سفارتی اہلکاروں نے یہ بھی کہا ہے کہ بھارت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کشمیر کا تصفیہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ اسے بہت جلد ہو جانا چاہیے اگر ماضی کے تناظر میں اس بات کا تجزیہ کیا جائے تو بھارتی موقف میں تبدیلی بھی ایک اہم بات ہے کیونکہ ماضی میں بھارت مسئلہ کشمیر کو کوئی مسئلہ ماننے کے لیے ہی تیار نہ تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا لائن آف کنٹرول میں معمولی ردو بدل مسئلے کا قابل قبول ہو گا؟ یقیناً اس پیشکش سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ کم و بیش لائن آف کنٹرول ہی کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلینے والی بات ہوگی۔ ادھر بات کے دانشور پوری قوت سے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ کنٹرول لائن ہی کرلینا ہی مسئلے کا بہترین حل ہوگا۔ بھارت سے آنے والے ممتاز صحافیوں اور دانشوروں نے بھی پاکستان کے مختلف فورموں پر اسی حل کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ بھارت کی جانب سے لائن آف کنٹرول میں ردو بدل کی پیشکش دراصل سودے بازی کا آغاز ہے اور مجوزہ ردو بدل کوئی حتمی چیز نہیں۔ بھارت بات چیت کے دوران آہستہ آہستہ حتمی حد تک جانا چاہتا ہے جو بھارتی حکام نے پہلے سے طے کر رکھی ہے اگر اس پر تصفیہ نہیں ہوتا تو یہ علاقہ ایک مرتبہ پھر شدید خطرات کا شکار ہو جائے گا۔

سنجیدہ ماہرین کا کہنا ہے کہ بھارت اور پاکستان میں برسر اقتدار اعلیٰ قیادت مسئلہ کشمیر کے تصفیے کی آخری امید ہے گو کہ دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے تاہم دونوں باہمی

تنازعات کو پرامن طریقے سے طے کرنے میں سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق ''من موہن سنگھ کا رویہ ایک حد تک لچکدار ہے اور وہ اردو شاعری کے دیوانے ہیں، ان کی شخصیت کے پہلی پہلو کشمیر کے مسئلے پر امید دلاتے ہیں۔'' بھارت کے انسٹی ٹیوٹ آف کرائسس مینجمنٹ کے سربراہ ساہنی کا کہنا ہے ''پاکستان سے معاملات طے کرنے کے حوالے سے واجپائی کی نسبت من موہن سنگھ زیادہ محفوظ اور بہتر شخص ہیں۔ واجپائی تو مسلسل ڈرامائی اور غیر متوازن بیانات دیتے رہتے ہیں۔ نئی دہلی کے سنٹر فار پالیسی ریسرچ میں سکیورٹی سٹڈیز کے پروفیسر برہما چیلنی کا کہنا ہے ''دراصل کشمیر کے حوالے سے ہم محض معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کر رہے اور اس کام کے لیے من موہن سنگھ اتنے ہی بہتر ہیں جتنا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ یہ ایک متضاد رائے تھی۔ من موہن سنگھ خود مسئلہ کشمیر کے بارے میں کہتے ہیں ''سب سے پہلے تو ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنا ہے۔ یہ سب اہم بات ہے۔ اب بات میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ ہم کشمیر سمیت تمام معاملات پر گفتگو کے لیے تیار ہیں۔''

ادھر پاکستان میں من موہن سنگھ کے حوالے سے خاصی مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ٹائم کے مطابق ایک سابق کشمیری مجاہد کمانڈر کا کہنا ہے ''بھارت کی جانب سے پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر رعایت بھارت کی اندرونی سیاست کو بری طرح متاثر کرے گی بلکہ اس سے بھارت کے ٹوٹنے کے خطرات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔'' اسلام آباد کے ایک جریدے کے ایڈیٹر ہمایوں گوہر کی رائے میں ''من موہن سنگھ کشمیر پر کوئی بڑا فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ایسا کوئی بھی فیصلہ ناپسندیدہ فیصلوں کے لیے بہت طاقتور لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے اور من موہن سنگھ طاقتور لیڈر نہیں ہیں۔

دوسری جانب اس بات میں کوئی شک نہیں کہ من موہن سنگھ وہ رہنما ہیں جن کا بھارت طویل عرصے سے منتظر تھا۔ من موہن سنگھ کی دیانت داری شک وشبے سے بالاتر ہے۔ ان کی سادگی اور قناعت بھی مثالی ہے۔ بھارت کے مشہور ناول نگار اور ادیب خشونت سنگھ بتاتے ہیں۔ 1996ء کے انتخابات کے لیے سکھ برادری نے من موہن سنگھ کی انتخابی مہم کے لیے ہزاروں ڈالر کی رقم اکٹھی کی جب من موہن سنگھ الیکشن ہار گئے تو انہوں نے رقم واپس

لوٹاتے ہوئے کہا مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ آپ نے دی ہے۔ دہلی کے اعلیٰ حلقوں میں من موہن سنگھ کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ وہ کس طرح ٹیلی فون پر بات کرتے ہیں۔ روزانہ کس طرح اپنی اہلیہ گورشرن کور کے ساتھ لنچ کرنے گھر جاتے ہیں۔ کتنا سادہ وہ کھانا کھاتے ہیں۔ جب سونیا گاندھی نے انہیں وزیر اعظم کی پیشکش کی تو انہوں نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا اور گورشرن کو یہ خبر ٹیلی ویژن کے ذریعے ملی۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر دیش بھاگ وتی کیمبرج یونیورسٹی میں من موہن کے زمانہ طالب علمی کے سب سے قریبی دوست ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ''گذشتہ سال جب من موہن کی بیٹی نے کولمبیا یونیورسٹی میں Doctoral فیلوشپ کے لیے درخواست دی تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ من موہن کی بیٹی ہے۔ اس نے مجھے بھی یہ بتایا گوارا نہیں کیا، شاید بھارت میں اس جیسا وہ اکیلا باپ ہے جو اس قدر ایماندار ہو۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ بھارتی سیاست میں اتنے ایماندار شخص کا کوئی کام نہیں۔ من موہن کا اپنے بارے میں کہنا ہے ''مجھ میں اتنی مستقبل مزاجی اور استحکام ہے کہ میں تند خوئی کا مظاہرہ کیے بغیر کام چلا سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کہاں لکیر کھینچ دینی ہے من موہن کے وزارت عظمیٰ کے دوران جس واقعے کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ایک فائل کے بارے میں ہے۔ گذشتہ ماہ اپوزیشن جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنماؤں نے وزیر اعظم کو ایک فائل بھجوائی جس میں بجٹ تجاویز میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں۔ جب یہ فائل من موہن کے پاس پہنچی تو انہوں نے اسے اٹھا کر میز پر دے مارا اور کہا میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا اسے واپس کر دو۔ من موہن سنگھ انہی فائل بھیجنے والے رہنماؤں نے بجٹ سیشن کے دوران رویہ دیکھ چکے تھے۔ اپوزیشن نے بجٹ سیشن کے دوران شور وغل اور واک آؤٹ پر ہی زور رکھا اور اجلاس کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بی جے پی کے رہنما اس واقعہ پر بہت غضب ناک تھے۔ ایک پریس کانفرنس میں سابق وزیر دفاع جارج فرینڈس نے کہا ''میں نے اپنی پوری زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں دیکھا۔'' اس بات کو من موہن سنگھ کی واحد کمزوری قرار دیا جا رہا ہے۔ وہ جلد غصے میں آتے ہیں اور اس کا کھلا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن ایسا صرف انتہائی بے اصولی بات پر ہوتا ہے۔ بھارت کے قومی سلامتی کے مشیر ڈکشت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ 72 سالہ من

موہن سنگھ پر کام کے شدید دباؤ کے اثرات ہوئے ہیں۔

وزیراعظم ہاؤس میں تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے صدر مملکت پرویز مشرف ہیں جو ماضی میں سابق بھارتی وزیراعظم سے کشمیر کے مسئلے پر بات چیت کے آغاز اور ڈرامائی اقدامات کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ من موہن کی طرح صدر مشرف بھی سیاسی شخصیت نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود آگرہ میں ہمیشہ غیر معمولی سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آگرہ میں مبصرین اور تجزیہ نگاروں کی رائے میں صدر مشرف نے بات چیت میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورت حال کو اپنے حق میں تبدیل کر لیا تھا۔ ان کی چھا جانے والی خصوصیات نے بھارت کے سفارتی حلقوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ انہیں کشمیر کے حوالے سے خطرات کا اندیشہ لاحق ہو گیا جس کے نتیجے میں عین آخری لمحے پر مشترکہ اعلامیے پر دستخط نہ ہونے دیے گئے۔ من موہن سنگھ کی خاموش طبع کے برعکس صدر مشرف بات کرنے میں انتہائی بے باک ہیں۔ بھارت میں انہوں نے ایک پریس کانفرنس یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت دہشت گردی نہیں تھی تو پھر کشمیر کی جدوجہد کو کیسے دہشت گردی قرار دیا جا سکتا ہے اس بات پر بھارتی حلقوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ پاکستانی قیادت اور عوام کے درست جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی ہو گئی۔ صدر مشرف بات چیت اور اپنے خیالات کے اظہار کے حوالے سے ایک انتہائی صاف ذہن کے مالک لیڈر کے طور پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ جس مسئلے پر بات کرتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں پر ایک ماہر جتنی معلومات رکھتے ہیں۔ بات چیت میں بھی ان کا طریقہ کار ایک ماہر فوجی کمانڈر جیسا ہوتا ہے وہ اچانک غالب آ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے حل کا مستقبل اب ان دو رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک ماہر اقتصادیات اور ایک فوجی کس طرح سے باہمی طور پر قابل قبول حل تک پہنچتے ہیں لیکن اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔

☆

☆ امریکہ سپین جنگ کے بعد معاہدہ پیرس میں امریکہ نے اپنی مرضی کی شرائط لکھوائیں اور یہ معاہدہ غیر معمولی بین الاقوامی جغرافیائی تبدیلیوں کا باعث بنا۔

☆ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والے نام نہاد امن معاہدوں نے مفتوح اقوام کو تقسیم اور علاقوں کے حصے بخرے کرنے کے علاوہ خود غرضی کے ساتھ بھاری تاوان جنگ بھی وصول کیا گیا۔ جرمنی کا وفد معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے پیرس سے روانہ ہوا تو فرانسیسی عوام نے انتظامیہ کی سرپرستی میں ان پر پتھر برسائے اور ان کی تذلیل کی۔

☆ ناٹو کا قیام ایک ایسا دفاعی معاہدہ تھا جس نے روس اور اس کے اتحادیوں کو مشتعل کر دیا۔

☆ جب شمالی ویٹ نام کو یقین ہو گیا کہ امریکہ کے لئے جنوبی ویٹ نام کی عملی مدد کرنا ناممکن ہے تو اس نے فیصلہ کن حملے کا آغاز کر دیا۔

☆ مصر اسرائیل معاہدے میں امریکہ کو وہ کامیابی حاصل ہو گئی جو عربوں کے تیل پر قبضہ کرنے کی دھمکیوں سے حاصل نہ ہو سکی۔

☆ تاریخ گواہ ہے امریکیوں نے مطلب کے بغیر کبھی کسی قوم کی مدد نہیں کی، جب روس افغانستان سے رسوا ہو کر بھاگا تو امریکہ نے مجاہدین کو "دہشت گرد" کہنا شروع کر دیا حالانکہ اس سے پہلے انہیں "مجاہدین" کا خطاب بھی امریکہ ہی نے دیا تھا۔

☆ بون امن کانفرنس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں اتحادیوں کے تمام نمائندے شریک تھے لیکن طالبان حکومت کا کوئی نمائندہ شریک نہ تھا۔

☆ عراق میں منعقدہ ایک کانفرنس میں صدام مخالف تمام نمائندے شریک ہوئے جو ایک عرصے سے سی آئی اے کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے تھے۔

Rs: 260

ادارہ تحقیقات

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0333-4380927